اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بیادگار علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر ۔ بشیر احمد ۔ بی ۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر
حامد علی خاں ۔ بی ۔ اے
منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۴ بابت ماہِ اگست سنہ ۱۹۲۸ء نمبر ۲

تصویر۔ فرشتے

جہاں نما

شہریارِ افغانستان کی مراجعتِ وطن

تاجدارِ افغانستان اور اُن کی ملکہ سرحدِ پشاور سے لے کر دارالسلطنتِ کابل تک ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ اُس قابلِ یادگار سیاحت سے کامیاب و کامران اپنی قوم اور اپنی رعایا میں واپس پہنچے جو غالباً اُن تمام شاہی سیاحتوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو آج تک پادشاہانِ مشرق نے کی ہیں۔

قندھار پہنچنے پر اکتیس توپوں کی سلامی اتاری گئی اور سرکاری طور پر خیر مقدم ہونے سے پہلے شاہِ امان اللہ ایک خانقاہ کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔

ایک مختصر سی تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا کہ یورپ اور مشرقِ قریب کی سیاحت سے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان ممالک نے نظم و نسق کے دستور و آئین کو کہاں تک ترقی دی ہے۔ لیکن میں اُس وقت تک ان مشاہدات کو اپنے ملک میں نافذ نہ کروں گا جب تک کہ اُن پر اپنی قوم کے نمائندوں کے ساتھ مل کر بحث و مشورہ نہ کرلوں۔

انہوں نے کہا کہ جن ممالک کی میں نے سیاحت کی ہے وہاں کی قومی زندگی میں جو حصہ عورتیں لے رہی ہیں اُس کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ وہ ترقی کی ہر تحریک میں نمایاں طور پر شریک تھیں۔

اُس لائحہ عمل کا سب سے ضروری جزو جسے امیر اپنے ملک میں نافذ دیکھنا چاہتے ہیں رسل و رسائل کے ذرائع کی اصلاح ہے۔

قندھار سے براہِ ہرات، فرح، جریشک اور شیخ آباد، کابل تک اعلیٰ حضرت اور علیا حضرت رعایا کے اُس ہجوم کی مسرت و عقیدت کو شرفِ قبولیت بخشتے رہے جو ملک کے کونے کونے سے نکل کر اُن مقامات پر جمع ہوگیا تھا۔

مسرت و شادمانی کے اُن نظاروں کی ایک دھندلی سی تصویر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار خصوصی نے اپنے الفاظ میں کھینچی ہے جن کی نمائش اعلیٰ حضرت اور علیا حضرت کے ورود پر کابل میں ہوئی:-

میں کابل کے پُررونق بازاروں میں کھڑا حیرت و استعجاب کے ساتھ افغانستان کے مختلف الہیئت مگر ہم خیال لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو دلی مسرت کے ساتھ اپنے بادشاہ اور ملکہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

شہر کے قدیم اور جدید دونوں حصّے پھولوں اور جھنڈیوں سے آراستہ کئے گئے تھے اور ہر شخص کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔

لوگوں کے ہجوم میں جو صبح ہی سے آکر اُن مقامات پر جم گئے تھے جہاں سے شاہی جلوس کا گزر ہونے والا تھا تمام ایشیائی قوموں کے افراد موجود تھے، کرد۔ بخاری۔ ایرانی اور یہودی۔

کئی دنوں سے لوگ ملک کے ہر کونے سے جوق در جوق کابل میں آرہے تھے۔ سنگلاخ اور دشوار گزار کوہستانوں اور سرسبز و شاداب وادیوں میں سے نکل کر حریت و قومیت کے نوزائیدہ جذبات پر لبیک کہتے ہوئے آرہے تھے۔

تمام رات شہر میں جشن برپا رہا۔ ہر دوکان کا رنگ سبز تھا اور ہر دوکان میں کم از کم بارہ رنگین لیمپ روشن تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج رات کوئی نہیں سویا۔

خوبصورت محرابوں سے جو بازاروں میں اس تقریب پر جگہ جگہ تعمیر کی گئی تھیں بڑے بڑے فانوس لٹک رہے تھے۔ اور لوگوں کے رہنے کے مکانات کی جھنڈیوں اور روشنیوں کی نمائش عجب شانِ تقابل دکھا رہی تھی۔

شہر کی آرائش و زیبائش کے لئے ایک فنڈ کھول دیا گیا تھا جس میں لوگوں نے نہایت فراخ دلی سے چندہ دیا۔ اسی لئے تقریباً ہر شہری یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس جشن میں اُس کا بھی ایک حصّہ ہے۔

بادشاہ اور ملکہ کے آنے سے بہت پہلے پولیس زرق برق وردیاں پہن کر جلوس کے گزرنے کے راستوں میں اپنی اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی تھی۔

آخر صبح دس بجے طیاروں کی پرواز کا شور سنائی دیا اور پھر آسمان کی صاف اور روشن فضا میں چھ طیارے اُڑتے نظر آئے۔ یہ لوگوں کے جذبات کو گرمانے کے لئے ایک اشارہ تھا جس سے نعرہ ہائے مسرت کی ایک لہر اُٹھی اور شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک پہنچ گئی۔

بادشاہ اور ملکہ ایک خوبصورت اور مصفا رولس رائس گاڑی میں بیٹھ کر جس کا رنگ ہلکا سفید تھا شہر میں داخل ہوئے سواروں کے محافظ دستے نے گاڑی کو گھیر رکھا تھا اور اُن کے اسلحہ کی آوازاور وردیوں کے گوناگوں رنگ عجب کیفیت پیدا کر رہے تھے، جلوس مشرق و مغرب کے فرق کو نمایاں کر رہا تھا۔

اعلیٰحضرت اور علیاحضرت جن کے دلوں میں مشرق و مغرب کی کئی ایک دارالسلطنتوں کے استقبالوں کی یاد ابھی تازہ تھی ان نظاروں کو دیکھ دیکھ کر اُس دلی مسرت سے مسکرا رہے تھے جو وطن میں پہنچ کر پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں نے اس قدر پھول برسائے کہ موٹر کار اُن میں تقریباً چھپ گئی۔

اعلیٰحضرت کھڑے ہو گئے اور انہوں نے رعایا کے اظہارِ عقیدت کا شکریہ ادا کیا۔ ملکہ کے چہرے پر نیلے رنگ کا ایک

سا نقاب تھا اور وہ جھک جھک کر لوگوں کے سلام قبول فرما رہی تھیں۔

پھر جلوس قصرِ دلکشا کی طرف روانہ ہوگیا جہاں ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ یہاں خیر مقدم کے طور پر نائب السلطنت نے ایک سپاس نامہ پڑھا۔ اسی شام قصرِ دلکشا میں ایک شاندار سرکاری ضیافت کا بھی انتظام کیا گیا۔

جشن تین روز تک جاری رہیں گے۔ اسی اثنا میں ملکہ ثریا خانم کا خیر مقدم خواتینِ کابل کی طرف سے ہوگا۔ آج وہ قصرِ علیا میں ایک ضیافت پردہ میں۔ اور کل شام کابل کے مدرسۂ نسواں کی طالبات اُن کو ایک جلسہ دیں گی۔

اخباروں کی جنگ

فلیٹ سٹریٹ آج کل میدانِ کارزار بنی ہوئی ہے اور ایک دلچسپ اور پُر لطف جنگ وہاں جاری ہے۔ "ڈیلی میل" اور "ڈیلی ایکسپریس" انگلستان کی صحافتِ عامہ کے دو سب سے بڑے نمائندے ہیں۔ ان دونوں اخباروں کے درمیان روزانہ اشاعت، اشتہارات کی آمدنی اور مستقل خریداروں کے لئے مفت انشورنس کے انتظامات کے رقیبانہ دعاوی پر ایک زبردست جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اول الذکر نے اپنے صفحات میں ایک تصدیق شائع کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی روزانہ فروخت ۱۹۱۹۵۰۰ ہے اور آخر الذکر کی تعداد اشاعت ۱۳۴۵۳۷۱ تصدیق ہوئی ہے۔

ایک تیسرا اخبار "مارننگ پوسٹ" بھی شریکِ جنگ ہوگیا ہے اور بظاہر طور پر اس وقت "میل" کے خلاف "ایکسپریس" کا ساتھ دے رہا ہے جیسا کہ اس اخبار کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے حالات نے نہایت شدید صورت اختیار کر لی ہے:

"ڈیلی میل" اُس جھگڑالو اور اُس کرایہ روزانہ اخبار نے کل کی اشاعت میں ایک افتتاحیہ لکھا ہے جس میں اُس نے اشتہار دینے والوں اور اشتہارات کے ایجنٹوں کو اپنا کاروبار چلانے کا ایک نیا سبق دیا ہے۔ یہ سبق بڑا آسان ہے۔ اُس نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے تمام ذرائعِ اشتہارات کو یک قلم ترک کر کے "ڈیلی میل" میں اشتہار دینا شروع کر دیں۔ اسی مضمون کے دوران میں "مارننگ پوسٹ" پر بھی ایک حملہ کیا گیا تھا جس کا جواب دینے کا ہم یہاں ارادہ رکھتے ہیں۔

"مارننگ پوسٹ" ایک اعلیٰ درجہ کا اخبار ہے جس کا سرپرست صرف قوم کا تعلیم یافتہ اور عالی دماغ طبقہ ہے "ڈیلی میل" کی طرح اُس کی زندگی کا مدار انشورنس اور کوپن کے ٹکڑوں پر نہیں ہے۔

"مارننگ پوسٹ" اپنی ترقی پر نازاں ہے۔ وہ ہر مہینے اپنے مشتہرین کو اخبار کی اشاعت سے مطلع کرتا رہتا ہے اور وہ اپنے خبروں کے کالموں کو اشتہارات کی مقدار کے ماتحت نہیں رکھتا۔

"ڈیلی میل" اخبار کے ایک اندرونی صفحہ کے لئے نو سو پونڈ وصول کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں "ڈیلی ایکسپریس" چھ سو پچھتر پونڈ لیتا ہے۔

۱۹۲۲ء سے اب تک "ڈیلی میل" کی اشاعت بقدر ۹۸۴۰۹ پرچوں کے بڑھی مگر "ڈیلی ایکسپریس" کی اشاعت میں اسی عرصہ

کے اندر ۸۱۹۰۸۷ کا اضافہ ہؤا۔ اگر اسی شرح سے ترقی جاری رہی تو بہت جلد اُس کی اشاعت "ڈیلی میل" سے اگر بڑھے گی نہیں تو اُس کے برابر ضرور ہو جائے گی۔

بچّوں کے لئے ورزش گاہیں

جرمنی کے ایک سابق فوجی افسر میجر نیومین نیورو ڈنے برلن میں ایک نئی قسم کی ورزش گاہیں جاری کر رکھی ہیں۔ نیویارک کا ہفتہ وار اخبار "سائنس" لکھتا ہے کہ یہ ورزش گاہیں صرف اُن بچوں کے لئے مخصوص ہیں جن کی عمریں ایک سال سے متجاوز نہیں ہوئیں۔

بچّوں کو اُن کی اتائیں ورزش کا لباس پہنا کر یہاں لے آتی ہیں۔ یہ لباس بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ بچّوں کو مخمل سے منڈھی ہوئی میزوں پر لٹا دیا جاتا ہے اور انہیں ورزش شروع کرائی جاتی ہے۔ ہر بچّے کو میجر موصوف کا ایک ایک تربیت یافتہ مددگار ورزش کراتا ہے۔ ورزش کرانے والا بچے کے بازوؤں یا ٹانگوں کو پکڑ لیتا ہے اور میجر کے احکام پر اُن کو اسی طرح حرکت دیتا ہے جس طرح بڑی ورزش گاہوں کے لڑکے اپنے آپ ورزش کرتے ہیں۔ ان مشقوں کو جو اب عام بچوں کو کرائی جا رہی ہیں سب سے پہلے میجر نیومین نیورو ڈنے خود اپنے بچّوں پر آزمایا تھا۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ مشقیں تمام بچّوں کے لئے مفید ہیں اور پانچ مہینے کی عمر سے شروع کی جا سکتی ہیں۔

جرمنی کے مدرسوں میں تقریباً ایک چوتھائی تعداد اُن طلبا کی ہے جن کی نخاع میں کم وبیش کوئی اہم نقص موجود ہے۔ میجر موصوف کی رائے میں اُس کا علاج وانسداد صرف بچپن کی ورزشوں سے ہو سکتا ہے۔ یہ مشقیں اُن بچوں کیلئے مفید سمجھی گئی ہیں جنہیں اعصاب کی بیماری ہو یا پیدائش کے وقت جن کے سر کو صدمہ پہنچا ہو۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جسے اب اطبا غیر معمولی نہیں سمجھتے۔

رنگ اور نیند

میونخ کی مجلسِ تحقیقاتِ نور نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ رنگ اور نیند میں باہم ایک رشتہ او تعلق ہے۔ یہ تحقیقات اُن لوگوں کے لئے ضرور دلچسپی کا موجب ہوگی جو بے خوابی کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔ اور یہ یوں بھی ایک عجیب بات ہے کہ نیند لانے میں بعض مخصوص رنگ حیرت انگیز طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ شیشوں پر نقاشی کرنے والے جب نیلگوں آسمانی رنگ کو استعمال کرنے لگے تو اُن کو وہیں نیند آگئی اور وہ سو گئے۔ دماغ کے مریضوں کے لئے پہلے بھی اطبا نیلی دیواروں اور نیلے پردوں والے کمرے کی اقامت تجویز کیا کرتے تھے، کیونکہ تسکین اور آرام دینے میں نیلا رنگ غیر معمولی طور پر موثر ثابت ہؤا ہے۔

فرشتے

کیا تمہارے لئے اتنا کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار آسمان سے تین ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کرے ـــــ قرآنِ مجید

خدا نے فرشتوں کو اپنا قاصد بنایا جن کے دو دو، تین تین اور چار چار پر ہیں۔ وہ اپنی مخلوقات کی بناوٹ میں جو چیز چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے ـــــــــ قرآنِ مجید

فرشتے وہی کرتے ہیں جس کا اُن کو خدا کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے ـــــــــ قرآنِ مجید

ہم فرشتوں جیسے کبھی نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہمارے جذبات نہ مٹ جائیں ـــــ ڈیکر

اس تیرہ خاکدان میں جہاں ہر وقت افکار کے بادل چھائے رہتے ہیں ہمیں علم بھی نہیں ہوتا اور فرشتے چپکے چپکے ہمارے ساتھ ہوتے ہیں ہماری آنکھیں اُن کے سفید سفید پروں کو آسمانوں میں اُڑتا ہوُا دیکھتی ہیں اور حیران رہ جاتی ہیں ـــــــ میسی

وہ خاموشی کے پروں پر کس خوش آئند ادا سے رات کے خالی گنبد میں تیرتے رہے اور جھک جھک کر لیلائے شب کو گدگدی کرتے رہے یہاں تک کہ آخر وہ مسکرا پڑی ـــــــ ملٹن

اگر تم بیداری میں فرشتوں کی مصاحبت کی خواہش رکھتے ہو تو وہ ضرور خواب میں تمہارے پاس آئیں گے ـــــ پرنٹس

احمق لوگ وہاں تک بڑھے چلے جاتے ہیں، جہاں فرشتے بھی پاؤں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں ـــــــ پوپ

منصور احمد

تاریخِ دنیا پر ایک نظر

روما اور زمانۂ وسطیٰ

۱۸

مسیحی کلیسا

انجیل کے لئے تیاری - سلطنتِ روما کی شان وشوکت پر مسیحی کلیسا کی فتح کو عیسائی مورخین دنیا کی تاریخ کے حیرت انگیز واقعات میں شمار کرتے ہیں + ایک مورخ کہتا ہے کہ یہ ہے خاص مثال اُس طریقے کی جس سے اِس دنیا کی کمزور چیزیں قوی چیزوں پر غلبہ پالیتی ہیں جس سے ایک پتھر کا ٹکڑا جسے معمار شروع میں ردی کرکے پھینک دے آخر کار عمارت میں نمایاں ترین جگہ پالیتا ہے - لیکن مسیحیت کی فتح کچھ ایسا لاینحل معما بھی نہیں - اُس شدید جہد للبقا کے جو نوعِ انسان میں مسیحی سن سے پہلے تک جاری رہی دو نتیجے ہوئے - ایک طرف تو چونکہ افراد محافظت اور تسخیر و مخاصمت کی غرض سے معاشرتی حلقوں اور ملتوں میں جمع ہو گئے تھے اِس لئے اب یہ جنگ پہلے سے زیادہ تیز اور خوفناک ہو گئی - لیکن دوسری طرف اِن حلقوں کے اندر ایک نئے انداز کی معاشرتی اور شہری خوبیاں پیدا ہوئیں جو حقیقی تعاون کے لئے لابدی تھیں مثلاً فرماں برداری دیانت داری اور ایثار - ایمان امید اور محبت جنگی سلسلے کے پہلو بہ پہلو اُسی ایک سرچشمہ سے اخلاقی سلسلہ بھی رونما ہو گیا + اب صرف اتنی ضرورت باقی تھی کہ اِن نئے اخلاقی خیالات کی عام طور پر ترویج کر دی جائے اور عیسائیوں کے قول کے مطابق خدا کی "ابویت" اور انسان کی اخوت کی صورت میں چار دانگِ عالم میں اُن کا اعلان کیا جائے +

اِس اعلان سے پہلے کم از کم مغربی دنیا کا دل و دماغ ایسے خیالات سے محض بے بہرہ تھا + بدھ نے تقریباً اسی قسم کا اعلان کیا تھا لیکن مختلف وجوہ سے اُس کے خیالات مغرب تک نہ پہنچ سکے + آخری عبرانی پیغمبروں نے اس کے لئے رستہ صاف کیا تھا لیکن انہوں نے ایسے لوگوں کو تلقین کی تھی جو ایک تنگ و تار قومیت میں مقید تھے - بنی

عیسوی سے تین صدیاں پہلے جو مذاہب (مثلاً سبل اسٹارٹ آئیسس اور مترس کے ادیان) ایشیائے کوچک شام مصر اور ایران میں رائج ہوئے وہ تمام عالمگیر مذاہب تھے۔ تمام کی بنا اخوت انسانی تھی اور تمام ایک حد تک بااخلاق تھے + نیز وہ تمام فلسفے جو عین اسی وقت میں ایرانی حکمت اور مشرقی تصوف کے امتزاج سے پیدا ہوئے مثلاً زینو کی رواقیت اور پوسی ڈونیس کی انتخابیت (Eclecticism) اُن سب میں عالمگیری کا جذبہ ایک ہمہ گیر بابرکت قانونِ فطرت کا یقین اور ضابطہ کی پابندی و ادائے فرض کا گہرا اخلاقی خیال مرکوز تھا + بہ گویا مسیحیت کی تیاریاں تھیں۔ مسیحیت انہی کے اثرات میں پیدا ہوئی +

لیکن عیسائیوں کا دعوےٰ ہے کہ دنیا کے لیئے امن و محبت کا سچا پیغام لانے والے اُسے صحت و صراحت کے ساتھ بیان کرنے والے حضرت عیسیٰ اور اُن کے حواری پال ساکن ٹارسس تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہی نے پہلے پہل انسانیت کو روحانی جد و جہد اور خودی سے نجات دلائی انہیں نے نجات یافتہ انسانیت کو ایک جنتی کی بشارت دی اور انہی نے دنیا میں پہلی بار انسان اور خدائے رحیم کے درمیان ہم کلامی کی راہ دکھائی +

کفرِ روما۔ روما کی سلطنت جس میں پہلے پہل انجیل کی اشاعت کی گئی مختلف وجوہ سے اس پیغام کے سننے کے لیئے تیار تھی + ایک تو اہلِ روما تمام جسمانی لذات سے جو بے پایاں طاقت اور بے شمار دولت سے حاصل کی جا سکتی تھیں جی بھر کے لطف اُٹھا چکے تھے اور دیکھ چکے تھے کہ یہ چیزیں آنی جانی ہیں ان کا لطف تکلیف کا اور اُن کی مستی بیزاری کا پیش خیمہ ہے۔ جسمانی لذتوں کو دیکھ بھال کر اب وہ خوشی کو اُس نئے طریقے سے حاصل کرنا چاہتے تھے جو پاکیزگی اور جاں نثاری، ہم جنسوں کی خدمت اور خدا کی ریاضت کی راہ تھی + دوسرے روما کی فہم و ذکا جو یونانی علم و حکمت اور ایشیائی تخیل سے تیز تر ہو چکی تھی اب پرانے دیوتاؤں جو پیٹر اپولو مارز وغیرہ کی پرستش سے اپنے آباو اجداد کی طرح تسکین نہ پا سکتی تھی + پرانے دیوتاؤں کی پرستش محض سیاسی تھی + حکومت کا ایک شعبہ ضروری رسومات اور قربانیوں کے ذریعہ سے دولتِ روما اور آسمانی طاقتوں کے مابین اچھے تعلقات قائم رکھنے کا ذمہ دار تھا + پونٹی فیکس میکسی مس (امامِ اعظم) کے عہدے پر کوئی مذہبی نمائندہ مامور نہ تھا بلکہ ایک سیاسی مدبر + مذہب عہدنامہ کی قسم کا ایک تمسک تھا جس کی رو سے اُدھر مناسب رسومات اور اِدھر حسنِ سلوک ہونا ضروری قرار پایا۔ ایک موقع پر ارباب حکومت نے سمجھا کہ نپٹیون (جس نے ایک جہاز تباہ کر دیا تھا) اپنے قول و قرار پر قائم نہیں رہا تو انھوں نے کھلے طور پر ایک عام جلسے میں جہاں اُن کے بت کو جگہ دی جاتی اُسے شامل نہ کیا۔

قدیم رومیوں کو ایک ذاتی یا اخلاقی مذہب کی ضرورت کا سرے سے احساس ہی نہ تھا، اُن کی عبادت و

توجہ کا مطمح نظر فقط اُن کا شہر روما تھا جس کے لئے وہ اپنی جانیں نثار کرنے کو ہمیشہ تیار تھے۔ اُن کو پروا نہ تھی کہ انہیں دنیا میں اس کا کچھ انعام ملے یا مر کر وہ پھر جئیں یا نہ جئیں۔ لیکن اُن کی اولاد کے دل کی یہ حالت نہ رہی۔ اُن کے خلف گناہ کا احساس کرنے لگے۔ نجات کا ذریعہ ڈھونڈنے لگے۔ طاقتِ ربانی تک پہنچ سکنے کی راہ تلاش کرنے لگے۔ انہیں بقا کی دھن لگ گئی۔ وہ بقا جس کی رنگ آمیزیوں نے مشرقی مذاہب کو اس قدر دل آویز بنا دیا تھا۔ فرجی سیل کی پوجا ۲۰۴ ق م ہی میں روما میں رائج ہو گئی تھی۔ سُلا کے وقت میں مصری خدا آئیسس کی پُر شکوہ رسوم جاری کی گئیں۔ اور پومپے کے زمانے میں ایرانی مترس (شمس پرست) کا مذہب اس قدر مقبول ہوا کہ عجب نہ تھا کہ یہی مذہب ساری روما کی سلطنت میں پھیل جاتا۔

مسیحی زمانے کے آغاز کے ساتھ رومی کفر میں دو تازہ تحریکیں شروع ہوئیں اول مدبرین کی کوشش کہ روما کی پوجا کو شاہنشاہی شخصیت کی پرستش بنا کر پھر رائج کریں اس مذہب سے دولت روما کی یکسانیت کا اظہار اور تمام مذاہب کے پیروؤں کو ایک رشتے میں منسلک کرنا مقصود تھا۔ دوسرے فلسفیوں نے کوشش کی کہ سلطنت روما کے بے شمار مذاہب کی غیر مطابق وثنیات کو یہ کہہ کر عقل کی لڑی میں پرو دیں کہ یہ سب ایک ہی ربانی حقیقت کے مظاہر ہیں۔

مسیحیت کا طلوع و کمال۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ مسیحیت کو جو لڑائی اپنی زندگی کی پہلی تین صدیوں میں لڑنی پڑی وہ پرانے دیوتاؤں کے پیروؤں کے خلاف نہ تھی بلکہ اُن سیاسی مدبروں کے خلاف تھی جو شاہنشاہ کی ربانیت کا صریح اقرار چاہتے تھے اور اُن فلسفیوں کے خلاف تھی جو سارے کے سارے پرانے کفر کو نئی افلاطونیت کا لباس پہنا کر برقرار رکھنا اور از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے تھے۔

روما کی حکومت مذہب کے معاملے میں نہایت روادار تھی۔ اس کی وسیع سلطنت میں جتنے مختلف مذاہب تھے وہ سب چین سے جس طرح چاہتے تھے اپنی رسوم ادا کرتے تھے۔ مسیحیت کی طرف بھی پہلے حکومت کا رویہ عنایت آمیز رواداری کا تھا۔ بظاہر وہ صرف یہودیت کی جو عبرانی محکوموں کا قومی مذہب تھا ایک وہمی سی شکل معلوم ہوتی تھی اور یہی (رہرنشا کے قول کے مطابق) مسیحیت تھی بھی۔ ابتدائی پیروؤں کے لئے حضرتِ عیسیٰ فقط مسیح موعود تھے جن کا کام بنی اسرائیل کی نجات اور خوشحالی تھا۔ ایک عیسائی مورخ کہتا ہے کہ یہ صرف پال ٹارسس کے باشندے کا (جس کی تربیت مشرق و مغرب کی جائے اتصال سلیسیا میں ہوئی) روحانی وجدان اور مذہبی بالغ نظری تھی جس نے یہ بات تاڑ لی کہ حضرتِ عیسیٰ نہ صرف یہودی شریعت کی تکمیل اور عبرانی پیشگوئیوں کی صداقت کے لئے آئے بلکہ غیر یہودیوں

کو اس خدا کی راہ دکھانے کے لئے وارد ہوئے جس کی مدتوں سے وہ اپنی وثنیات میں عبث تلاش کرتے آئے تھے انہوں نے بجائے فلسفیوں کے نظریات کے مذہب کو اُن کے سامنے اپنے ربانی الہام کے قابلِ وثوق دعوے کے ساتھ نئے لباس میں پیش کیا۔

وہ مسیحیت جسے پال نے روما کی لاطینی یونانی اور ایشیائی سلطنت کے سامنے پیش کیا محض یہودیت اور مشرقی غیبی علوم کا سا مذہب نہ تھا۔ بلکہ اُس کا دعوے تھا کہ مسیحیت اُن سب کو منسوخ کر کے اُن سب کی جگہ لینے کے لئے معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اُس نے اپنے پیرووں کو شاہنشاہ کی قربان گاہ پر بخورات جلانے سے منع کر دیا۔ اُس نے پارتھینون (معبدِ ایتھنز) کے دیوتاؤں کو شیطانوں کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ کافروں کے حلقے میں اس طرزِ عمل پر تشویش اور غصہ پیدا ہؤا اور آخرکار عیسائیوں پر کھلم کھلا تشدد ہونے لگا۔ یہ تشدد زیادہ شدید ہو گیا جب عیسائیوں نے ایک "کافر" حکومت کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا اور سلطنتِ روما کے اصول و معاشرت سے الگ تھلگ ہو کر اپنے آپ کو گرجاؤں کے حلقوں میں منظم کرنا شروع کر دیا۔ دو صدیوں تک یہ عناد مسیحی کلیسا اور "کافر" سلطنت کے درمیان بڑھتا گیا یہاں تک کہ آخرکار ۲۴۹ء تا ۳۱۱ء کے عام تشدد کی مہلک کشمکش صورت پذیر ہوئی۔ دراصل یہ دو قطعی مخالف و مختلف طرزِ خیال و معاشرت کا معرکہ تھا۔ ڈیسئس سے لے کر ڈایوکلیشین تک سارے شاہنشاہوں نے جتنی قوت اُن کے بس میں تھی صرف کر دی کہ ایک ایسی منظم جماعت کو جو شاہنشاہی یکسانیت اور حاکمانہ اقتدار کا قلع قمع کر رہی ہے ملیامیٹ کر دیں۔ ڈیسئس نے کہا کہ ہمیں ایک حریف سیزر کا وجود منظور ہے لیکن روما کے اسقف کا وجود منظور نہیں"۔ لیکن وہ طاقت جو اسقفِ موصوف کی پشت پناہ تھی مطلق العنان شاہنشاہ کی طاقت سے بھی زیادہ طاقتور نکلی۔ تشدد ناکام رہا اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ڈایوکلیشین کے جانشین نے اس کامران مذہبی انجمن سے اتحاد کر لیا۔

کلیسا کی کامرانی ۔ لیکٹینیٹس اور سینٹ آگسٹائن کے زمانے سے گبن ملمین لیک اور دوشین کے وقت تک مختلف الرائے مورخین نے سلطنتِ روما کے خلاف کلیسا کی کامرانی کے مختلف اسباب گنوائے ہیں۔ مورخ دنیا کے لئے یہ سب چار قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ مذہبی اخلاقی نفسیاتی اور سیاسی۔

پہلا اور سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مسیحیت نے اپنے تمام حریف مذاہب کے مقابل میں اہلِ مغرب کے مذہبی احساس کو سب سے زیادہ مطمئن کیا۔ مسیحی مورخین کا دعوے ہے کہ اُس کی وحدانیت زیادہ بلند اور زیادہ پاکیزہ تھی۔ اُس کی ربانی ابوبیت کا نظریہ متھریت (شمس پرستی) اور دیگر ادیان کے مقابل میں خدا و انسان کے تعلق کی ایک نہایت دلکش شکل تھی۔ اُس کے اعتقاد نے کہ خدا کا بیٹا دنیا میں مجسم بن کر آیا زمین و آسمان میں ایک مضبوط رشتہ قائم

کر دیا جس سے نجات کا یقین اور ذاتی بقا کی امید استوار ہو گئی۔ روح القدس کے متعلق اُس کے اعلان سے کہ وہ ایمان لانے والے کی روح کو اپنا مسکن بناتی ہے زندگی کو ایک اعلیٰ مرتبہ ملا اور انسان کو موت پر ایسا اختیار حاصل ہو گیا جو کسی اور ذریعے سے نہ ہو سکتا تھا۔

دوسرے عیسائیت کا اخلاقی معیار تمام دوسرے معروف مذاہب کے معیار سے زیادہ بلند تھا۔ روما کے پرانے دیوتا غیر اخلاقی تھے۔ تمام مشرقی مذاہب (جن کا اہلِ مغرب کو علم تھا) کے اخلاق یا غیر مکمل تھے یا نہایت پست۔ ان میں بہترین متریت تھا جس میں دلیری دیانت اور وفاداری کی فوجی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ کسی نے عیسائیت کی طرح عصمت انکسار برادرانہ ملاطفت اور محبت کی سی دل گداز نیکیوں کی اشاعت نہ کی تھی۔ کسی نے زندگی کے زخم پر نیک کاموں کا ایسا تسکین دہ مرہم نہ لگایا تھا۔

تیسرے عیسائیت نے دنیا کے سامنے اپنے بانی کی شخصیت میں اپنے بلند پایہ اخلاق کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ اُس کا دعوےٰ تھا کہ مسیح پر ایمان لانے سے بُرے سے بُرا آدمی ولی کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے۔ غالباً روما کی زوال آمادہ سلطنت کی گناہ آلود معاشرت پر سب سے زیادہ اثر اُن نجات دینے والے معجزوں کا ہُوا جو مسیح کے نام پر کئے گئے۔ پینٹی کوسٹ (یومِ روح القدس) کی طرح کے روحانی کایا پلٹ کے نظاروں سے لوگوں کے دل غائت درجہ متاثر ہوئے۔

آخری سبب یہ ہُوا کہ عیسائیوں کے گروہ کے گروہ اپنے اسقفوں اور پادریوں کے تحت میں گرجاؤں میں یکجا ہوئے اور اسقف اور پادری اپنے صدر اسقفوں اور سر اسقفوں کے زیرِ فرمان کام کرتے تھے۔ اس سے ایک نہایت منظم اور زبردست کلیسائی قلمرو یعنی روما کی سلطنت کے اندر ایک عظیم الشان خود مختار اجنبی اور مخالف مذہبی انجمن قائم ہو گئی۔ روما کا مذہبی تشدد پہلے پہل اسقفوں کے خلاف جو ان چھوٹی چھوٹی مخفی انجمنوں کے صدر تھے عمل میں آیا۔

۱۹

شمالئے اور خانہ بدوش

شمالیوں کے حملے۔ گبن اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "زوال و ہبوطِ سلطنتِ روما" کے آخری باب میں لکھتا ہے کہ سلطنتِ روما کے زوال کا اولین سبب "پادری اور وحشی تھے"۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اس کے

علاوہ دوسرے زیادہ اہم سیاسی معاشرتی اخلاقی اور معاشی اسباب بھی تھے تسلیم کرتا ہے کہ ادھر مسیحی کلیسا نے فی الحقیقت اندر سے "کافر" سلطنت کو کھوکھلا کر دیا اُدھر شمالی وحشی باہر سے حملہ کر کے اُس کے علاقے میں گھس آئے + لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ عیسائیوں اور شمالی قوموں نے صرف تباہی و بربادی کا کام کیا + اگر انہوں نے ایک سلطنت کو جو اپنا مدعا پورا کر چکی تھی تباہ کیا اور ایک تمدن جو ناکارہ اور ذلیل ہوگیا تھا برباد کر دیا تو اُن کے کھنڈروں پر انہوں نے ایک نئی دنیا بھی تعمیر کر دی +

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسیح کے زمانے سے دو ہزار سال قبل تک شمالی یورپ کے جنگلوں اور چراگاہوں سے کس طرح حملہ آوروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جنوب کے روشن و زندہ تمدنوں پر چھاپے مارتے رہے + میدی اور ایرانی پارتھی اور ارمنی یونانی اور لاطینی باری باری آئے اور عراق سے لے کر بحرِ متوسط کے سارے علاقے میں جا بجا بس گئے + ان کے بعد کلتی زبان بولنے والے لوگ آئے "گال" اطالیہ پر چوتھی صدی ق م میں چڑھ آئے - انہوں نے اٹرسکی طاقت کو توڑ دیا روما کو ۳۹۰ ق م میں تہ و بالا کیا اور آخر وہ ایلپس اور اپی نائین کے کوہستانوں کے مابین اس علاقے میں بس گئے جس کا نام اسی وجہ سے "ایلپس سے ورے کا گال" پڑ گیا + بعد کی صدی میں اسی نسل کے "گالیشیوں" نے اناطولی سرزمین پر اپنی بستی قائم کر دی +

سنِ عیسوی سے ایک صدی قبل سمبری اور ٹیوٹن قومیں جنوبی ملکوں کی طرف بڑھیں - یہ شمالی حملہ آوروں کی پہلی جماعت تھی جو جرمنی کے جنگلوں بحیرۂ بالٹک کے ساحلوں اور سکینڈینیویا کی دُور دراز بنجر زمینوں کی رہنے والی تھی - جب اہلِ روما کو اِن وحشیوں کے مقابل میں پے در پے شکستیں ہوئیں تو انہوں نے اپنی سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لئے (۱۰۲ تا ۱۰۱ ق م میں) اپنی ساری مساعی صرف کر دیں - آخری صدی ق م میں یہی شمالی خطرہ تھا جس سے ڈر کر روما نے "ایلپس کے پرے کے گال" پر قبضہ جمایا اور دریائے رائین کی سرحد کو مضبوط کیا + جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں آگسٹس نے کوشش کی کہ وہ رائین اور ایلب کے درمیانی علاقے کو ملحق کر کے اس خطرے کو دور کر دے لیکن ناکام رہا (۹ء) + غرض شمالی خطرہ قائم رہا اور روز بروز بڑھتا گیا اور بعد کے شاہنشاہوں سے صرف یہی ہو سکا کہ ادھر محافظت کے سامان کرتے رہیں اور اُدھر کبھی کبھی گوشمالی کے لئے غنیم کے علاقے میں مہمیں بھیجتے رہیں +

نئی قومیں - یہ شمالی لوگ جو پہلی تین عیسوی صدیوں میں روما کی سلطنت کے افق پر ایک ابرِ سیاہ کی طرح چھائے رہے دو بڑی شاخوں میں منقسم تھے + ایک تو ٹیوٹانی شاخ تھی جس کے فرینکوں اور المانیوں کے جتھے رائین کے پار قائم تھے سیکسن گوتھ اور ایلب دریاؤں کے آخری حصے میں آباد تھے اور لومبارڈ اور برگنڈی قومیں ایلب اور وسچولا کے

دریاؤں کے مابین دوسری گاتھی شاخ تھی جس کا وطنِ مالوف غالباً سکینڈ نیویا تھا۔ نارس سویڈن جوٹ کے علاوہ جو بالٹک کے ساحلوں پر آباد رہے اس میں وہ گاتھ جیپیڈی اور وینڈل شامل تھے جو مدتوں دور دور تک گھومتے رہے اور عیسوی سن کے شروع میں وہ ڈنیوب اور بحیرۂ اسود کے اُن مقامات پر پہنچ گئے جو سلطنتِ روما کی آخری سرحد تھی۔ انہی لوگوں کی یورشوں کو روکنے کے لئے ڈایوکلیشین نے نکومیڈیا کو اور قسطنطین نے جدید روما کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ تیسری صدی عیسوی میں بلقان اور ایشیا میں ان لوگوں کے حملے غائت درجہ تباہ کن ثابت ہوئے۔

یہ نئے حملہ آور ایک عظیم الشان جنگی نسل سے تھے۔ اُن کا قد لانبا بال ہلکے رنگ کے اور سر لمبوترے تھے۔ اُن میں آزادی کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اُن کی فطرت میں انفرادیت کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ وہ انتہا درجہ محنت کش اور تیز فہم بھی تھے۔ اُن کا معاشرتی اور سیاسی نظام جمہوری رنگ کا تھا اور اُن کے ہاں اداراتِ نیابیہ بھی موجود تھے۔ بمقابلہ رومیوں اور کلٹیوں کے وہ پادریوں کے دباؤ کو زیادہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اُن کی خانگی زندگی پُرجوش اور مقابلتہً پاکیزہ تھی۔

روما کی حدود پر حملے کرنے سے بہت پہلے اُن پر بحرِ متوسط کا تمدن اثر انداز ہو چکا تھا۔ ایک تو اہلِ روما اُن کے ملکوں سے اپنی گھٹتی ہوئی فوجوں کے لئے رنگروٹ بھرتی کرتے تھے بلکہ وہ اکثر اُن لوگوں کو سلطنت کے اُن حصوں میں جنہیں طاعون نے برباد کر دیا تھا آباد کر کے اُن میں کھیتی باڑی کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ دوسرے روما کے تاجر اُن کے ملکوں میں آتے جاتے اور تجارت کا ایک خاصا سلسلہ قائم کئے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ عیسائی مبلغوں نے خاص طور پر گاتھوں کے ہاں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ بالخصوص وہ شمالی وحشی جو رائین ڈنیوب اور بحیرۂ اسود کے مضافات میں رہتے تھے اس وقت جب کہ چوتھی صدی کا سانحہ پیش آیا نہایت جلد رومی اور مسیحی اثر قبول کر رہے تھے۔

خانہ بدوشوں کی یورشیں - چوتھی صدی کا سانحہ خانہ بدوشوں کا دھاوا تھا۔ کچھ عرصے سے ایشیائی میدانوں کے گلہ بان آوارہ گرد بے چین اور خوفناک ہو رہے تھے۔ اُن کی مخصوص شورش کے اسباب نامعلوم ہیں۔ لیکن دو وجوہ پیش کی گئی ہیں ایک یہ کہ اُن کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور دوسرے وسطِ ایشیا میں خشک سالی کا دَور دورہ ہوا جس کی وجہ سے اُن کے گلوں اور ریوڑوں کے لئے وہاں چارے کا سامان نہ رہا۔ کچھ بھی ہو سنہ ۳۷۲ء میں اُن کا ایک انبوہِ کثیر جن کو ہن کے نام سے پکارا گیا اُس کھلے "دروازۂ اقوام" میں سے گھس کر جو بحیرۂ خزر اور یورال کے کوہستان کے درمیان ہے دریائے والگا کو عبور کرتے ہوئے مشرقی یورپ کے باشندوں پر حملہ آور ہوا۔ اُن کی تعدادِ کثیر اُن کی خونخواری اُن کی شہسواری اُن کی تیر اندازی اور اُن کے دھاووں کا جوش و خروش ایسا تھا کہ یورپ کا بچہ بچہ

اُن کے نام پر کانپنے لگا اور کچھ عرصہ تک وہ جہاں گئے اُن کا مقابلہ ناممکن ہوگیا +

پہلے وہ ایک ہندی یورپی قوم ایلن پر جو کوہ قفقاز کے شمال میں رہتی تھی آپڑے + بہتوں کو انہوں نے قتل کیا اکثروں کو انہوں نے غلام بنالیا - باقی ماندہ جان بچاکر مغرب کی طرف سرماشیا اور وہاں سے جرمنی میں جاگزین ہوئے اس کے بعد وہ مشرقی گاتھوں (آسٹروگاتھوں) پر جو بحیرۂ اسود کے شمالی ساحلوں پر رہتے تھے اور مغربی گاتھوں (وزی گاتھوں) پر جو ڈنیوب کے نچلے حصّے میں جہاں اب رومانیا ہے رہتے تھے حملہ آور ہوئے + یہ گاتھ لوگ بڑے جنگجو تھے لیکن یہ بھی اُن نئے حملہ آوروں کی مقاومت کی تاب نہ لاسکے + مشرقی گاتھ اکثر مغلوب ہنوں کے ساتھ مغرب کی طرف "ہنگری" اور پنیونیا میں لے جائے گئے - مغربی گاتھوں نے حکومتِ روما کے آگے عاجزانہ درخواست کی کہ انہیں ڈنیوب کے پار آجانے کی اجازت دی جائے اور وعدہ کیا کہ وہ روما کے فرمانبردار بن کر اُس کی سرحد کی محافظت میں پوری پوری مدد دیں گے + سنہ ۳۷۶ء میں بدقسمتی سے مطلوبہ اجازت دے دی گئی + دو سال بعد جب ہنی خطرہ ٹل گیا تو ان مغربی گاتھوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اڈریانوپل پر ایک بڑی بھاری رومی فوج کو شکست دی اور جدید ڈیسیا میزیا اور تھریس پر قبضہ کرلیا + سلطنتِ روما کی ڈنیوبی سرحد اس طوفان میں غرقِ آب ہوگئی (سنہ ۳۷۸ء)

سنہ ۴۰۶ء میں رائین کی سرحد پر دشمن کا ایسا زور ہوا کہ مقابلہ مشکل ہوگیا + ایلن وینڈل اور سوئیو قوموں کے گروہ کے گروہ سلطنت میں گھس آئے اور تین سال تک گال کے علاقہ میں لوٹ مار کرکے سپین میں جا پہنچے + حکومت روما انہیں اپنی قلمرو سے باہر نہ نکال سکی اور آخر کار اُسے اُن کے ساتھ صلح کرکے اجازت دینی پڑی کہ یہیں آباد ہو جائیں + لیکن سنہ ۴۵۰ء میں قدیمی رومیوں اور ان نئے شمالی نوآبادوں کو ایک نئے خطرے کا سامنا ہوا جب ہن اپنے بادشاہ اٹیلا کے زیرِ کمان پھر آگے کو بڑھتے ہوئے رائین کے اس پار آگئے - اور گال کے میدانوں میں تباہی پھیلانے لگے + اس قریبی خطرے نے ٹیوٹن اور لاطینی قوموں کو ایک مضبوط اتحاد میں منسلک کردیا - شاہنشاہی فوجیں اور وحشی قومیں دونوں مل کر مغربی تمدن کے بچانے کے لئے شالون کے مشہور میدانِ جنگ میں سینہ سپر ہوئیں -

عیسائیتِ وسطیٰ کی تعمیر و تشکیل - سنہ ۴۵۱ء میں شالون پر اٹیلا اور اُس کے ہنوں کی قطعی اور نتیجہ خیز شکست اور اس کے بعد اطالیہ میں ایک معمولی سی یورش کے بعد سنہ ۴۵۴ء میں اٹیلا کی وفات پر اُس کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا +

اس کے بعد روما کی سلطنت بغیر کسی بیرونی مداخلت کے اپنے تئیں اُن نئے حالات کے سانچے میں ڈھالنے لگی جو شمالی حملہ آوروں نے پیدا کردیئے تھے + پانچویں صدی میں (سنہ ۳۹۵ء تا سنہ ۴۷۶ء) سلطنت میں ایک نہایت اہم انتظامی

تقسیم عمل میں آئی جس کے درمیان حدِ فاصل بحیرۂ ایڈریاٹک تھا + مشرق کی طرف یونانی اور ایشیائی صُوبے تھے جن کا صدر مقام قسطنطنیہ قرار پایا + یہاں ایک مضبوط و کامیاب حکومت قائم ہوئی جو بہت سے تغیرات کے باوجود برابر سنہ ۱۴۵۳ء تک برقرار رہی ۔ اُس نے متعدد بار وحشیوں اور ایشیائیوں کے حملوں کو روکا اور صدیوں تک عیسائیت کو اس کے بے شمار دشمنوں سے بچائے رکھا اور قدیمی مغربی تمدن کا چراغ مدتوں اُس کی محافظت میں فروزاں رہا + مغرب میں لاطینی اور کلتی صُوبے ظاہرا طور پر ایک حکومت کے حلقے میں شامل کئے گئے جس کا پایۂ تخت ملان یا راوینا ہُوا لیکن بہت جلد شمالی قوموں نے اپنی طاقت اور اپنے رعب کا سکّہ جاری کرلیا اور سنہ ۴۷۶ء میں کٹھ پتلی بادشاہ رومیولس آگسٹس کے تخت سے اتارے جانے کے ساتھ مغرب میں شاہنشاہی نظم ونسق کا قلع قمع ہوگیا +

روما کی مغربی قلمرو کے کھنڈروں پر مندرجہ ذیل نامی "شمالی" حکومتیں قائم ہوئیں :- (۱) مغربی گاتھ بہت سی آوارہ گردی کے بعد جس کے دوران میں انہوں نے اطالیہ کو تہ و بالا کیا اور سنہ ۴۱۰ء میں شہرِ روما میں لوٹ مار کی آخر کار سپین میں آباد ہوئے + (۲) وینڈل سپین سے جلاوطن ہوکر افریقہ کو نقلِ مکانی کرگئے اور سنہ ۴۳۹ء میں انہوں نے کارتھیج کو اپنا صدر مقام بنالیا + (۳) مشرقی گاتھ اپنے با اقتدار بادشاہ تھیوڈورک کی قیادت میں میزونیا سے نکلے اور اطالیہ کو فتح کرکے انہوں نے وہاں پیویا میں سنہ ۴۹۳ء میں اپنی حکومت قائم کرلی + (۴) فرینک جو ممالکِ نشیبی میں بسے ہوئے تھے مغرب کی طرف چل نکلے ۔ یہاں تک کہ اپنے بادشاہ کلووس کے عہد میں (سنہ ۴۸۱ء تا سنہ ۵۱۱ء) انہوں نے اپنی مملکت مغرب میں بحرِ اوقیانوس تک اور جنوب میں پرنیز کے پہاڑوں تک پھیلالی + (۵) برگندی دریائے رھون میں آباد ہوگئے (۶) اینگل سیکسن اور جوٹ ایلب کے نچلے حصوں سے اُٹھ کر متروکہ رومی صوبے برطانیہ پر قابض ہونے لگے (سنہ ۴۵۰ء)

لیکن اگرچہ اِن تغیراتِ ملکی کے باعث روما کی حکومت مٹ گئی تاہم روما کی روایات سارے مغرب میں نہ صرف قائم رہیں بلکہ ہر جگہ قومی زندگی پر اثر انداز رہیں + وحشی سردار اور بادشاہ عام طور پر سنہ ۴۷۶ء تک راوینا کے رومی شاہنشاہ کی رسمی فرمانروائی کا اعتراف کرتے رہے + وہ اُس سے شاہی خطابات و مراتب حاصل کرنے پر اور قنصل اور امراء کے جبّے ملنے پر فخر کرتے تھے + اور اس پر طرہ یہ کہ انہوں نے اپنا قدیمی کفر چھوڑ دیا اور سلطنتِ روما کا مذہب قبول کرلیا + اس طور سے روما نے اپنے روحانی اقتدار کے ذریعے سے اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور رعب پالیا اور نئی وحشی شخصی حکومتوں میں زمانۂ وسطیٰ کی عیسائیت کی شاندار یکسوئی پیدا کردی !

بشیر احمد

تجلیات

دل ہے کسی کا جلوۂ زیبا لئے ہوئے
ذرہ ہے آفتاب تجلّی لئے ہوئے

نامِ خدا! اِدھر بھی نظر ہو کہ ساقیا!
بیٹھے ہیں ہم بھی دل میں تمنّا لئے ہوئے

پھر آرہا ہے جھوم کے مستِ شبابِ حسن
آنکھوں میں موج قلزمِ صہبا لئے ہوئے

معمور کائنات ہے تیرے جمال سے
ہر شے ہے تیرے حسن کا جلوہ لئے ہوئے

پھر آگئی بہارِ گل افشان و مے فشاں
دامن میں صد ہزار تماشا لئے ہوئے

پہنائے کائنات ہے فردوسِ رنگ و بو
ہر شے ہے جلوۂ طرب افزا لئے ہوئے

ہے چودھویں کا چاند کہ سرچشمۂ جمال
آغوش میں ہے حُسن کی دنیا لئے ہوئے

لیلائے شب ہے سازِ محبت پہ نغمہ زن
حورِ سحر ہے دوش پہ مینا لئے ہوئے

ہر آستانِ حسن پہ جھک جھک گئی جبیں
سر میں ہوں بے قراریٔ سجدہ لئے ہوئے

کیوں روح جذب ہوگئی حسنِ مجاز میں
یارب ہیں جلوہ ہائے بتاں کیا لئے ہوئے

خورشید و ماہتاب ہیں یا ساقیٔ بہار
میرے لئے ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

ہر گل کو چومتا ہوں اثرؔ فرطِ شوق میں
ہر گل ہے اُن کا جلوۂ زیبا لئے ہوئے

اثر صہبائی

ملکِ بابل

اُس لق و دق میدان کو جس کا نام اہلِ یونان نے میسوپوٹے میاہ (*Mesopotamia*) رکھا تھا قدرت نے دو حصّوں پر تقسیم کیا ہے۔ اُس کا نصف حصّۂ شمالی سنگ لاخ ہے اور موسمِ برسات میں چراگاہ کا کام دیتا ہے۔ اولادِ اشر (*Assyrians*) کے وہاں آباد ہو جانے سے اسیریا (*Assyria*) مشہور ہو گیا۔ عرب اِس خطہ کو الجزیرہ کہتے ہیں۔ جنوبی حصہ متعدد انہار کی وجہ سے غیر معمولی طور پر زرعی بن گیا تھا۔ اہلِ یونان اس کو بے بی لونیا (*Babylonia*) اور عرب العراق کہتے ہیں۔ اِس خطہ میں قوم تورانی اور اولادِ سام کے آباد ہو جانے سے نصف حصّہ کا نام شومیر (*Sumer*) اور نصف کا نام اکد (*Akkad*) ہو گیا تھا۔ شمالی مشرقی حصہ کو اکدّ اور جنوبی مشرقی حصہ کو جو خلیج فارس کے گرد اور اُس کے جانب واقع تھا شومیر کہتے تھے۔ یہ دونوں خطّے دریائے دجلہ اور دریائے فرات کی جنوبی وادی میں واقع تھے اور کوئی قدرتی حدِ فاصل اِن دونوں خطّوں کے درمیان نہیں ہے۔ ان کے مغرب اور جنوب میں ریگستانِ عرب اور خلیج فارس واقع تھے۔ دریائے دجلہ غالباً اُن کی مشرقی حد تھی اور ایک خط اگر شہر سمارہ واقع دجلہ کے ذرا نیچے سے شہر ہیت واقع فرات تک کھینچا جائے تو اسے شمالی حد سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ امر استعجاب سے خالی نہیں کہ باوجود ہزاروں برس کی سلطنت اور لاثانی شان و شوکت کے جن کا اثر آج تک ہر قوم و ملت کے دل پر باقی ہے ملکِ بابل کی قدیم تہذیب و تمدن کے آثار کا بڑا حصّہ فنا ہو گیا۔ آج سے کچھ پہلے ممالکِ بابل اور اسیریا کی تہذیب و تاریخ کا علم قطعاً محدود تھا۔ صرف توریت کی معدودے چند آیات ہراڈوٹس[1] اور زینوفن[2]

---

[1] ہراڈوٹس مشہور سپاہی اور قدیم یونانی مورخ۔ فنِ تاریخ کا موجد ہے۔ ۴۸۴ء قبلِ مسیح میں پیدا ہوا اور ۴۲۵ء قبلِ مسیح میں فوت ہوا۔ یہ ہیلی کارنیسس (*Helicarnassus*) واقع ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا جو کیریا (*Caria*) میں ڈوریا والوں (*Dorians*) کی ایک بستی تھی۔ اُس کی پیدائش کے زمانہ میں صوبہ کیریا کی حاکمہ دارا گشتاسپ (*Darius Hystaspes*) شاہ ایران کی ایک سہیلی یا خواص ارتیمز (*Arthemes*) نام کی تھی۔

[2] زینوفن مشہور ایرانی مورخ و جنرل جس کی ذہانت و ذکاوت، فہم و فراست، حزم و احتیاط سے دس ہزار یونانی فوج کی بخیر و عافیت بعد ہزیمت ایسی ہوئی تھی۔ مورخ مذکور دارا ثانی شاہ ایران (۴۰۵-۳۶۱ ق م) کے خلاف اس کے بھائی کائرس کی طرف سے لڑا تھا۔

کے سرسری بیانات۔ جوزیفس[1] اور ٹی سیاس[2] کی تصانیف جو برسس[3] بابلی کی تاریخ بابل کا اقتباس ہیں نیز دیگر یونانی اور لاطینی مورخوں کی مختصر تصانیف ہماری رہبر تھیں لیکن یہ مصالح اس قدر کافی نہ تھے جن کی امداد سے اُن ممالک کی تہذیب کا کامل اندازہ ہو سکتا یا صحیح تاریخ مرتب ہو سکتی۔

بخلاف مصر بابل اور اسیریا کے دلفریب آثار جو سیاحوں کی کشش کا باعث ہو سکتے تھے نابود ہو چکے تھے لیکن اپنی فوجی قوت۔ تعجب خیز بلند منادر۔ عالی شان محلات۔ رشک ارم باغات۔ انہار کے جال اور کرشمہ ہائے نجوم و سحر سے بنی آدم کے دلوں پر ایسا سکہ بٹھایا تھا کہ آج تک اُن کے متعلق مبالغہ آمیز روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ دریائے فرات اور دریائے دجلہ کی سالانہ طغیانی سے گو زمین غیر معمولی طور پر زرخیز بن گئی تھی تاہم انہار کا جال جب تک باقاعدہ نہیں پھیلایا گیا جان اور مال معرضِ خطر میں رہے اور اضلاع کے اضلاع ہفتوں بلکہ مہینوں غرقِ آب رہتے تھے۔ بعد زوالِ سلطنتِ بابل انہار کی صفائی اور درستی میں غفلت اور تساہل سے وہی انہار جو محافظِ جان و مال تھیں غارت گر بن گئیں۔ وہ عمارات جو متعدد نسلوں کی محنت و مشقت کی یادگار تھیں بہت جلد فنا ہو گئیں۔ وہ نادر مصالح یعنی خشت و قیر جن کی خوبی کے باعث اس عہدِ عتیق کے کاریگروں نے بلند شاندار اور مشہور عمارات تعمیر کی تھیں عالم ہیولانی بلکہ کاغذی گھروندے کی طرح ناپائیدار اور بے ثبات ثابت ہوئے۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

بادشاہ بخت نصر[4] ثانی کا قول ہے کہ مرمت کی طرف سے غفلت کی جائے تو پنتالیس سال میں اعلیٰ سے اعلیٰ

---

[1] جوزیفس مشہور یہودی مورخ پہلی صدی عیسوی میں گزرا ہے۔

[2] ٹی سیاس دارا ب ثانی شاہِ ایران (Artaxerxes Memnon Alias Darius ii) کا طبیب تھا۔ بادشاہ مذکور کا عہد [illegible] قبلِ مسیح سے [illegible] قبل مسیح تک تھا۔

[3] برسس بابلی۔ مورخ ہیئت دان اور پوجاری مندر مردوخ۔ برسس مذکور نے تاریخ بابل پیدائشِ عالم سے سکندر اعظم کے عہد تک قلمبند کر کے سکندرِ اعظم کی حضور میں پیش کی تھی۔ بقولِ مورخ جوزیفس اہلِ بابل کو ناز تھا کہ واقعات متعلقہ ہیئت و احکام نجوم و تقویم وغیرہ طوفانِ نوح کے ایک سو پندرہ سال کے بعد سے سکندر اعظم کے عہد تک اُن کے پاس محفوظ ہیں۔ حکیم ارسطو کو علم ہوا تو اُسے اُن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اپنے شاگرد کیلس تینیز (Calesthenes) سے فرمائش کی کہ جو سب سے صحیح نسخہ ہو اُس کے مطالعہ کے واسطے بھیجے چنانچہ بعد کوشش بسیار اُس نے ایک نسخہ برسس بابلی سے حاصل کر کے اپنے اُستاد کو بھیجا اور خود بھی ایک رسالہ مرتب کیا جو ڈی کولو (Decolo) کے نام سے مشہور ہے۔

[4] بخت نصر ثانی بادشاہ بابل [illegible] قبل مسیح میں گذرا ہے۔

اور مستحکم سے مستحکم عمارات کھنڈر ہو جاتی ہیں۔ اس قول سے تصور ہو سکتا ہے کہ دو ہزار سال تک غیر آباد اور کس مپرسی کی حالت میں رہنے سے اُن عمارات کی کیا صورت بن گئی ہوگی اور اُن کی تحقیقات میں کس قدر دوسری اور مشکلات کا سامنا ہؤا ہوگا۔

تمام عمارات منہدم ہو کر بد ہیئت کھنڈروں کی صورت میں مبدل ہو گئی تھیں اور تند و تیز ہواؤں نے صحرا کے ریگ کو اڑا اڑا کر اِن کھنڈروں پر لا ڈالا تھا حتی کہ ریگ سے تمام آثار پوشیدہ ہو کر ٹیلوں کی صورت بن گئے تھے دراصل قدرت نے اِن کھنڈروں کو ریگِ صحرا سے پوشیدہ کر کے اپنے فضل و کرم کا اظہار فرمایا کیونکہ مذکورہ کھنڈر اگر کھلے رہتے تو دریاؤں کی طغیانی اور برسات کے پانی کے اثر سے وہ گلی کتبے جو آج تاریخی دنیا میں ہمارے رہبر ہیں نیست و نابود ہو جاتے اور قیامت تک تاریخ بابل پر دہ خفا یا صحیفۂ مختوم کی صورت میں رہتی۔ ریگ کے طبق نے اُن کی ایسی حفاظت کی کہ کھنڈروں کے زیرین حصے سے آج عہدِ عتیق کے ہزاروں بے بہا مختلف الہیئت کتبے بت مہریں قبریں اور دیگر یادگاریں برآمد ہو چکی ہیں جن کے طفیل تاریخِ بابل پر کافی روشنی پڑ گئی ہے۔ اصل واقعات کے تاریکی میں رہنے سے یا لاعلمی کے سبب عموماً روایات مقبولِ خاص و عام ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات اُن روایات کی تحقیق سے اصل واقعہ کا انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔

شہرِ موصل کے متصل متعدد ٹیلے ہیں۔ بعض پر عرب آباد ہو گئے ہیں اور فی زمانناً وہ آبادی کا یجوق کے نام سے مشہور ہے۔ ان ٹیلوں میں سے ایک پر ایک مسجد اور ایک قبر ہے جس کو وہاں کے باشندے مزارِ حضرتِ یونس علیہ السلام کہتے ہیں۔ گو یورپی سیاح اِس کو فرضی مزارِ حضرتِ یونس علیہ السلام سمجھتے ہیں تاہم شہرِ نینوا سے حضرتِ یونس[۵] کے جو تعلقات

---

[۵] حضرتِ یونس علیہ السلام تغلط پلیسر شاہ اسیریا کے ہمعصر تھے جو ۷۶۶ قبل مسیح میں گزرا ہے۔ شہرِ نینوا اس کا دار الامارت تھا۔ احکامِ الٰہی کی تعمیل میں حضرتِ یونسؑ شہرِ نینوا میں بغرضِ ہدایت تشریف لے گئے تھے۔ توریت میں آپ کے نینوا تشریف لے جانے کا واقعہ درج ہے وہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے یوناہ بن امتی کو خدا نے حکم دیا کہ نینوا جا کر وہاں کے باشندوں کو ہدایت کرو کیونکہ اُن کے اعمال ہماری ناخوشی کا باعث ہیں۔ یوناہ نے بجائے نینوا کے ترسیش (جنوبی اسپین) کی راہ لی اور جہ پا لر یا ذبہنچ کر کشتی پر جو ترسیش جانے والی تھی سوار ہو گیا کچھ دور کشتی مذکور پہنچی تھی کہ خدا نے ایسا طوفان بھیجا کہ کشتی ڈوبنے لگی۔ ملاحوں نے یاس و ہراس سے اپنے اپنے معبود کو یاد کیا اور کشتی کو ہلکا کرنے کی غرض سے اجناس سمندر میں پھینک دیں۔ اس وقت یوناہ کشتی کے زیریں حصہ میں سوتا تھا۔ ناخدا نے جگا کر یادِ الٰہی کی ہدایت کی۔ پھر اہلِ کشتی نے قرعہ ڈال کر دریافت کیا کہ وہ غیر معمولی طوفان یوناہ کی وجہ سے آیا تھا .... یوناہ کی درخواست پر اُس کو سمندر میں پھینک دیا اور طوفان فرو ہوا۔ خدا کے حکم سے ایک مچھلی یوناہ کو نگل گئی اور تین شب و روز یوناہ مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ یوناہ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

رہے ہیں وہ ان ٹیلوں پر شہرِ نینوا کا شبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔ چنانچہ کھودنے سے ثابت ہو گیا کہ جس ٹیلے پر مزار مذکور ہے وہ قدیم شہرِ نینوا کا ایک حصہ ہے اور دیگر ٹیلے اِس عظیم الشان شہر کے محلے تھے۔ اسی طرح بغداد سے چالیس میل کے فاصلہ پر چند ٹیلے ہیں۔ اُن میں سے ایک کا نام وہاں کے عرب باشندے بابل بتاتے تھے تحقیق سے اُن کا قول پایۂ ثبوت کو پہنچا۔ بہر حال روایات ہی ذریعۂ سراغ ہوئیں۔

سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی سے اِن روایات نے یورپی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا شدہ شدہ یورپ کی ہر بڑی سلطنت نے اپنے نمایندوں کو بھیج کر تحقیقات شروع کی جو آج تک جاری ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں جب کہ ایک یہودی رہبان بنجامن ساکن ٹیوڈیلہ ضلع نوار شہرِ بغداد میں وارد ہوا تو اُس سے وہاں کے یہودیوں نے بیان کیا کہ مقامِ حلہ کے آس پاس کھنڈروں میں اب بھی بادشاہ بخت نصر ثانی کے محل کے آثار اس گلخن کے قریب پائے جاتے ہیں جس میں حنانیا[1]۔ مشائیل[2] اور ازاریہ[3] ڈالے گئے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۵) عفوِ گناہ اور رہائی کی دعا مانگی تو بحکمِ خدا مچھلی نے اس کو خشکی میں اُگل دیا پھر خدا کے حکم سے شہرِ نینوا پہنچ کر ہدایت شروع کی۔ توریت سے زیادہ مشرح و مفصل حالات یونس علیہ السلام تاریخِ طبری روضۃ الصفا وغیرہ میں درج ہیں۔ اکثر یورپین مورخ اس واقعہ سے منکر ہیں۔ اُن کے خیال میں تین روز کے بعد مچھلی کے معدہ سے زندہ برآمد ہونا خلافِ عقل ہے۔ اور مذکورہ واقعے کی تشریح میں خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ گو بلا استیعاب نظرِ تنقید ڈالنے سے اُن کی تشریح کا کوئی پہلو پایۂ صداقت کو نہیں پہنچتا تاہم نقلِ کفر کفر نباشد پر کاربند ہو کر ذیل میں درج کرتے ہیں۔
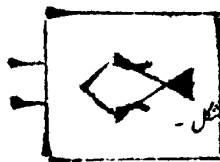
بعض یورپین مورخوں (Mr. Ragozin Chilperic Edwards & Others) کا قول ہے کہ شہرِ نینوا کا نام زبانِ اہلِ اشور میں نینوا ہے جو مشابہ نونو کے ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں علاوہ اہلِ اشور کی زبان میں نینوا اگر لکھا جائے تو تیر نما حروف کی کشش سے ایک مچھلی تالاب میں بن جاتی ہے بتلایہ شکل — لہٰذا جس مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو نگلا تھا وہ شہرِ نینوا تھا اور رہائی کے واسطے اُن کی گریہ وزاری اور دعا کا اثر کا ساکنانِ شہر اور تکالیف کے باعث ہوگا۔

[1] سنہ ۵۸۶ بعد فتح بیت المقدس ۵۸۶ قبل مسیح میں یہ تینوں یہودی شہزادے بخت نصر ثانی کے حضور میں قید ہو کر آئے حسب الحکم عام قیدیوں کے ہمراہ بابل بھیج دیئے گئے بعد تعلیم و تربیت بادشاہ مذکور نے اپنی روبکاری میں متعین کیا حنانیہ کا نام تبدیل ہو کر شدرخ۔ ازاریہ کا نام عبید نیگو اور مشائیل کا نام میشاخ ہو گیا بخت نصر ثانی نے جب اپنا ساٹھ کیوبٹ (یونانی کیوبٹ برابر ہے ۱۸۔ انچ اور ۲۰ء۶ انگریزی کے) کا طلائی بت سکہ کر اُس کی پرستش کا اذن عام دیا تو ان تینوں شاہزادوں نے انکار کیا۔ بقولِ یہود سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں وہ گلخن میں ڈال دیئے گئے لیکن آگ نے اُن پر کچھ اثر نہیں کیا۔ بادشاہِ مذکور نے متعجب ہو کر حکم دیا کہ کوئی شخص اس دن سے یہود کے خدا کو بُرا نہ کہے ورنہ گردن ماری جائے گی (کتاب حضرت دانیال ۱-۱۱-۳-۱۲)

بقول مسٹر راجرز (Mr. Rogers) ربیؔان مذکور کا لاطایل بیان خود شاہد ہے کہ اُس کا بابل کی طرف کبھی گذر ہی نہیں ہُوا تھا - جس قدر حالات اُس نے قلمبند کئے ہیں سب روایتوں پر مبنی ہیں - بہر حال بنجامن مذکور کو مغالطہ ہُوا - بیرس نمرود کو وہ مینارِ بابل سمجھا - کیونکہ اس کا بیان ہے کہ بجلی کے صدمہ سے مینارِ مذکور بنیاد تک شق ہو گیا ہے - دراصل مندر بورسپ پا کی جو البیرس یا بیرس نمرود میں واقع ہے ایسی ہی صورت ہے - دبورسپ پا کا حال انشاءاللہ تعالیٰ آیندہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا)

سولھویں صدی عیسوی میں ایک انگریز تاجر جان الڈرڈ کا تین دفعہ شہرِ بغداد میں گذر ہوا جس کا اُس نے جدید بابل کے نام سے ذکر کیا ہے - وہ لکھتا ہے کہ حسبِ معمول اُس کا گذر اُس مقام پر ہُوا جہاں کسی زمانہ میں عظیم شہرِ بابل آباد تھا جس کے متعدد کھنڈر دور دور تک اس بیابان میں پھیلے ہوئے تھے - اکثر فرصت کے وقت وہ کھنڈروں کی سیر کرنے جایا کرتا تھا -

۱۶۰۰-۱۵۹۹ء میں انٹنی شرلی کا اُدھر سے گذر ہوا اور کچھ زمانہ بعد ۱۶۱۶ء میں اٹلی کے ایک باشندہ پٹرو ڈیلاوال[۲] وہاں پہنچا - اُس نے قدرے صحت کے ساتھ مینارِ بابل کی تحقیق کی اور مینارِ بابل کا مقام اُس ٹیلے کو قرار دیا جہاں شہرِ بابل واقع تھا اور جہاں سے وہ بخت نصر ثانی کے عہد کے چند روغنی چوکے جن پر بادشاہِ مذکور کا نام لکھا ہُوا تھا روم (اٹلی) لے گیا - غالباً آثارِ قدیمہ کا یہ سب سے پہلا مجموعہ گو حقیر تھا جو ملکِ بابل سے یورپ پہنچا تاہم اُس نے مقناطیس کا کام کیا - یورپ کی ہر بڑی سلطنت بابل اور اسیریا کی تہذیب و تمدن کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئی - ظاہر ہے کہ یورپ کا تمدن و معاشرت ان عظیم الشان قوموں سے مختلف ہے لیکن قدیم ادبیات اور فنون وغیرہ کی تحقیق کے شوق نے ایک روح پرور ولولہ پیدا کر دیا -

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ۱۸۱۱ء میں مسٹر ریچ نے اور ۱۸۵۰ء میں مسٹر لے یارڈ نے ۵۴-۱۸۵۲ء میں سلطنتِ فرانس کی طرف سے جولز اوپرٹ نے اور برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ہرمز ریسم نے ۱۸۷۹ء و ۱۸۸۹ء میں شہرِ بابل کے مختلف کھنڈروں کو کھودا لیکن تحقیقات کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی - ۱۸۸۷ء و ۱۸۸۹ء میں جرمن گورنمنٹ کی طرف سے ڈاکٹر کالڈیوی نے قصرِ بخت نصر کے مشرقی حصہ سے کچھ روغنی چوکے نکال کر جرمنی روانہ کئے جن کو جرمنی کے معتمدِ عجائب خانۂ شاہی ڈاکٹر ریچرڈشون نے نہایت وقعت کی نظر سے دیکھا اور ۱۸۹۹ء میں ڈاکٹر موصوف کی زیرِ نگرانی

سلہ 1. The Itenerary of Benjamin of Tudela (Jewish Quarterly Review Vol xviii)

سلہ 2. Pietro della Valles "Viaggi" (Rome 1650 A.D.)

شہرِ بابل کی باقاعدہ کھدوائی شروع کی گئی اور سولہ سال تک مسلسل تحقیقات جاری رہی۔

یونانی حکما نے تمام روئے زمین کو سات حصّوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک حصہ کا نام اقلیم رکھا ہے۔ ہر اقلیم خطِ استوا کی جانب سے شروع ہو کر قطبِ شمالی کی جانب منتہی ہوتی ہے۔ اس یونانی حساب کے بموجب بابل کا طول جزائرِ خالدات سے ۴۴ درجہ ۱۲ دقیقہ اور ۳۰ پل ہے اور عرض اس کا خطِ استوا سے ۳۲ درجہ اور ۴۳ دقیقہ ہے۔

اولادِ سام کی زبان میں شہرِ بابل کا اصل نام باب ایلی تھا جس کے معنی ہیں دیوتاؤں کا دروازہ بعض کتبوں میں باب ایلو یعنی خدا کا دروازہ بھی لکھا ہے۔ اِس سے قدیم تر نام اس کا اہلِ شومیر کی زبان میں کادنگررا یا کادیررا تھا اور اس کے معنی بھی وہی ہیں۔ اہلِ اکد کی زبان میں تن ترکی تھا جس کے معنی مقامِ حیات کے ہیں۔

توریت کے باب ۱۱۔ آیت ۲ سے واضح ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کی اولاد نے طوفان سے ایک مدت بعد جانبِ مشرق سفر کیا اور ملکِ شنعار کے وسیع میدان میں پہنچ کر آباد ہو گئی[1] اور شہرِ بابل تعمیر کیا۔

بقول پادری نیوٹن براؤن (Rev. Newton Brown) نوح علیہ السلام کے پرپوتے نمرود نے اس (بابل) کو رونق اور وسعت دی۔ ملکِ اسیریا کی مشہور شاہزادی سیمی رامس[2] نے ۱۲۰۰ قبلِ مسیح میں شہرِ بابل کو از سرِ نو

---

[1] توریت باب ۱۱ آیت ۲۔ جب وہ (اولادِ نوح) مشرق سے روانہ ہو کر ملکِ شنعار میں پہنچی تو انھوں نے ایک میدان دیکھا اور اس میں آباد ہو گئی۔ آیت ۳۔ اور آپس میں صلاح کی کہ خشت بنا کر آگ میں پکائیں + آیت ۴۔ پھر مشورہ کیا کہ ایک شہر تعمیر کیا جائے نیز ایک مینار جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے تاکہ یادگار قائم رہے اگر روئے زمین پر منتشر ہو جائیں۔

شارحینِ توریت نے تعیینِ سن میں غلطی کی ہے اُن کے قول کے موافق ۲۲۳۳ ق م میں شہرِ بابل کو اولادِ نوح نے آباد کیا اور ۲۲۱۵ ق م یا ۲۰۰۰ ق م میں نوح علیہ السلام کے پرپوتے نمرود نے اس کو رونق اور وسعت دی۔ تعیینِ تاریخ و سنہ کا جہاں تک تعلق ہے شارحینِ توریت کے اقوال پایۂ ثبوت سے ساقط ہیں کیونکہ نمرود کے کم و بیش ایک ہزار سال بعد حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ کا زمانہ تھا۔ حمورابی بادشاہِ بابل آنحضرت کا ہمعصر تھا۔ جدید تحقیقات سے بادشاہ مذکور کا عہد ۲۲۱۳-۲۲۶۷ ق م تھا لہٰذا نمرود کا زمانہ کم از کم تین ہزار سال قبلِ مسیح ہونا چاہئے۔

[2] سیمی رامس۔ اس نام کی کئی شاہزادیاں گزری ہیں۔ نمرود کے لڑکے کی زوجہ کا نام بھی یہی تھا۔ اسی نام کی ایک شاہزادی ۱۲۲۹ ق م میں گذری ہے اور ممکن ہے کہ یہ شاہزادی وہی ہو جس کے عہد میں بقول ھیلانیکس مشہور محاصرہ شہر ٹرائے (Troy) کا ہوا تھا۔ زوجہ الوائیش یا شمس ہداد چہارم (۸۱۱-۸۲۳ ق م) کا نام بھی یہی تھا۔ اس شاہزادی کی یادگار میں ایک سنگین لاٹھ شہرِ اشر ملکِ اسیریا میں نصب کی گئی تھی جس کو چند سال ہوئے ڈاکٹر انڈرائی نے برآمد کیا تھا۔

تعمیر کیا۔ بادشاہ نبوپولیسر[1] نے سنہ ۶۲۵-۶۰۴ ق م میں اور اُس کے لڑکے بخت نصر ثانی نے سنہ ۶۰۴-۵۶۱ ق م میں اُس کو نہایت مستحکم و خوبصورت بنا کر رشکِ ارم کر دیا تھا۔

شہر بابل کی قدامت کے متعلق یہودیوں کو مغالطہ ہوا۔ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ملکِ شنعار (بابل) میں اولادِ نوح کے پہنچنے سے بہت پہلے بنی آدم وہاں آباد تھے۔ وہ لوگ قومِ تورانی کی ایک شاخ تھے جو مدتِ مدید سے خطۂ شومیر میں آباد ہونے کے باعث اہلِ شومیر کے نام سے مشہور ہوگئے تھے۔ اہلِ شومیر کے اعتقاد کے موافق شہرِ بابل کا وجود پیدائشِ عالم کے ساتھ اور پیدائشِ انسان سے قبل ہوا تھا کیونکہ بقولِ اہلِ شومیر شہر بابل خداؤں کا مسکن تھا۔ بہرحال بابل کی قدامت میں کچھ شک نہیں۔ گو بادشاہ حامورابی[2] ہمعصر حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ سے پیشتر کے اکثر تاریخی واقعات ہنوز پنہاں ہیں تاہم قرینِ قیاس ہے کہ شہر بابل کی جو شان اور شوکت۔ قدر اور منزلت بادشاہ بخت نصر ثانی کے عہد میں تھی وہی قریب قریب ڈیڑھ ہزار سال قبل بادشاہ حمورابی کے عہد میں ہوگی البتہ اول الذکر نے جدید باغات و محلات کی تعمیر سے شہر کو بہت وسیع اور زیادہ خوشنما بنا دیا تھا۔

افسوس ہے کہ اس قدیم اور عظیم الشان شہر کو سیناحیرب بادشاہِ اسیریا نے بالکل تباہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے کتبے میں شہرِ بابل کی تباہی کے متعلق بیان کرتا ہے "جب میں اہلِ بابل کی متواتر یورش اور غدر سے عاجز ہوگیا تو میں نے دیگر شہروں کی رعایا کو عبرت دلانے کی غرض سے بابل کی تمام قدیم عمارات مسمار کر دیں۔ دریا کا بند توڑ دیا اور شہر کو غرقِ آب کر کے اُس کا نام و نشان مٹا دیا۔" یہ عبرت ناک واقعہ سنہ ۶۸۹ قبل مسیح میں ظہور میں آیا۔

قدیم شہرِ بابل کی تباہی کے بعد ایسرحیدن[3] بادشاہ نے سنہ ۶۸۰ ق م میں اس کی دوبارہ تعمیر کی لیکن بادشاہ

---

[1] نبوپولیسر بادشاہ بابل سنہ ۶۲۵-۶۰۴ ق م میں گذرا ہے یونانی اس کو بلسز (Belsis) اور ایرانی گودرز کہتے تھے۔

[2] حامورابی بادشاہ بابل جس کو توریت کے باب ۱۴ میں امرافل سے خطاب کیا گیا ہے اس کا عہد سنہ ۲۲۶۶-۲۲۱۳ ق م تھا۔

[3] ایسرحیدن کا بابلی نام اشراخی الدینا تھا۔ اُس کا عہد سنہ ۶۸۰-۶۶۸ ق م تھا۔ یہ سیناحیرب بادشاہ اسیریا کا دوسرا لڑکا تھا۔ اس نے دار الامارت بابل کو تجویز کیا تھا۔ بادشاہِ مذکور کے کتبے شاہد ہیں کہ بابل میں اُس نے منادر کی مرمت اور محلات کی تعمیر کی۔ اسی کے عہد میں منسا بادشاہ بیت المقدس گرفتار ہو کر آیا۔ سنہ ۶۶۸ ق م میں شمس دمکن نے بغاوت کر کے بابل پر قبضہ کر لیا۔ اشربانی پال ثانی نے اپنے عہد میں بابل کو دوبارہ فتح کیا۔ بادشاہ مذکور کے لڑکے اشر امت ایلی شاہِ اسیریا نے کے کاؤس بادشاہِ ایران کے حملہ کے وقت نبوپولیسر کو صوبہ دارِ بابل متعین کیا لیکن صوبہ دار مذکور نے دشمن کے ساتھ مل کر نینوا دار الامارت اسیریا کا محاصرہ کیا۔ شہرِ نینوا کی فتح کے بعد کے کاؤس نے نبوپولیسر کو مستقل بادشاہِ بابل بنا دیا۔

اشربانی پال[51] کے محاصرہ اور فتح کے بعد یہ پھر برباد ہوگیا۔

قدرت خدا کی دیکھیے کہ آتش زن یا قفنس کی طرح اپنی خاک سے شہر بابل نے ہمیشہ دوسرا جنم لیا اور ہر دفعہ جواں بخت وجواں دولت ثابت ہوا۔ نے بوپلیسر بادشاہ کے عہد میں پھر سر بفلک۔ منادر و عالی شان عمارات تعمیر ہوگئیں جاہ وجلال۔ سطوت وجبروت۔ عظمت وشوکت کا نقارہ مثل سابق بجنے لگا اور دبدبہ وہیبت۔ حکومت وسلطنت کے خورشید کی تجلیاں عالم کو خیرہ کرنے لگیں۔ سچ ہے، مالک نے جو چاہا سو کیا۔ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ اور جو چاہے گا سو کرے گا۔

غائب قدرت ہے تیری موجود　　نابود ہو بود، بود نابود

چھوٹا ہو بڑا بلند ہو پست　　ہو ہست نیست نیست ہست

گویا ہیں سب ملائے اعلیٰ　　سبحانک شانہ تعالیٰ

مشہور سیاح وقدیم یونانی مورخ ہراڈوٹس اور حکیم ٹی سیاس نے بابل کے متعلق جو حالات قلمبند کیے ہیں وہ قابلِ وقعت اس وجہ سے ہیں کہ اول الذکر نے شہر بابل کو اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اس کی خوب سیر کی تھی اور آخر الذکر شاہِ ایران دارا[52] ثانی کا طبیب تھا۔ اس کو بابل کی سیر کا اکثر اتفاق ہوا تھا۔

بقول ہراڈوٹس شہرِ بابل ایک مربع قطعہ پر واقع تھا۔ شہر پناہ کی ہر دیوار ایک سو بیس اسٹیڈیا[53] یعنی قریباً چودہ میل کی تھی اس حساب سے اس کا دور کم وبیش دو سو میل مربع تھا۔ فصیلِ مذکور اسی فیٹ چوڑی اور دو سو شاہی کیوبٹ یعنی ۳۳۷ فیٹ ۸۔ انچ یا ۳۰۲ فیٹ ۴۔ انچ بلند تھی[54]

---

[51] اشربانی پال بادشاہ اسیریا ۶۶۸-۶۲۶ قبل مسیح ق م میں گزرا ہے۔ یونانی اس کو سارڈانا پالس کہتے تھے اور توریت میں اس کو اسناپر سے خطاب کیا ہے۔

[52] دارا ثانی (۴۰۵-۳۶۱ قبل مسیح ق م) ایران کا بادشاہ تھا۔ یونانی اس کو Artaxerxes Memnon alias (Darius II) کہتے تھے۔

[53] اسٹیڈیا۔ ایک اسٹیڈیا برابر ہے ۶۰۶ فیٹ اور نو انچ انگریزی کے۔

[54] بعض یورپین مورخ عرض وطولِ شہرِ بابل کے متعلق ہراڈوٹس اور ٹی سیاس کے بیانات کو اس وجہ سے مبالغہ آمیز سمجھتے ہیں کہ اس قدیم زمانہ میں تحقیقِ حال کی طرف میلانِ طبع کم اور روایتوں پہ بلا کد وکاوش اعتماد زیادہ تھا۔ سکندرِ اعظم کے عہد کے مورخوں کا بیان ہے کہ (ارسٹوبیولس جس کے اقوال یوسی بیس نے نقل کیے ہیں) فصیل گیارہ میل ہر طرف اور دور میں کم وبیش ایک سو تیس

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آیندہ)

فصیل کے گرد عمیق اور چوڑی خندق تھی جو دریائے فرات کے پانی سے لبریز رہتی تھی۔ خندق کا فرش اُس کی مٹی سے بنائی ہوئی پختہ اینٹ کے کھرنجہ کا تھا جس میں چونے کی جگہ قیر کو پگھلا کر گرم گرم استعمال کیا تھا خندق کی مٹی سے اینٹیں پکا کر فصیلِ شہر تعمیر کی گئی تھی جس کے کناروں پر جابجا آمنے سامنے بروج اور سپاہیوں کے واسطے حجرے بنے ہوئے تھے۔ حجروں کے درمیان اس قدر جگہ چھوڑی گئی تھی کہ ایک چوکڑی آسانی سے گھوم سکتی تھی۔ اس کی چنائی بھی خشت و قیر سے کی گئی تھی اور ہر تیس ردوں کے بعد ایک تہ نرسل کی دے کر پہلوؤں کو مضبوط کیا گیا تھا۔

اس فصیل میں ایک سو عالی شان دروازے آمد و برآمد کے لئے بنائے گئے تھے۔ کواڑ اور چوکھٹ پیتل کے تھے اُن کواڑوں کا ذکر یسعیاہ پیغمبر یعنی اشعیا علیہ السلام نے اپنی کتاب کے چودھویں باب میں کیا ہے [1] شہرِ بابل کی دوہری فصیل تھی۔ ایک شالخو یعنی فصیلِ بیرونی جو نہایت مستحکم اور نی ست[2] نی بعل کے نام سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰۰) میل مربع تھی۔ حکیم ٹی سیاس کا بیان ہے کہ ہر دیوار سینٹھ اسٹیڈیا تھی اور پچاس فیدم یعنی دو سو معمولی کیوبٹ جس کے تین سو فیٹ ہوئے بلندی میں تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تخمینے نظری تھے۔ باقاعدہ پیمائش کسی نے نہیں کی۔ اگر سکندر کے مورخوں کے اقوال کو ہی صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی شہرِ لندن سے پانچ گنا یا چھ گنا وسعت میں ہوا۔

ڈاکٹر کالڈیوی کا خیال ہے کہ شہر پناہ کا اس قدر طویل ہونا کچھ تعجب خیز نہیں اور نہ ناممکن خیال کی جا سکتی ہے جب کہ ہم کو علم ہے کہ ملکِ چین کی مشہور دیوار طول میں پندرہ سو میل ہے۔ (سر ہنری رالن سن ۱۲ سو میل بتاتے ہیں۔)

ڈاکٹر کنگ اس تمثیل کی تردید میں بیان کرتے ہیں کہ چین کی دیوار مملکت چین کی سرحد ہے شہر پناہ نہیں۔ اگر مقابلہ کیا جاتا تو شہر نانکن واقع چین سے جس کی فصیل کا دَور ۲۴ میل سے کم ہے۔

جولز اوپرٹ ہراڈوٹس کی پیمائش کے موید ہیں۔ انہوں نے اپنے مرتبہ نقشہ میں فصیل کو شہرِ بابل سے بیرس نمرود تک دکھایا ہے اور فصیل کا سلسلہ ہر کھنڈر اور ٹیلے کے کھودنے سے برآمد ہوا۔

قریہ سنجار کے متصل کچھ فصیلوں کے آثار پائے جاتے ہیں جن کو ڈاکٹر ویسباخ (Weisbach) نے اپنے نقشہ بابل میں دکھایا ہے مگر اُن کے شامل کرنے سے مغربی حصہ مشرقی حصہ سے چھوٹا ہو گیا ہے۔

چونکہ ہر مورخ کے نقشہ میں اختلاف ہے لہذا کوئی قطعی رائے فصیل کے طول کی نسبت اس وقت تک قائم نہیں کی جا سکتی جب تک کہ کامل تحقیقات نہ کی جائے۔ اہلِ جرمنی اس کی تحقیق میں مصروف تھے لیکن جنگِ عمومی کی وجہ سے تمام انتظامات درہم برہم ہو گئے۔

[1] Isaiah XIV. 1-2 [2] بقول ابی ڈینس اور یوسی بیس بیرونی فصیل کو بادشاہ بیلس (مورخ) یعنی مشتری نے تعمیر کیا تھا۔

موسوم تھی جس کے معنی ہیں دیوتا بعل میری بنیاد ہے۔ دوسری فصیل اندرونی دورد کہلاتی تھی جس کا لقب اگر بعل تھا یعنی دیوتا بعل کا کرم ہے۔ استحکام میں یہ بھی بیرونی فصیل سے کچھ کم نہ تھی [1]

شہر کے ہر کوچہ میں ایک مستحکم قلعہ بنا ہوا تھا۔ دریائے فرات وسطِ شہر میں موجزن تھا جس کے کناروں پر دورویہ بلند دیواریں کھینچی ہوئی تھیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے دروازے دریائے فرات کی طرف کھلے ہوئے تھے گھاٹ کی سیڑھیاں سطح آب کے نیچے تک تعمیر کی گئی تھیں۔ ہر دو عالی شان دروازوں کے وسط میں تین برج فصیل سے دس فیٹ بلند محافظینِ شہر کے لئے اور چاروں کونوں پر بڑے بڑے گنبد نہایت خوبصورت اور خوشنما بنے ہوتے تھے۔ کل بروج دو سو پچاس تھے [2]

مندرجہ بالا بیان سے اس فصیل کی تعمیر بیس کروڑ مربع فیٹ سے زیادہ ہوئی اور مملکتِ چین کی فصیل [3] سے بحساب مکسر فٹ دوگنی ہوتی۔ شہرِ بابل کی فصیل کو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا گیا تھا۔

ہراڈوٹس اور ٹی سیاس کے زمانہ میں فصیل مذکور اپنی اصلی حالت میں تھی۔ زینوفن کے زمانہ میں مرمت نہ ہونے کی وجہ سے بہت شکستہ ہوگئی تھی اور بلندی میں کہیں کہیں سو فیٹ رہ گئی تھی۔ سکندرِ اعظم کے زمانہ میں کلہم پچھتر فیٹ بلند رہ گئی تھی۔ حوادث گاہِ عالم میں ایسے ہی انقلاب ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

محمد حامد دہلوی

---

[1] جدید تحقیقات شاہد ہے کہ عہدِ بخت نصر ثانی سے بہت پہلے بھی بابل کی فصیل دوہری تھی اور دونوں کے نام قدیم سے اگر بعل اور نی مت تی بعل چلے آتے تھے۔ اکثر بادشاہوں نے اُن کی مرمت کی تھی مثلاً بادشاہ شرغانی شرری دسارگن اول نے ۲۸۰۰ قم میں بادشاہ اشربانی پال نے ۶۶۸ قم میں اور بادشاہ نبوپیسر نے ۶۲۵ قم میں۔

[2] ڈاکٹر کالڈیوی کا قول ہے کہ شمال مشرقی دیوار میں کم از کم نوے بروج تھے صرف پندرہ کی کامل تحقیقات ہوسکی۔

[3] مملکتِ چین کی دیوار بارہ سو یا پندرہ سو میل میں ہے۔ بلندی مختلف مقامات پر ۲۰ سے ۵۰ فیٹ تک ہے۔ ۱۸۲۳ء کے تخمینہ کی رو سے دیوار مذکور میں سلطنتِ انگلشیہ کی تمام عمارات سے زیادہ تعمیری مصالح صرف ہوا ہے

قلبیات

۱

رگِ نیاز میں گر موجِ برقِ ناز نہیں — فتادگی ہے سراپا آمیں! نیاز نہیں

مذاقِ غزنوی سومناتِ دل ہے وہی — توہی ایاز نہیں ہے۔ توہی ایاز نہیں

۲

ترے جگر میں اگر شمع کا گداز نہیں — تو بزمِ یار میں جلنے کا تُو مجاز نہیں

دلِ حزیں سے ہے خالی اگر ترا پہلو — ترے نیاز کا خواہاں وہ بے نیاز نہیں

۳

نگاہِ شوق میں گر سرمۂ نیاز نہیں — حضورِ یار میں اُٹھنے کی وہ مجاز نہیں

زبانِ حسن سے میں نے سنا ہے یہ مصرع — کہ دل وہ دل ہی نہیں ہے جو پاکباز نہیں

۴

اگر تجھے دلِ خود سر پہ اپنے ناز نہیں — قبولِ خاطرِ جاناں ترا نیاز نہیں

تُو اپنے ذوقِ نظر کا اگر نہیں کشتہ — حریمِ ناز میں آنے کا بھی مجاز نہیں

امینِ حزیں

خالد

(ایک ماخوذ افسانہ)

ایک چھوٹے سے آراستہ کمرے میں انگیٹھی کے سامنے ہم چند نوجوان بیٹھے حسبِ معمول باتیں کر رہے تھے، موسم سرما کی ایک طویل شب کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا، سماوار میں چائے کا پانی گرم ہو رہا تھا، گفتگو مشکل سے کسی خاص بحث پر پہنچی تھی بلکہ اب تک ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر منتقل ہو جاتی تھی، آخرکار دورانِ بحث میں دنیا کی نمایاں ہستیوں کا ذکر آگیا۔ اُن ہستیوں کا جو عوام الناس سے بلند تر ہوتی ہیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے خیالات اپنی ذاتی قابلیت کے اعتبار سے بیان کئے، آوازیں بلند ہو کر شور و شغب کی کیفیت پیدا کرنے لگیں، اسی دوران میں ایک مختصر سا شخص چائے پیتا اور سگار سلگاتا ہوا کھڑا ہو گیا، اور ان الفاظ میں ہم سب کو مخاطب کرنے لگا۔

"حضرات! آپ کی سنجیدہ رائیں اس معاملہ میں اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں، مگر فائدہ سے بالکل خالی ہیں، ہم میں سے ہر شخص نے اپنے مخالف کے خیالات سنے مگر اپنے خیالات کو اب تک قابلِ ترجیح سمجھا۔ ہماری زندگی کا یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ہم اس طرح ایک جگہ آ ملے ہیں، اور ہم نے بحث و مباحثہ کا باب کھولا ہے، اس لئے ہم ایک دوسرے کے خیالات و عقائد و خصائل سے کما حقہ واقف ہیں"

اس کے بعد اس مختصر سے آدمی نے سگار کی راکھ آتشدان میں جھاڑ دی، آنکھیں نیچی کر کے مسکرانا شروع کیا۔ ہم بھی اُس کی جانب متوجہ ہوئے، اسی دوران میں اُس سے یہ سوال کیا گیا،

"تو پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہئے، تاش کھیلیں یا سو جائیں، یا پھر اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیں؟"

"تاش کھیلنا ایک خوشگوار مشغلہ ہے، نیند بھی مفید ہوتی ہے" اس مختصر سے شخص نے جواب دیا، مگر ابھی گھر چلے جانا بہت قبل از وقت ہوگا، غالباً آپ میرا مدعا سمجھ نہیں سکے، آؤ، ہم میں سے ہر شخص ایک نمایاں ہستی کا ذکر کرے جس سے کہ وہ اپنی زندگی میں ملا ہو، میرا دعویٰ ہے کہ بیان خواہ کتنا ہی ناقص ہو بہتر سے بہتر دلیل سے زیادہ بامعنی ہوتا ہے"

ہم سب اس تجویز پر غور کرنے لگے،

ہم میں سے ایک نے کہا" علاوہ اپنی ذات کے میں کسی حیرت انگیز ہستی سے واقف نہیں ہوں اور مجھ سے آپ بہت بخوبی واقف ہیں" اس گفتگو کے تمسخرانہ انداز نے حاضرین کے دلوں کو گرمانا شروع کر دیا، ایک اور صاحب

فرمانے لگے۔

"بے شک ہم کسی سے واقف نہیں ہیں"۔ مجوزکی جانب متوجہ ہو کر گفتگو یوں جاری رکھی "آپ ہی آیئے اور اپنا تجربہ بیان کیجئے، مگر یاد رہے کہ اگر ہمیں آپ کے قصہ میں لطف نہ آیا تو ہم بلا تکلف آپ پر پھبتیاں کہنے لگیں گے"۔

پست قامت مجوز آتشدان کے قریب کھڑا ہوگیا، ہم سب اُس کے چاروں طرف بیٹھ گئے اور خاموشی کے ساتھ اُس کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے، مقرر نے ہمیں غور سے دیکھا، ایک نگاہ چھت پر ڈالی، اور اپنی تعریر کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا۔

"میرے عزیز دوستو! دس سال ہوئے میں علی گڈھ میں تعلیم پاتا تھا، میرے والد کی آمدنی معقول تھی، مگر اول تو وہ کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے دوسرے اپنے علاقہ میں ریل سے بہت دور دیہاتی زندگی بسر کرتے تھے، اس لئے انہوں نے میرے قیام و طعام کا انتظام ایک پروفیسر کے ہاں کر دیا، اور اُن کو میرے اخلاقی نشو و نما کا بھی ذمہ دار بنا دیا۔

پروفیسر صاحب موصوف نہایت متین اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ اور بالطبع اُن کو تکلفات و ظاہری رسمیات سے عشق تھا۔ ایک مدت تک میں اُن سے بے حد مرعوب و خائف رہا، ایک روز شام کے وقت کھیل سے واپس آیا، اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدلنے لگا۔ قہقہوں کی مسلسل آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں، میں حیرت زدہ ہوگیا، بھلا کجا پروفیسر صاحب کی کوٹھی اور کجا آزادانہ و بے پروایانہ قہقہوں کی اس قدر مسلسل آوازیں! میں ضبط نہ کر سکا، لپک کر ملاقات کے کمرے میں جا دھمکا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میرے ہوش و حواس جاتے رہے، پروفیسر صاحب اپنے دوستوں کو لئے ہوئے ایک گول میز کے قریب بیٹھے شرابِ ناب کے پیالے پیا پے خالی کر رہے تھے، اُن کا چہرہ سُرخ تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں، مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے، مجھ سے مصافحہ کیا، اور اپنے دوستوں کے روبرو چند تعارفی کلمات کے ساتھ مجھے پیش کیا، میں ایک پاس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فلسفۂ تاریخ پر ایک نہایت عالمانہ بحث چھڑی ہوئی تھی، مَیں بھی بحث میں شریک ہو کر اپنی جدتِ طبع کے جوہر دکھانے لگا، مباحثہ کے بعد حاضرین نے میری فہم و فراست کی تعریف کی، نشۂ غرور نے میرا سر بلند کر دیا، اور میں اپنے مستقبل کی پاکیزہ مگر خیالی تصاویر دیکھ دیکھ کر جھومنے لگا"

اُس کے بعد پروفیسر صاحب مجھ سے آخر دم تک یکساں طور پر ہمیشہ بے تکلف اور آزاد رہے، مجھے اُن کی صحبت میں خاص لطف حاصل ہوتا تھا، میں اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اُن کی خدمت میں صرف کرتا تھا،

پروفیسر صاحب ممدوح کی بیوی کو بھی میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، تھیں نوجوان مگر اُن کے کپڑوں میں سے ہمیشہ دھوئیں کی بُو آتی تھی اور آگے کے دانت بھی گر چکے تھے، عورتوں کا ایک بدنصیب گروہ قبل از وقت چہرہ

کی یہ زیبائش کھو بیٹھتا ہے"۔

"جناب! آپ اصل موضوع سے ہٹتے جا رہے ہیں" سب نے بہ آواز بلند للکار کر کہا۔

"معاف کیجئے، لیجئے میں قصہ پھر شروع کرتا ہوں، میں کالج میں اچھا خاصا ہر دلعزیز ہو چلا تھا، لڑکوں سے میری واقفیت دوستی کے درجہ تک پہنچنے لگی تھی۔ ان دوستوں میں ایک طالب علم بدر تھے۔ بہت معقول اور شریف النفس، وہ اکثر مجھ سے ملنے آتے تھے، میں بھی اُن کو پسند کرتا تھا، تھوڑی ہی مدت میں ہم دونوں بڑے گہرے دوست ہو گئے، علی گڈھ کی پوری آبادی میں میرا کوئی عزیز نہ تھا، میں شہر میں کسی کے ہاں نہ جاتا، اور عورتوں کی صحبت سے بہت خائف رہتا تھا، کالج کے احباب کے والدین واعزا سے میں نے ہمیشہ قصداً پرہیز کیا، اُن کے گھروں پر جانا مجھے ایک دن بھی نہ بھایا۔

میری مالی حالت بہت اچھی تھی، میرے والد مجھے ہر ماہ میں دو تین مرتبہ نوٹوں کا ایک پلندہ بھیج دیتے تھے جن کو نہ کبھی میں نے گنا اور نہ کبھی اُن کا حساب رکھا۔ اسی لئے میرے کمرے میں میرے احباب کے علاوہ اکثر چند خوشامدی بھی جمع ہو جاتے تھے۔

اور نوجوانوں کی حالت سے میری حالت کا آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں، میرے سینہ میں بھی وہ ابال اٹھتا تھا جو تھوڑے ہی عرصہ میں چند بے معنی غزلیات کی صورت میں رونما ہو کر ہوا ہو جاتا ہے، مجھے بھی کسی شے کی آرزو تھی، میں بھی کسی شے کا جویاں رہتا تھا اور میں بھی عالم رویا میں کسی کا نظارہ کیا کرتا تھا، مگر مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ میں کس کا آرزومند اور کس کا شیدائی تھا، شاید یہ ہو کہ میں اپنی تنہائی سے عاجز آگیا تھا، اور زندہ دل افراد کی صحبت کے لئے ترستا تھا، "زندگی" کے لفظ سے میرے سینہ میں ہوک اُٹھتی تھی، اور میں دردِ دروں کو سینہ میں چھپائے رکھتا تھا، احمد! ذرا ایک سگرٹ دینا"۔

سگرٹ سلگا کر اُس شخص نے سلسلۂ کلام یوں جاری رکھا،

"ایک روز صبح کے وقت بدر ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا اور کہنے لگا "لو، تم نے اور بھی کچھ سنا، خالد، خالد آ گئے"۔

"کون خالد؟"

"ارے تم خالد کو نہیں جانتے، افسوس، ابھی چلو، اسی وقت اُٹھ کھڑے ہو، ابھی میں اُن سے تمہاری ملاقات کرائے دیتا ہوں، رات ہی تو وہ تعطیل سے واپس آئے ہیں، ایک حیرت انگیز شخص ہیں"!

"حیرت انگیز"؟

"نہایت"!

"خیر تو تم تنہا ہو آؤ، میں تمہارے حیرت انگیز شخصوں سے مل چکا ہوں"۔

"نہیں نہیں تمہیں خالد سے ملنا ہوگا، ایسا شخص تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا"

میں کہنے کو تھا کہ خالد کو پہلے میرے یہاں آنا چاہیئے، مگر خدا جانے کیوں میں نے بدر کے ارشاد کی تعمیل کی اور اُس کے ساتھ ہولیا، بدر مجھے علی گڈھ کی سب سے زیادہ گندی اور تنگ و تاریک گلیوں میں لے گیا، جس مکان میں خالد رہتا تھا وہ نہایت بوسیدہ اور تکلیف دہ نکلا، ہم دونوں صحن میں پہنچے، ایک تنومند اصیل الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے دھوپ میں پھیلا رہی تھی مبچے چوبی زینہ پر کود رہے تھے، ہم دونوں ایک تاریک راستہ میں سے گذر کر خالد کے کمرے میں پہنچے، اندر داخل ہوئے، آپ کو بخوبی اندازہ ہے کہ ایک غریب مفلوک الحال طالب علم کا کیسا کمرہ ہوتا ہے، دروازے کے سامنے ہی خالد میز کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا سگار پی رہا تھا، اُس نے بدر سے معانقہ کیا، اور خوش مزاجی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ ہماری دونوں کی نگاہیں دوچار ہوئیں، مَیں خود بخود اُس کی جانب مائل ہونے لگا، حضرات! بدر ٹھیک کہتا تھا، خالد یقیناً دنیا کا ایک حیرت انگیز انسان تھا، حیرت انگیز۔ محیّر العقول لو، ذرا میں تفصیل سے بیان کئے دیتا ہوں، لمبا قد، بہت پتلا پتلا چھریرا بدن، چہرہ مہرہ دلآویز، مجموعی طور سے نہایت خوش منظر، اُس کے چہرے کی صحیح تصویر کھینچنا نہایت دشوار ہے، چہرہ کے ہر جزو کو علیحدہ علیحدہ خوب بیان کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بتانا کہ اُس چہرے میں کیا تھا یعنی خاص وہ چہرہ کون سے پیغام کا حامل تھا ایک نہایت دشوار امر ہے"۔

"یعنی چہرہ کی موسیقی" حاضرین میں سے ایک نے کہا۔

"بیشک، چہرے کی موسیقی، اِس لئے میں اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ چہرے کا وہ مخصوص انداز ایک نہ مٹنے والے تبسّم سے ہمیشہ دست و گریباں رہتا تھا، خالد کے والدین اُس کی یاد سے قبل فوت ہو چکے تھے، اُس نے اپنے ایک دُور کے عزیز کے مکان میں آنکھ کھولی جو اخلاقاً بہت پست خیال تھا، پندرہ برس کی عمر تک وہ دیہات میں زندگی گذارتا رہا، پھر وہ علی گڈھ میں آگیا، انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخل ہوا، ٹیوشن سے اُس کی گذر اوقات ہوتی تھی، خالد نہ تو بہت زیادہ بذلہ سنج تھا، اور نہ ذکی، مگر خدا معلوم کیوں ہر شخص اُس کے دام میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ ہم بھی اُس کے رطب اللسان تھے، اُس کے الفاظ، اُس کی نگاہیں، اُس کے انداز شباب کی ملاوٹ کا

سے اِس قدر معمور ہوتے تھے کہ اُس کے سارے احباب اُس پر پروانہ وار فدا ہوتے تھے، پروفیسر اُسے ایک اچھا خاصا ذہین طالب علم سمجھتے تھے، مگر سست اور کاہل۔ اُن کے نزدیک اُس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

خالد نے ہماری شام کی مجلسوں میں ایک تازہ روح پھونک دی، اُس کی موجودگی میں ہماری زندہ دلی پر کبھی بدمذاقی کا اثر غالب نہ ہؤا، اگر ہم کسی وجہ سے دل گرفتہ ہوتے تو ہم اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ مناسب موضوع پر بات چیت کرنے لگتے، اُس حالت میں بھی دل نہ گھبراتا۔ غرض یہ کہ خالد ہماری جماعت کا روحِ رواں تھا، وہ شمع تھا اور ہم سب اس کے پروانہ وار شیدائی ہیں اُسے دل و جان سے چاہتا تھا، میں نے کسی عورت کو بھی اس قدر شدت سے کبھی نہیں چاہا، اب بھی میں اس محبت کو یاد کرکے شرمندہ نہیں ہوتا، بیشک وہ گہری محبت تھی، جس میں مجھے فراق جدائی رشک اور رقابت کی ساری مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں، مثلاً خالد ہم سب کو ایک سا چاہتا تھا مگر احمد کے ساتھ اُس کا برتاؤ اور لگاؤ خصوصیت کا تھا، ہم نے احمد سے اُسے کبھی جدا نہ دیکھا، اکثر وہ اُس سے خفیہ بات چیت کرنے لگتا، اور کبھی کبھی دو دو تین تین دن کے لئے اُس کے ساتھ علی گڑھ سے غائب ہو جاتا، مگر یہ کس کی مجال تھی کہ کوئی خالد سے سوال کرے، نتیجہ یہ ہوتا کہ میں مضطرب رہتا، خالد کا غائب ہو جانا کسی طرح سمجھ میں نہ آتا، میرے اضطراب کی ایک وجہ یہ بھی تھی، میں خود خالد کا مستقل ساتھی بننا چاہتا تھا، اور اسی لئے میں احمد کو اپنا رقیب سمجھ کر اُس سے نفرت کرتا تھا۔

بے اندازہ غور و فکر کے بعد بھی میں خالد کے غائب ہو جانے کی توضیح نہ کر سکا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس کے چہرہ میں استعجاب پیدا کرنے والی ایسی کوئی کیفیت نہ تھی جس پر نوجوان اکثر فخر کیا کرتے ہیں۔ اور نہ اُس کا وہ بے پروایانہ انداز تھا جس سے یہ خیال ہو کہ متعدد قوتیں اس میں خفتہ ہیں مگر ہر موقع پر بروئے کار لائی جا سکتی ہیں، نہیں، اس کا چہرہ سراسر بے لوث اور کھلا کھلا رہتا تھا، مگر جب اُس پر جوش کا غلبہ ہوتا تو یہ معلوم ہوتا کہ اُس کی ہر متعلقہ شے ایک شدید قوت کی حامل ہے، اُس نے اپنی قوت کو کبھی فضول صرف نہ کیا۔ اور نہ کسی حالت میں اُس پر تصنع کا رنگ جما، اِن باتوں کے باوجود میں ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے خالد کی فطری حسیات کا پتہ لگایا، شاید اس لئے کہ محبت میں آدمی دل کی گہرائیوں تک سے واقف ہو جاتا ہے، میں نے تمام خطرات کے باوجود خالد کا اعتماد حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا، مجھے خالد کو خوش کرنے میں زیادہ زحمت گوارا نہ کرنی پڑی، میں ایک بے لوث بچے کی طرح اُس کی پرستش کرتا تھا، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ خالد مجھے کبھی مشکوک نگاہوں سے دیکھتا، مگر جب مجھے یہ معلوم کرکے شدید روحانی تکلیف ہوئی کہ خالد میری بے تکلفانہ قربت کو ناپسند کرتا ہے، اُسے میری گرویدگی سے تکلیف پہنچتی تھی، ایک دن اُس نے مجھ سے کچھ روپے قرض مانگے اور دوسرے ہی دن طنزیہ شکریہ کے ساتھ واپس کر دیئے، موسم سرما یوں گذر گیا،

مگر ہمارے تعلقات میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہوا۔ میں احمد سے اکثر اپنا مقابلہ کرتا، مگر میری سمجھ میں نہ آتا کہ وہ مجھ سے کس طرح قابلِ ترجیح ہے۔ یکایک واقعات نے ایک پلٹا کھایا اپریل کے وسط میں احمد یکایک سخت بیمار پڑا، اور دو ہی دن میں خالد کے زانو پر سر رکھے ہوئے اس دنیا سے چل بسا۔ کامل ایک ہفتہ تک خالد اُسی کمرے میں بیٹھا روتا رہا، نہ باہر نکلا اور نہ کسی سے ہم کلام ہوا، ہم سب کو احمد کی جدائی کا سخت صدمہ تھا۔ احمد کے چہرہ کی ابدی زردی اغلباً اُس کی آنے والی موت کا صحیح پیش خیمہ تھی، میں بھی ان واقعات سے کئی دن تک دل گرفتہ رہا، مگر میرے دل میں ایک نامعلوم توقع کسی مخفی طریقہ سے پرورش پا رہی تھی۔

ایک روز شام کے وقت میں صوفے پر تنہا لیٹا ہوا تھا اور میری نگاہیں چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ ...... کوئی شخص جلدی سے میرے کمرے میں داخل ہوا اور آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، میں نے اپنا سر اُٹھایا، وہ خالد تھا، وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور صوفے پر میرے پاس بیٹھ گیا، اور بھرائی ہوئی متفکر آواز میں کہنے لگا:

"میں تمہارے ہی پاس آیا ہوں، کیونکہ تم سے زیادہ اور کسی کو میرا خیال نہیں ہے ——— (آنسوؤں کو پی کر) تمہیں معلوم ہے کہ میرا عزیز ترین دوست مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے (کچھ رُک کر) اب مجھے تنہائی شاق ہے ...... تم میں سے کوئی شخص بھی احمد سے پوری طرح واقف نہ تھا، ایک بھی نہیں" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

"تم اُس کی جگہ لینا چاہتے ہو؟" یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ عہد و پیمان کو مضبوط کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں دے دیا، میں کود کر اُس کے سینہ سے چمٹ گیا، میری حقیقی مسرت نشۂ دیوانہ بنا رہی تھی، میرے الفاظ کا خزانہ خالی تھا، گلے میں میرا سانس گھٹ رہا تھا، خالد نے مجھ پر ایک غائر نظر ڈالی اور مسکرانے لگا، اس کے بعد ہم دونوں نے چائے پی، وہ برابر احمد کی وفا شعاری کے افسانے سناتا رہا، اُس زرد رُو کمزور لڑکے نے ایک مرتبہ سینہ سپر ہو کر خالد کی جان بچائی تھی۔ میں یہ قصہ سنتا تھا اور اپنی قسمت پر نازاں تھا، رات کے آٹھ بج گئے، خالد اُٹھ کھڑا ہوا کھڑکی کے پاس جا کر شیشوں کو کھٹ کھٹانے لگا۔ اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا، میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا: "خالد میں تمہارے بھروسے اور اعتماد کا یقیناً مستحق ہوں"۔ خالد نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا، "اگر یہ ہے تو ٹوپی اوڑھ لو اور میرے ساتھ چلو"۔

~~~~~~~~

ہم دونوں چل کھڑے ہوئے، ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور شہر کے باہر چل دیئے۔ شہر کے باہر پہنچ کر تانگہ کو رخصت
~~~~~~~~

کردیا گیا۔ہم دونوں ایک پگڈنڈی پر چلے جارہے تھے کہ کوئی پون میل جانے کے بعد خالد رُکا، رات کا تاریک سایہ اب ہر جگہ پڑرہا تھا، دائیں جانب ہلکے دھوئیں سے لبریز فضا میں کچھ ٹمٹماتے ہوئے چراغ نظر آرہے تھے، بائیں جانب ایک مختصر سے کھیت میں دو سفید گھوڑے چر رہے تھے، ہمارے سامنے دُور تک کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ تھا میں خاموشی کے ساتھ خالد کا تعاقب کررہا تھا، وہ یکایک رُکا، سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا کہ بس ہمیں یہیں آنا تھا، سامنے ایک چھوٹا سا تاریک مکان تھا جس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں میں سے دھندلی روشنی نکل رہی تھی۔خالد نے کہا" اس مکان میں ایک پنشن یافتہ فوجی رہتا ہے۔ اپنی بہن، اپنی لڑکی اور ایک ماما کے ساتھ اِس فوجی کی زندگی کا زیادہ تر افریقہ اور یورپ میں گذرا ہے، عجب اکھڑ مزاج کا آدمی ہے، میں تمہیں اپنا عزیز بتاؤں گا" تم اُس کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلنا شروع کردینا، تاش کے کھیل سے اُسے عشق ہے"

میں نے سرِتسلیم خم کیا خصوصاً یہ جتانے کے لئے کہ میں بھی احمد کی طرح اطاعت شعار بن سکتا ہوں لیکن میں تلاشِ حقیقت کے لئے شدت سے بے چین تھا ہم دونوں مکان میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ کھڑکی میں سے میں نے ایک نازک اندام لڑکی کو دیکھا۔ وہ غالباً ہماری ہی منتظر تھی، اور ہمیں دیکھتے ہی غائب ہوگئی، ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اندر کے کمرے میں پہنچے ایک پنجاہ سالہ شخص نے ہمارا خیر مقدم کیا، میں نے اُسے غور سے دیکھا، چہرہ ملول و غمگین، سر کے بال کھڑے کھڑے، تنگ پیشانی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی بڑی مونچھیں، موٹے موٹے ہونٹ،

"خالد! بہت مدت کے بعد آئے، کہاں رہے؟ بہت انتظار دکھایا، احمد کو نہیں لائے؟"

"احمد تو بیچارے مرگئے!"

"نہیں، مرگئے؟ یہ کون ہیں؟"

"میرے ایک عزیز ہیں، آپ سے ملنے آئے ہیں"

"بہت خوب، بہت خوب، تاش کھیلتے ہیں؟"

"بہت مزے سے"

"نہایت خوب، لو، ہم بھی بیٹھے جاتے ہیں، ذرا خیرن سے کہو کہ گول میز اور تاش کی گڈی لے آئے"

یہ کہہ کر میں اور وہ پنشن یافتہ فوجی دوسرے کمرے میں آگئے، جو پہلے سے زیادہ مختصر تھا" وہ صوفے پر بیٹھ کر تاش پھانٹنے لگا، برابر ہی کرسی پر ایک نہایت دبلی پتلی عورت عینک لگائے بیٹھی تھی، اُس عورت سے تعارف کراتے ہوئے

فوجی نے کہا۔ "یہ پہلا شخص انتقال کر گیا، خالد اُن کی بجائے انہیں لائے ہیں، دیکھیں یہ کیسا کھیلتے ہیں"۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا خالد غائب ہو چکا تھا تاش کا کھیل شروع ہوا، فوجی میری ذرا سی غلطی پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ مگر اس سے زیادہ افسوس کے قابل بات یہ تھی کہ اپنی بہن کی غلطی پر بھی اُس کے غصہ میں ذرا کمی واقع نہ ہوتی تھی، اخلاق کے اس مظاہرے کو دیکھ کر جی تو یہی چاہا کہ اس قعرِ مذلت سے بھاگ نکلوں، مگر خالد کی محبت کی طلائی زنجیر بے دست و پا کئے ہوئے تھی، ایک موقع پر اُس کی بہن فوجی کے توہین آمیز الفاظ کو ضبط نہ کر سکی اور اپنے سنگ دل بھائی سے کہنے لگی "تم انہیں اپنی بیوی کی موت کا باعث ہوئے، کیا اب مجھے بھی کھڑ کھڑ کے قبر میں اتارنا چاہتے ہو، تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، ہرگز نہیں"۔

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس مکالمہ کے دوران میں میری حالت کسی طرح قابلِ رشک نہ تھی، مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر خالد نے مجھے اِس مصیبت میں کس غرض سے پھنسایا ہے، میں تاش کھیلنے میں ماہر نہیں تھا، مگر اُس روز معمول سے زیادہ خراب کھیل رہا تھا، یہ کشمکش کوئی دو گھنٹہ تک جاری رہی، مگر اس دوران میں میری روح سمٹ کر ایک نقطہ میں منجمد ہو چکی تھی۔ آخری ربر کے ختم ہونے پر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، خالد موجود تھا، اُس کے قریب ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی، اور میری طرف دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی، "سکینہ! ذرا میرا حقہ لاؤ" فوجی نے کہا، لڑکی ہوا ہو گئی، وہ کچھ بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی، بہت پتلی دبلی، چہرہ زردی مائل، مگر میں نے آج تک نہ ایسی رسیلی آنکھیں دیکھیں اور نہ ایسے پیارے دلفریب بال دیکھے۔ ربر ختم ہوا، خدا خدا کر کے روپے دے کر میں نے اپنی جان چھڑائی، فوجی حقہ گڑگڑانے لگا۔ خالد نے سکینہ سے میرا تعارف کرایا، ہم دونوں چند منٹ تک بدحواس سے رہے، لیکن چند ہی منٹ میں خالد نے حسبِ معمول سب کو بشاش اور بے تکلف بنا دیا، اُس کی روح کی دلآویزی بہت تھوڑے عرصہ میں پورے ماحول میں سرایت کر جاتی تھی، کبڑی ماما نے آ کر میز پر دسترخوان بچھایا، ہم سب کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے،

خالد کے عضو عضو سے مسرت و انبساط کی شعاعیں نکل رہی تھیں، خوب بے تکلفی سے، وہ چٹ پٹی کہانیاں سنانے لگا، فوجی کے قہقہوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، میں سکینہ کو دیکھنے لگا، اُس کی نظریں خالد پر جمی ہوئی تھیں، میں فوراً تاڑ گیا کہ وہ اُس کی محبوبہ ہے، اور اُسے دل سے چاہتی بھی ہے، اُس کے لب خفیف سے جُدا تھے، اُس کا سر آگے کو جھکا ہوا تھا، اور اُس کے چہرہ پر مسرت کا ایک دلکش رنگ رقص کر رہا تھا، کبھی کبھی وہ آہیں بھرنے لگتی اور پھر خود بخود ہنسنے لگتی تھی، میں خالد کی خوش نصیبی پر مسرور تھا، مگر ساتھ ساتھ خدا پناہ میں رکھے اُس پر

رشک آمیز نگاہیں بھی ڈال رہا تھا،

کھانے کے بعد ہم دونوں رخصت ہوئے، سکینہ ہمیں رخصت کرنے دروازہ تک آئی، اور خالد سے کہنے لگی ——

"اب کب آؤ گے؟"

"دو تین دن میں"

"ضرور آنا"

"یقیناً"

(میری طرف اشارہ کرکے) "انہیں بھی اپنے ساتھ لانا"

"ضرور لاؤں گا"

"اچھا خدا حافظ"

راستہ میں مجھے یہ انوکھا قصہ معلوم ہوا ————

خالد سے اس فوجی کا اچانک چھ ماہ ہوئے تعارف ہوا تھا، بارش میں رات کے وقت خالد شہر کی جانب شکار سے واپس آرہا تھا، کہ شاہراہ کے قریب ہی اُسے گالیاں بکنے اور چلانے کی آوازیں سنائی دیں، اُس کے ہاتھ میں بندوق تھی، وہ اُس آواز پر چل کھڑا ہوا، تھوڑی ہی دُور ایک گڑھے میں ایک شخص اپنی مضروب ایڑی لئے ہوئے چلا رہا تھا، یہ وہی فوجی تھا جس سے ہم بخوبی واقف ہو چکے ہیں، بڑی دقت سے اُس نے اُسے اُٹھایا، اُس کے مکان تک لے گیا، اُسے اُس کی خوف زدہ بہن اور بیٹی کے سپرد کیا، اور خود ڈاکٹر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی جستجو کے بعد ڈاکٹر ملا، اُسے اپنے ساتھ لے کر فوجی کے مکان پر آیا، پھر شہر سے دوا لایا، اسی اثناء میں پو پھٹنے لگی، خالد بہت زیادہ تھک چکا تھا، اتنی ہمت نہ تھی کہ پھر شہر کی جانب واپس ہو، سکینہ سے اجازت لے کر صوفے پر لیٹ گیا، نیند کا غلبہ ہوا، صبح آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ گھر والوں سے اجازت مانگی، مگر انہوں نے چائے کے لئے اُسے ٹھہرا لیا۔ رات میں اُس نے دو مرتبہ سکینہ کو دیکھا تھا، مگر صبح کو دیکھنے سے سکینہ کی ہیئت نے اُس کے دل پر ایک عجب خوشگوار اثر پیدا کیا، سکینہ کی پھوپی نے خالد کی جانفشانی اور مہربانی کا شکریہ ادا کیا، مگر خود سکینہ خاموش رہی۔ چائے دانی میں سے خالد کی پیالی میں چائے ڈالتی رہی، پھر اُس نے بالائی کی پلیٹ اور شکردان اُس کی جانب بڑھا دیا، اسی اثناء میں فوجی بیدار ہوا اور چلانے لگا،

"کوئی ہے؟ سب مر گئے، حقہ لاؤ"

اُس کی بہن لپک کر اُس کی خواب گاہ میں گئی، وہ پھر چلّایا "ہاں پھر اُس ظالم کا کیا ہوا، اُس کم بخت کا نام تو بتاؤ، کیا وہ چلا گیا؟ ——"

خالد۔ "نہیں۔ جناب امیں موجود ہوں، کہئے آپ کا مزاج اب کیسا ہے؟"

"ہاں اب ذرا اچھا ہوں، ذرا یہاں کرم کیجئے"

خالد کمرے میں داخل ہُوا۔ فوجی نے اُس کو دیکھا، اور کہا،

"آپ کا شکریہ، آپ پھر کبھی ضرور آئیے اور مجھ سے ملئے، آپ کا کیا نام ہے؟"

"خالد"

"بہت خوب، آپ ضرور تشریف لائیے، اب آپ کو یہاں ٹھہرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے گھر پر آپ کی تلاش ہو رہی ہوگی"

خالد نے سلام کیا، اجازت چاہی، اور چل کھڑا ہُوا، اس کے بعد آنا جانا شروع ہوگیا، پھر جلد جلد اور بے تکلفی کی ملاقاتیں ہونے لگیں، موسم گرما آگیا —— خالد نکر پہن کر ہاتھ میں بندوق لے لیتا، اور چل کھڑا ہوتا، لوگ یہ خیال کرتے کہ وہ شکار کو گیا ہے، حالانکہ وہ سیدھا فوجی کے مکان پر پہنچتا، اور شام تک گپیں ہانکتا رہتا۔

سکینہ کے والد نے فوج میں پچیس سال ملازمت کی تھی، اُن کی ملازمت کا زیادہ حصّہ جنوبی افریقہ، مصر، سوڈان دردانیال اور فلینڈرس میں صرف ہُوا تھا، سالہا سال آبادی سے دُور فوجی کیمپ میں مقیم رہے۔ اور انگریزی افسروں کی نیم سرکاری اور نیم سوشل صحبت میں وقت گذارتے رہے، رفتہ رفتہ اُن کی عادتیں بھی مغربی ہوگئیں، پنشن لینے کے بعد جب وطن میں آئے تو ہزارہا دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ گرد دھن کے پکّے تھے، شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر اپنا مکان مشرقی عزیزوں اور دوستوں سے علیحدہ بنا لیا، اُس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا چمن تیار کرایا، اُسی میں رہتے تھے۔ وطن کے احباب اور اعزا سے بہت نالاں تھے، نہ وہ کبھی کسی کے پاس جاتے نہ اُن کے پاس کوئی آتا تھا لکھنا پڑھنا کچھ یوں ہی جانتے تھے، مگر ظاہری بھدے پن اور بے تکی باتوں کے باوجود کافی ہوش مند اور چالاک تھے، اور ضرورت کے وقت ریشہ دوانی تک کر گذرتے تھے، اُن میں فطرت نے خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، بالطبع بست مندی اور خود پسند واقع ہوئے تھے، معمولاً کج خلق اور نامہربان معلوم ہوتے تھے، بچوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر ضد کرنا اُن کا شیوہ تھا، اُن کے خیالات نے ایک عجیب تمسخر آمیز صورت اختیار کرلی تھی، ایک مرتبہ ہم سب بیٹھے ہوئے اُن سے شادی پر گفتگو کرنے

لگے، فرمایا یہ شادی؟ اُسے لعنت بھیجو، دیکھو میں کسی کو اپنی لڑکی سے شادی نہ کرنے دوں گا - وہ کیا کرے گا - وہی نا جو میں نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا، یعنی اُسے اِدھر اُدھر لیئے پھرے گا - علاوہ ازیں پھر میں کس کے ساتھ رہوں گا۔ لاحول ولاقوۃ"

امید ہے کہ میں نے کافی وضاحت کے ساتھ حاضرین سے سکینہ کے والد کو روشناس کر دیا ہے، خالد کا وہاں جانا اور اس قدر پابندی سے جانا ظاہر ہے کہ محض سکینہ کی وجہ سے تھا، مجھ سے خود خالد نے پہلے ہی روز یہ کہہ دیا تھا۔

"میں سکینہ سے محبت کرتا ہوں، کیسی پیاری لڑکی ہے، اُس نے تمہیں بھی پسند کیا ہے"

میں شاید یہ عرض کرنا بھول گیا ہوں کہ اس وقت تک میں عورتوں کی صحبت سے بہت خائف تھا اور اسی لئے ان سے اجتناب کیا کرتا تھا - سکینہ پہلی لڑکی تھی جس سے مجھے ضرورتاً ہمکلام ہونا پڑا - ویسے تو سکینہ کوئی غیر معمولی لڑکی نہ تھی، مگر مقدس ہندوستان کی پوری آبادی ایسی شریف النفس لڑکیاں بہت کم پیدا کرتی ہے، آپ ضرور دریافت کرنا چاہتے ہونگے کہ یہ کیسے؟ میں اس کا مختصر سا جواب دیئے دیتا ہوں کہ میں نے اُس کی کسی حرکت میں بناوٹ، تصنع اور ریاکاری کا شائبہ تک نہ دیکھا - مجھے اُس کا تبسم زیرلبی مدت تک یاد رہے گا - اُس کی دل میں اُتر جانے والی باریک آواز، اُس کے لطیف و نازک قہقہے، اُس کی متوجہ نگاہیں میں کبھی نہ بھولوں گا - اُس کے چہرہ سے بمشکل کسی توقع کا اندازہ ہو سکتا تھا، مگر یہ ناممکن تھا کہ آپ اُسے دیکھ کر اُس کی تعریف نہ کریں۔ اس طرح جیسے ایک گھنے جنگل میں کسی پوشیدہ شاخ پر کوئی پرند چہچہاتا ہے، اور اُس کے لحن پر سننے والا عش عش کرتا ہے۔

حضرات! مجھے یقین ہے کہ آپ چونکہ مہذب اور تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے دورانِ حیات میں . . . . . نہیں . . . . بلکہ عالمِ شباب میں آپ بھی کسی پر فریفتہ ہوتے ہونگے۔ اور آپ کو بخوبی علم ہوگا کہ محبت کس طرح پیدا ہوتی ہے اور بڑھتی ہے، بدیں وجہ میں اس بحث کو نظر انداز کرتا ہوں اور اُس تفصیل سے آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا کہ میرے دل میں محبت کیسے پیدا ہوئی اور منزل بمنزل کیسے بڑھی مختصر یہ کہ میں سکینہ کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا، اور دردِ فراق کی لذتوں اور ملاقات کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ سکینہ کے گھر ہم دونوں اکثر جایا کرتے، میں اُس کے باپ کے ساتھ تاش کھیلنے لگتا، اور اُس کہن سال فوجی کی بدمزاجیوں کا نشانہ بنتا۔ لیکن محبوب کی قربت بجائے خود ایک مسرت تھی، میں نے اُس اندیشے ہوئے جذبہ کو روکنے کی کبھی کوشش نہ کی، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ قبل اس کے کہ میں اس جذبہ کی صحیح نوعیت سے واقف ہوں، یہ طوفان میرے قبضۂ قدرت سے تجاوز کر گیا، میں نے خفیہ طور پر جذبات کی پرورش کی اور اغیار کی نگاہوں سے اُسے ہمیشہ بہت پوشیدہ رکھا۔ اس جذبۂ خاموش کے وقتی اُبھار اور ابال کو میں نے

ہمیشہ تفریحِ طبع کا ذریعہ سمجھا۔ نہ میری بھوک زائل ہوئی، اور نہ نیند، پھر بھی شبانہ روز میں سکینہ کے جذبات کے اُس تموج کا احساس کرتا رہتا تھا جو محبت کی ایک صحیح علامت ہے۔

حیات کی وہ کشاکش جس سے مجھے اکثر دوچار ہونا پڑا، ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔ میرے قلم میں وہ طاقت نہیں کہ میں اُن کا مرقع پیش کرسکوں، مثلاً ایک مرتبہ خالد اور سکینہ باغ سے برآمد ہوئے، سکینہ کا چہرہ محبت اور مسرت کی تابش سے جگمگا رہا تھا۔ اور اُس کے اعضا پر شگفتگی کے وہ تمام اثرات موجود تھے جو غیر معمولی انبساط اور خوش نصیبی کی حالت میں پائے جاتے ہیں۔ سکینہ مکمل طور پر خالد کی حیات میں پیوست ہوگئی تھی، حتیٰ کہ بے خبری کے عالم میں اُس کے حرکات و سکنات کا تتبع کرنے لگی تھی، اُس کی نگاہیں خالد کی نگاہیں تھیں اُس کا قہقہہ اور تبسم خالد کا قہقہہ و تبسم تھے، اب تک میری یاد میں وہ لمحات محفوظ ہیں جو اُس نے خالد کے پہلو میں گذارے تھے، اور سرشارِ محبت ہوکر اُٹھی تھی،

مگر خالد اب تک آزاد تھا، سکینہ کی عدم موجودگی میں خالد کو کبھی اُس کا خیال تک نہ آتا تھا، اب تک وہ ویسا ہی آزاد منش، بے خبر، ہنس مکھ نوجوان تھا، اُس کی زندگی کے کسی پہلو میں تبدیلی پیدا نہ ہوئی ——

وقت گذرتا گیا، وہ دونوں نہایت شاداں و فرحاں تھے، اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں اُن کی خوشیوں کے واقعات مفصل بیان کروں، آخر کار مجھے محسوس ہونے لگا کہ سکینہ کی طفلانہ سبک اندازی نے ایک اضطراب آمیز وقار کی صورت اختیار کرلی۔ مگر رفتہ رفتہ اُس بات کا خطرہ نظر آنے لگا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا یعنی خالد کے جذبات ختم ہونے لگے، اُس کے دل کی گہرائیوں میں سرد مہری آچلی، اس احساس نے مجھے مسرور بھی کیا اور مغموم بھی مگر مجھے خالد پر ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ اب اُن کی ملاقاتیں کم اور مختصر ہوتیں، سکینہ کی آنکھوں میں اکثر آنسو نظر آتے، شکوے زبان کے دفتر کھلتے، ملامت آمیز لہجہ سنائی دیتا، اور اکثر رونا دھونا بھی ہوتا، میں خالد سے اکثر کہتا "آج سکینہ کے گھر چلوگے؟" وہ سرد مہری سے مجھے دیکھ کر کہہ دیتا "نہیں آج تو ارادہ نہیں" میں ایک طویل عرصہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں احمد کا صحیح جانشین نہ ہوسکا، وہ مجھ سے کہیں زیادہ اطاعت شعار اور احمق تھا۔

ایک بات اور یاد آگئی، افسوس ہے کہ میں نے اب تک کیوں نہ کہی، اب تک میں نے آپ سے اپنے دوست ظفر کا تعارف نہ کرایا اُس کی عمر پچیس سال کی ہوگی، گذشتہ دس سال سے وہ علی گڈھ میں تعلیم پا رہا تھا، ظفر میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی ظاہری حسن نہ تھا، چہرہ لانبا، زرد زرد چھوٹی چھوٹی بادامی آنکھیں، ناک لمبی مگر آگے سے جھکی ہوئی، ہونٹ پتلے مگر ہموار، آواز بھی اکثر کانوں کو بھلی معلوم نہ ہوتی تھی۔ مگر اُس کے ساتھ ہی ذکی الطبع، تیز فہم، ہوشمند

اور شیریں گفتار تھا، اکثر ایسی برجستہ چھوٹی سی مثل کہہ کر ہمیں خاموش کر دیتا، کہ ہم اس پہ استعجاب کی نظریں ڈالنے لگتے ظفر ایسے طالب علموں کے لئے موت کا فرشتہ تھا جو ٹھوس مضامین کے مطالعہ سے بھاگتے ہیں، اور چند بے معنی اور لغو غزلیں کہہ کر سامعین سے داد لینا چاہتے ہیں، مگر یہ تعجب ہے کہ خود ظفر کو ہم نے کبھی پڑھتے نہ دیکھا تھا، ظفر اُس محبت کا مذاق اُڑاتا تھا جو مجھے خالد سے تھی، پہلی مرتبہ میں نے اُس کے طنزیہ فقرات سنے، اور کہہ دیا کہ جاؤ میرا سر نہ کھاؤ، دوسری مرتبہ میرا غصہ کم ہؤا، میں نے متانت سے اُسے سمجھانا چاہا کہ یہ محبت اور دوستی تمہارے دائرۂ ادراک سے باہر ہے اس کے بعد وہ کچھ سمجھ گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہم دونوں گہرے دوست ہو گئے ـــــــ

پندرہ دن سے میں نے سکینہ کو نہ دیکھا تھا۔ دل مضطرب و بے چین تھا، غرور، نخوت، محبت، آنے والے واقعات کا ایک دھندلا سا پرتو، متعدد اور مختلف جذبات دل اور دماغ میں طوفان برپا کئے ہوئے تھے، ایک ڈوبتے ہوئے دل کو اپنے پہلو میں لے کر میں چل دیا، مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں اُس کے مکان تک کیسے پہنچا، ہاں اس قدر ضرور یاد ہے کہ راستہ میں دو تین جگہ بیٹھ بیٹھ گیا، تھکن کی وجہ سے نہیں بلکہ جذبات کی فراوانی کی وجہ سے، مجھے دُور سے دیکھتے ہی سکینہ میرا خیر مقدم کرنے کے لئے لپکی، اور بے اختیار ہو کر پوچھنے لگی۔

"خالد کہاں ہیں"

"وہ تو نہیں آئے"

"نہیں آئے! کیوں!"

"وہ ایک کام کی وجہ سے رُک گئے"

مجھے اس کا مطلق علم نہ ہؤا کہ میں نے کیا کہا، مجھے آنکھیں اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی، سکینہ میرے سامنے خاموش اور ساکت کھڑی تھی، میں نے ہمت کر کے اُسے دیکھا، اُس نے منہ پھیر لیا، دو بڑے بڑے آنسو اُس کے رخساروں پہ حرکت کر رہے تھے، اُس کے چہرہ سے ایک فوری اور گہری روحانی کوفت کا پتہ چلتا تھا، شرم، رنج، اور بھرتے کی نمایاں کش مکش اس قدر شدت سے اُس کے ہاتھوں کی حرکات سے ظاہر ہوتی تھی کہ میرے دل میں درد پیدا ہو گیا، میں ذرا آگے کو جھکا، وہ چونکی اور نظروں سے غائب ہو گئی۔

ملاقات کے کمرے میں سکینہ کے والد نے میرا استقبال ان الفاظ سے کیا،

"دوست! آج اکیلے کیسے آئے؟"

"بے شک، میں تنہا آیا ہوں"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر فوجی بہادر ہنستا ہوا دوسرے کمرے میں جا چکا تھا۔

ایسی حالت میں آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ میری پوزیشن کیسی تکلیف دہ تھی، مگر کیا ہو سکتا تھا اس خندۂ بیہم کی علت، غایت؟ سکینہ کی پھوپی اسی دوران میں ایک پھٹی پرانی کتاب ہاتھ میں لئے آموجود ہوئی، میں اُس سے باتیں کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد سکینہ بھی آگئی، بہت نڈھال اور غمگین، پنشن یافتہ فوجی نے خالد پر فقرے چست کرنے شروع کئے، سکینہ جلدی سے اُٹھ کر چل دی، چائے آگئی، میں نے اُن کے ساتھ چائے پی اور رخصت مانگی، فوجی افسر نے مصافحہ کیا اور کہا:-

"مہربانِ من پھر آپ سے کب ملنا ہوگا؟"

میں ہوں ہاں کرکے واپس ہوا، میں درحقیقت اُس سے بے حد خائف تھا۔

سیڑھیوں پر ایک سرد ہاتھ نے میرے شانے کو مس کیا، میں نے مڑ کر دیکھا، وہ سکینہ تھی، کہنے لگی۔

"مجھے تم سے کچھ باتیں کہنی ہیں، کل ذرا اول وقت آجانا، سیدھے باغ میں، ابا جان کھانے کے بعد سو جاتے ہیں"

میں نے اُس کا ہاتھ دبایا اور چل کھڑا ہوا۔

دوسرے دن سہ پہر کو تین بجے میں فوجی افسر کے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا، صبح کے وقت میں کوشش کرنے پر بھی خالد سے نہ مل سکا، موسم خوشگوار تھا، نازک نازک زرد گھاس موسم خزاں کا پتہ دے رہی تھی، چست و چالاک گلہری شاخوں کے گچھوں میں کبھی روپوش ہو جاتی اور کبھی پھر رقص کرنے لگتی تھی، ایک خرگوش باغ کے ایک پوشیدہ سے گوشہ میں جست لگا رہا تھا۔ فوجی افسر کے گھوڑے کا بچھیرا سایہ میں کھڑا ادھر اُدھر بے معنی نگاہیں ڈال رہا تھا، میں نے نارنگی کے ایک درخت کے نیچے سکینہ کو ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے پایا، اُس کا لباس سیاہ اور کچھ غیر مرتب سا تھا، اُس کی آنکھیں اور اُس کے بالوں کا انداز اُس کی سوزشِ پنہاں کا پتہ دے رہے تھے۔ میں بھی اُس کے پاس بیٹھ گیا، ہم دونوں خاموش تھے، بہت دیر تک وہ نارنگی کی ایک چھوٹی سی ٹہنی کو توڑتی رہی، پھر اُس نے اپنا سر جھکا دیا، اُس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

"خالد"

میں نے اُس کی جنبشِ لب سے فوراً تاڑ لیا کہ وہ عنقریب رویا چاہتی ہے، میں نے اُس کی تشفی کی اور خالد کی محبت کا یقین دلایا، وہ میری تقریر سنتی رہی اور غمگین انداز سے اپنا سر ہلاتی رہی آہستہ لہجہ میں کچھ کہا اور پھر خاموش ہوگئی، وہ لمحے جن کا مجھے سب سے زیادہ خوف تھا یوں آسانی سے ختم ہوگئے، پھر اُس نے جستہ جستہ خالد کے متعلق باتیں کیں۔

"مجھے معلوم ہے کہ اب اُسے مجھ سے محبت نہیں ...... خیر اُس کا خدا حافظ و ناصر ہو۔
"سمجھ میں نہیں آتا کہ بغیر اُس کے میری زندگی کیسے گذرے گی، ساری ساری رات روتی رہتی ہوں۔
"...... یا اللہ! اب کیا کروں ...... تو ہی مددگار ہے"
اُس کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں،
"میں اُسے ایسا اچھا سمجھتی تھی، مگر ..... وہ ...."
سکینہ نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں، اور اطمینان سے پہلو بدل کر بیٹھ گئی، پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگی،
"معلوم ہوتا ہے کہ خالد ابھی ابھی یہاں سے گئے ہیں"

مَیں اُس کے بیانات کو خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ میری روح اک جاں گسل سعادتِ بشری سے مملو ہو رہی تھی، مَیں اپنی نگاہیں اُن نمناک آنکھوں، اُن لانبی ابروؤں اور اُن لرزتے ہوئے لبوں سے نہ ہٹا سکا، کیا اس موقع پر مجھے اجازت دو گے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے جذبات کے اجزا آپ کے ملاحظہ کے واسطے پیش کروں، میں سخت ملول تھا کہ سکینہ میرے علاوہ کسی اور پر جان دیتی ہے، اور کوئی اَور اُس کے دردِ دل کا موجب ہے، مگر میں خوش تھا کہ وہ اپنے دلی جذبات مجھ سے بے تکلفی سے کہہ رہی تھی مَیں مسرور تھا کہ میں نے اُس سے ہمدردی کرکے اُسے شکر گذار ہونے کا موقع دیا، مَیں دل میں عہد کر رہا تھا کہ میں خالد اور سکینہ کو پھر ایک مرتبہ ہمکنار کرا دوں گا۔ میری یہ فیاضی کس قدر لائقِ تحسین تھی، کبھی یہ بھی خیال گذرتا تھا کہ شاید میرا ایثار اُسکے دل میں میرے لئے کچھ گنجائش پیدا کردے۔

گھنٹہ گھڑی سے پانچ بجنے کی آواز آئی، شام کی تاریکی در و دیوار پر تیزی سے چھا رہی تھی، سکینہ جلد اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرے ہاتھ میں ایک خط دے کر چل دی۔ میں نے خالد کے لانے کا وعدہ کیا، اور ایک عاشق کی طرح کھڑکی میں سے ہوتا ہوا باغ کے باہر آگیا۔ لفافہ پر یہ الفاظ تحریر تھے، "مسٹر محمد خالد کی خدمت میں"

دوسرے روز علی الصباح میں خالد کے مکان پر پہنچا، میں صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ گو میرا ارادہ نہ صرف بے لوث تھا بلکہ ایک حد تک ایثار سے بھی خالی نہ تھا لیکن خالد کا سامنا کرنے میں مجھے ایک قسم کا تکلف محسوس ہونے لگا، میں کچھ سہما سہما تھا، دل دھڑکنے لگا! اور رگوں میں خون کی گردش نے غیر معمولی سرعت اختیار کرلی، میں ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ آخر کار خالد کا دروازہ نظر پڑا، میں اُس کے کمرے میں داخل ہوا، یونیورسٹی کا ایک طالب علم جس کی عمر کوئی بیس برس کی تھی اور جس سے میں زیادہ واقف نہ تھا اُس کے پاس بیٹھا ہوا اپنی ایک نظم سنا رہا تھا، نظم میں اُس نے اُس عورت کے جذبات قلمبند کرنے کی کوشش کی تھی جو مرد کی بے وفائی کا شکار ہوجاتی ہے، اُس مرد

کاشتکار جس نے مدتوں اُس کے سامنے محبت اور عقیدت کے راگ گائے ہوں نظم بلند پایہ نہ تھی، اٹھارہ اور پچیس سال کی درمیانی عمر میں کالج کے ہزارہا طلبا محبت کے افسانے، الفت کے خطوط، اور عشقیہ نظمیں لکھتے ہیں اور دوستوں کو سناتے پھرتے ہیں، دنیا میں اس سے زیادہ جلد فنا ہونے والا اور کوئی لٹریچر نہیں، آخر کار نظم ختم ہوئی، طالب علم کو استحقاق سے زیادہ داد ملی، اور تھوڑی دیر بعد پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے وہ چل دیا۔ اب ہم دونوں تنہا تھے، میں نے دل مضبوط کیا اور بغیر رسمی الفاظ کے وہ خط خالد کو دے دیا۔ خالد نے اول تو سرے اوپر تعجب کی نگاہیں ڈالیں، پھر لفافہ چاک کر کے خط کا مضمون پڑھا، کچھ مسکرایا اور کہنے لگا،

"تم آج سکینہ سے مل آئے؟"

"ہاں میں وہاں کل شام تنہا گیا تھا"

"خوب"

"تمہیں اُس کا مطلق کچھ خیال نہیں، کاش تم اُس کی اشک آلود آنکھیں دیکھتے!"

میں نے اپنی پوری فصاحت صرف کرنے کی کوشش کی اور سکینہ کی حالتِ زار کا صحیح مرقع خالد کے سامنے پیش کیا، مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا سگار پیتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"تم نارنگی کے درخت کے نیچے اُس کے پاس بیٹھے .... خوب .... گذشتہ مئی میں اُسی جگہ میں بھی اُس کے ساتھ اُسی بنچ پر بیٹھا کرتا تھا .... باغ پر جوششِ بہار تھا۔ درخت کی سبز سبز چمکدار پتیاں ہم پر گرتی رہتی تھیں اور میں اپنے ہاتھ میں سکینہ کا ہاتھ لئے ہوتا تھا عجب مسرت کا زمانہ تھا .... اب پتیاں زرد پڑگئی ہیں اور نارنگیاں بھی ترش ہوگئی ہیں"

یہ تقریر سُن کر مجھے غصہ آگیا، خالد کی سرد مہری اور ظلم آرائی پر میں اُسے ملامت کرنے لگا، آخر اُس لڑکی سے یوں یکایک دست بردار ہو جانے کا تمہیں کیا حق حاصل ہے، بالخصوص ایسی حالت میں جب تم نے اُس کے دل میں شمع محبت روشن کی، اور اُسے اپنا شیدائی بنا لیا" میں نے خالد کی منت سماجت کی اور اُسے ترغیب دی کہ وہ کم از کم آخری مرتبہ پھر سکینہ سے مل آئے، خالد خاموشی سے میری تقریر سنتا رہا،

خالد "یہ صحیح ہے کہ دوست کی حیثیت سے تمہیں میرے افعال پر نکتہ چینی کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن بہتر ہو کہ اس سے پیشتر میرا جواب سن لو" یہ کہہ کر وہ کچھ رکا اور مسکرانے لگا۔

"سکینہ ایک بہترین لڑکی ہے" اُس نے کہا "اُس نے میرے ساتھ کوئی بھی برائی نہیں کی، اس کے برخلاف میں

اس کا بے حد مرہونِ منت ہوں، اُس کی نوازشوں کو میں کبھی نہ بھولوں گا، مگر اب میں نے اُس کے پاس جانا، اور اُس کی پرواکرنا ترک کر دیا ہے، اُس کی ایک معمولی سی وجہ ہے، بہت معمولی سی"

"وہ کیا وجہ ہے" میں نے سوال کیا۔

"خدا جانے کیا . . . . . . جب تک میں نے اُس سے محبت کی میں ہمہ تن اُس کا تھا، میں نے مستقبل پر کبھی غور نہ کیا، میری ہر چیز کی حتیٰ کہ میری حیات تک کی وہ حقدار اور مالک تھی، . . . . . مگر اب میرا یہ جذبہ ختم ہو گیا ہے، شاید تم مجھے لغو خیال کرو گے کہ میں محبت کے جذبات سے بچوں کی طرح کھیلتا رہا۔ مگر کیوں؟ اُس پر ترس کھا کر؟ اگر وہ ایک معقول لڑکی ہے تو اب اُسے تمہارے ترس کھانے کی پروا نہ ہوگی، اور اگر تمہاری ہمدردی سے وہ مطمئن ہو جاتی ہے تو مجھے اُس کی پروا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے . . . . . . "

خالد کے ان ظالم اور بے رحم الفاظ نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی، بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ اُس ہستی کے متعلق تھے جس کا میں شیدائی تھا، رگوں میں میرا خون کھولنے لگا، خالد سے اگر میں مرعوب نہ ہوتا تو یقیناً میں اُس سے دست و گریباں ہو جاتا، گو میرے دلی جذبات میرے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے، مگر خالد نے اُن کی مطلق پروا نہ کی، ٹوپی سر پر رکھ کر وہ چلنے لگا، میں نے دریافت کیا،

"کہاں جاتے ہو"

"سیر کرنے، اُس طالب علم کی نظم نے اور تمہاری بکواس نے دردِ سر پیدا کر دیا ہے"

"تم خفا ہو گئے؟"

"بالکل نہیں" مسکراتے اور مصافحہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"اچھا، سکینہ سے کیا کہہ دوں؟"

"رخصتی سلام کہہ دینا" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا، میں نے زینہ پر اُسے پھر پکڑ لیا۔

"کیا وہ بہت پریشان ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"بہت، نہایت"

"بیچاری کی تسلی کرتے رہنا، اب تو تم اُس کے چاہنے والے ہو"

"ہاں، مجھے اُس سے اُنس ضرور ہے"

"جی، اُنس کس جانور کا نام ہے، عشق" اُس نے مجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ہم دونوں جدا ہو گئے، میں مکان

پھر واپس آیا، مگر مجھے بخار چڑھا ہوا تھا،

"میں نے اپنا فرض انجام دیا" میں نے اپنے دل میں کہا۔ "خود غرضی کو پس پشت ڈالا، خالد کو ترغیب دی کہ وہ سکینہ کے پاس پھر واپس جائے، اب میں حق پر ہوں"۔

خالد کے بے پروایانہ انداز نے مجھے مجروح کر دیا، اُس نے مجھ پر رشک آمیز نگاہیں ہی نہ ڈالیں، بلکہ مجھے ہدایت کی کہ میں اُس کی تسلی کرتا رہوں ...... کیا سکینہ کوئی معمولی لڑکی ہے، کیا وہ ہمدردی کی بھی مستحق نہیں، مگر اس سے کیا حاصل؟ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی .... خالد سے ناامید ہو کر بھی اُس کا دل نہ پسیجا ...... مگر ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد ...... میری وفا شعاری اس کے دل پر اثر کر جائے، اس وقت مجھے اپنے حقوق پیش نہیں کرنے چاہئیں، میں سراسر اُسی کا بندۂ بے دام بن جاؤں گا، کیا پھر بھی سکینہ مجھ سے محبت نہ کرے گی؟

یہ خیالات تھے جن میں میں اپنے پروفیسر کے مکان پر ۱۹۰۳ء کے زمانہ میں غلطان و پیچاں رہتا تھا کبھی رونے لگتا، کبھی غشی کی حالت طاری ہو جاتی، موسم شدت سے تکلیف دہ تھا، علی گڈھ کی جہنم نشان گرمی سے کون واقف نہیں ہفتہ میں چھ دن شام کے وقت وحشتناک ہوا کے بجائے آندھی، دن بھر لو کی روح فرسا شدت، خدا کی پناہ! صبح ساڑھے سات بجے سے آٹھ نو بجے رات تک گرمی اور لو سے کہیں بھی عافیت نہ ملتی تھی،

سامعین میں سے ایک نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود اپنی داستان محبت سنانا چاہتے ہیں، جی نہیں، آپ تو صرف حیرت انگیز خالد کا ذکر کیجئے"

"معافی چاہتا ہوں، بڑی غلطی ہوئی، دل سے مجبور تھا ...... بڑی غلطی ......"

ایک ہفتہ کے بعد میں پھر سکینہ کے مکان پر پہنچا۔ ملاقات کے کمرے میں گھر کے سارے ارکان موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر سکینہ سپید پڑ گئی۔ غالباً میرے چہرے سے حزن و ملال کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد میں سکینہ سے تنہائی میں بات چیت کر سکا، سکینہ نے کہا۔

"آپ تنہا ہیں"

"بالکل تنہا .... اور شاید ایک مدت کے لئے"

"آپ نے میرا خط دے دیا تھا؟"

"اُسی دن"

"خوب" وہ سانس لینے کے لئے رُکی، میں اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا، میرے دل میں حاسدانہ

سرت کا غلبہ تھا، میں نے کہا، "خالد سے اب توقع رکھنا عبث ہے!"
سکینہ نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے دل پر رکھا، سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا، کچھ لڑکھڑائی اور کمرے سے غائب ہوگئی،
میں اور دو گھنٹے وہاں موجود رہا، پھر واپس آگیا، مگر نہایت منفعل اور بدحواس تھا، سکینہ سے محجوب تھا، اور خود اپنی
ذات سے شرمندہ، کہتے ہیں کہ ناقص عضو کو جلد سے جلد کاٹ ڈالنا چاہیئے، لیکن اس غریب لڑکی کے دل پر مجھے کیا
اختیار تھا۔ بہت دیر تک بستر پر لیٹا ہوا کروٹیں بدلتا رہا، آخر کار نیند آ ہی گئی،

اس کے بعد میں برابر خالد سے ملتا رہا، اس کی زبان پر پھر کبھی سکینہ کا نام نہ آیا، سکینہ سے بھی مجھے اکثر ملنے
کا موقع ملا، رفتہ رفتہ اس کو مجھ سے بہت گرویدگی ہوگئی، مگر اس قسم کی گرویدگی جس میں محبت کا شائبہ تک نہیں
ہوتا، اس نے میری ہمدردی کی دل سے قدر کی، مجھ سے گھنٹوں رازِ دل کہتی تھی، اور خالد کا ذکر کرتی تھی، اب تک
ان تمام مراحل کے بعد بھی خالد اس کی رگ رگ میں پیوست تھا، میں نے بارہا اس کے نسوانی غرور کو بیدار کرنا چاہا،
لیکن وہ یا تو خاموش ہو جاتی یا پھر خالد کے افسانے سنانے لگتی مجھے اس زمانہ میں اس کا خیال بھی نہ تھا کہ وہ رنج
والم جس میں گویائی کا مادہ بڑھ جاتا ہے خاموش کر دینے والے غم سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ میرے لئے نہایت
کرب اور بے چینی کا زمانہ تھا، رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں خالد کا جانشین نہیں ہو سکتا، اور نہ سکینہ کا
زریں ماضی از سرِ نو پیدا کر سکتا ہوں، اس دوران میں وہ بہت دبلی ہو گئی تھی، میری ناکام کوششیں چار سال
تک جاری رہیں، پورے چار سال تک، اب تک سکینہ اسی طرح ملول و غمگین رہتی ہے، اور اس کی زبان پر اب
تک خالد کی محبت کے افسانے جاری ہیں +

عبدالشکور بریلوی

پتیاں

سچے حسن سے سچی محبت پیدا ہوتی ہے۔

دنیا وہ نہیں جسے ہم دیکھیں۔ دنیا وہ ہے جسے ہم تصور کریں۔

دیکھو کہ تمہیں نظر آئے۔ ڈھونڈو کہ تم پالو۔ دوڑو کہ تم پہنچ جاؤ۔

باغبان

چاند سے جھڑپ

ٹھنڈے ٹھنڈے جائے چاند جلنوں کو نہ جلائے چاند
پہلو میں وہ چاند نہیں کس سے دیکھا جائے چاند
میری طبیعت بھی خوش ہو مجھ کو کیا خوش آئے چاند
مجھ کو لبھائے جب جانوں دنیا بھر کو لبھائے چاند
مجھ کو رجھائے جب مانوں عالم بھر کو رجھائے چاند
سب کو بھائے، مجھ کو کیا مجھ کو بھی تو بھائے چاند
میرے سامنے آ آ کر میرا منہ نہ چڑائے چاند
مجھ کو تنہا پا پا کر میرا جی نہ دُکھائے چاند
اس کا نتیجہ کیا ہوگا غور بھی تو فرمائے چاند

ٹیڑھی چالیں ٹھیک نہیں ان سے باز آ جائے چاند
سیدھی طرح اک کام کرے اُلٹے پاؤں جائے چاند
جس سے مرا گھر روشن تھا اُس کو ڈھونڈ کے لائے چاند
جس سے یہ آنکھیں بینا تھیں اُس کا جلوہ دکھائے چاند
جس سے مل کر چین ملے اُس کو لا کے ملائے چاند
جیسے کہ خود نُور افشاں ہے اپنے رخ کو لگائے چاند
یوں ہی میرے گھر کو بھی بقعۂ نور بنائے چاند
واہ وہ روشن ساعت جب گھر کا گھر بن جائے چاند

اور جو اُس کو لا نہ سکے مجھ کو منہ نہ دکھائے چاند

میرا گھر محتاج نہیں میرے گھر سے جائے چاند
مجھ سے ضدوں کی لے لیکر باہم ضد نہ بڑھائے چاند
مجھ کو کچو کے دے دے کر پیہم دل نہ دکھائے چاند
حد سے زیادہ دق کر کے غصّہ تو نہ دلائے چاند
میں بھی آپے میں نہ رہوں اتنا تو نہ ستائے چاند
میں بھی تحمل کھو بیٹھوں ایسا قہر نہ ڈھائے چاند
اب بھی فسادوں پر نہ تُلے اب بھی شر نہ اٹھائے چاند
اب بھی عقل کے ناخن لے اب بھی ہوش میں آئے چاند
ورنہ میرے منہ آ کر شاید منہ کی کھائے چاند

لیکن اب میں کیوں چُوکوں دکھ پائے تو پائے چاند
کیوں نہ اک ایسی چٹکی لوں جس سے تڑپ ہی جائے چاند
مجھ پہ تو چوٹیں کر لیں اب اپنی چوٹ بچائے چاند
سورج سے منو لے لے کر اپنا نور بڑھائے چاند
نظروں کو جُل دے دے کے اپنا عیب چھپائے چاند
مانگے تانگے جوبن پر غرّہ کرے، اترائے چاند
ظلم ہے اک تاریک کرہ اپنے کو کہلائے چاند
قہر ہے، صرف اک تودۂ خاک اپنے کو منوائے چاند
آزاد اب تو سامنے آئے
اب تو آنکھ ملائے چاند

حکیم آزاد انصاری

جھوٹ

"تم جھوٹ بولتی ہو! میں جانتا ہوں تم جھوٹ بولتی ہو"!

"تم نے شور کیوں مچا رکھا ہے؟ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟"

یہ اُس نے ایک اور جھوٹ بولا، کیونکہ میں شور نہیں مچا رہا تھا۔ میں نہایت آہستگی کے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی نرمی اور آہستگی سے باتیں کر رہا تھا جب یہ زہر آلود لفظ "جھوٹ" سانپ کی طرح پھنکارتا ہُوا نمودار ہُوا۔

اُس نے کہا "مجھے تم سے محبت ہے اور تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے۔ کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آتا؟" اور اُس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملا دیئے لیکن جونہی میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گلے سے لگانا چاہا وہ مجھے چھوڑ کر جا چکی تھی تاریک برآمدے کو طے کر کے وہ کمرے میں داخل ہوئی جہاں ایک مسرور محفل برخاست ہو رہی تھی۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ میں یہاں کیونکر آیا تھا؟ اُس نے مجھ سے اس جگہ آنے کو کہہ رکھا تھا اور اسی لیے میں یہاں موجود تھا۔ میں تمام رات لوگوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میری طرف کوئی نہ آیا نہ مجھے کسی نے مخاطب کیا۔ میں سب کے لیے اجنبی تھا اور ایک کونے میں سازندوں کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ پیتل کے ایک بہت بڑے باجے کا منہ سیدھا میری طرف تھا۔ اور کوئی اُس باجے میں چھپ کر مجھ پر ٹھٹھا اُڑا رہا تھا اور بار بار ایک کرخت اور ہچکہ آمیز قہقہے کے ساتھ ہنستا تھا۔ "ہو! ہو! ہو!"

وقتاً فوقتاً ایک سفید اور خوشبو سے مہکا ہُوا بادل میرے قریب آ کر چلا جاتا تھا۔ یہ وہ تھی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس طرح دوسروں کی نظریں بچا کر مجھ سے ہم آغوش ہوتی تھی لیکن ایک اُڑتے ہوئے مختصر لمحے کے لیے اُس کا کندھا میرے کندھے سے آ کر چھو جاتا اور اسی اُڑتے ہوئے مختصر لمحے کے لیے میں اپنی آنکھیں نیچی کر کے اُس کی سفید نورانی گردن کو دیکھ لیتا تھا۔ جب میں نظریں اوپر اُٹھاتا تو مجھے ایک ایسی سفید سنجیدہ اور پُر صداقت یک رخی تصویر نظر آتی کہ اُس پر ایک مغموم و دلگیر فرشتے کا دھوکا ہوتا۔ میں اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا جو بڑی بڑی روشنی کے لیے حریص، خوبصورت اور پُرسکون تھیں۔ اُن کی نیلاہٹ میں پتلیوں کی سیاہی چمکتی اور جب کبھی میں اُن میں جھانکتا وہ سیاہ ہو جاتیں اور اُن کی گہرائی اتھاہ معلوم ہونے لگتی شاید وہ لمحہ جس میں میں اُن کی طرف دیکھتا اس قدر مختصر ہوتا کہ میرے قلب کی حرکت کے وقفے بھی اُس سے طویل ہوں گے لیکن خوف اور درد و کرب سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ساری زندگی کھنچ کر اُس کی آنکھوں میں سما گئی ہے یہاں تک کہ میں اپنے آپ سے اجنبی ہو جاتا۔ خاموش تنہا، مُردے کی طرح۔ پھر وہ رقص کی ایک گردش کے ساتھ مجھے چھوڑ جاتی۔ میری زندگی

مجھ سے چھین کر اپنے ساتھ لے جاتی اور اپنے بلند قامت مغرور لیکن حسین و جمیل شریک کے ساتھ رقص کرنے لگتی۔ میں اُس شخص کی ہر چیز کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اُس کی جوتیوں کی طرز و وضع کا، اُس کے متناسب اعضا کا، اُس کے پُر پیچ و سرکش بالوں کی لسوں کا، مگر اُس کا بے پروایانہ انداز اُس کی کم نگہی مجھے زمین میں پیوست کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور مجھے خاک کی طرح باطل اور بے معنی بناتی ہوئی نظر آتی تھی۔

جب لوگوں نے شمعیں بجھانی شروع کیں تو میں اُس کے پاس گیا اور اُس سے کہا "اب جانے کا وقت ہے۔ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا؟"

اُس نے حیرت زدہ ہو کر جواب دیا "مگر میں تو اُس کے ساتھ جا رہی ہوں" اور اُس نے اُسی شخص کی طرف اشارہ کیا جو میری طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی اور اُس نے مجھے چوم لیا۔

"یہ سب جھوٹ ہے" میں نے آہستہ سے کہا

اُس نے جواب دیا "ہم کل ملیں گے۔ تم ضرور میرے ہاں آنا"

جب میں گھر کی طرف جا رہا تھا تو کہر سے بھری ہوئی زمردیں صبح کی شعاعیں اونچے اونچے مکانوں کی چھتوں پر پڑ رہی تھیں۔ سڑک پر صرف ہم دو شخص تھے۔ گاڑی والا اور میں۔ وہ تیز و تند ہوا سے اپنے چہرے کو بچانے کے لئے آگے کو جھک گیا اور اُس کے پیچھے میں نے اپنے چہرے کو آنکھوں تک ڈھانپ لیا۔ گاڑی والے کے دل میں اپنے خیالات تھے اور میرے دل میں اپنے، اُدھر مکانوں کی پختہ دیواروں کے پیچھے ہزاروں لوگ سوئے پڑے تھے اور اُن کے اپنے اپنے خواب اور اپنے اپنے خیالات تھے۔ میرے دل میں اُس کا خیال تھا اور اُس کے جھوٹ کا خیال تھا۔ میں نے موت کا خیال کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ دیواریں جو صبح کا نور جذب کر رہی ہیں مجھے ابھی سے مردہ تصور کر کے میری طرف دیکھ رہی ہیں شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی بے رخی اور سرد مہری سے کھڑی تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ گاڑی والے کے خیالات کیا تھے نہ مجھے اُن لوگوں کے خوابوں کا علم ہے جن کو دیواروں نے چھپا رکھا تھا۔ مگر وہ بھی تو میرے خیالات اور خواب نہ جانتے تھے۔

پس ہم بازار کی لمبی سیدھی سڑک پر سے گزرتے گئے۔ صبح مکانوں کی رنیع و بلند چھتوں پر طلوع ہو رہی تھی اور ہمارے چاروں طرف سکون برس رہا تھا۔ ایک خوشبو سے لدا ہوا بادل میرے قریب آیا اور کسی غیر مرئی ہستی نے سیدھا میرے کانوں میں قہقہہ لگایا "ہو! ہو! ہو!"

۲

اُس نے جھوٹ کہا تھا۔ وہ نہ آئی اور میں بے فائدہ اُس کا انتظار کرتا رہا۔ تیرہ فام آسمان سے ایک دھندلا منجمد مہرا سا

اُتر کر زمین پر مستولی ہوگیا اور میں نے نہ جانا کہ کب شفق شام میں تبدیل ہوئی اور کب شام سے رات ہوگئی۔ مجھے یہ تمام کا تمام عرصہ ایک طویل رات معلوم ہوتا تھا۔ میں انتہائے افسردگی میں برابر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے ہموار اور یکساں قدم اٹھاتا رہا۔ میں اس رفیع الشان مکان سے دور ہی دور رہا جس میں میری محبوبہ رہتی تھی۔ میں ڈیوڑھی کے اُس دروازے کے قریب بھی نہ گیا جس کی دہلیز پر سنہری چھت کا عکس پڑ رہا تھا، بلکہ میں بازار کی مقابل والی طرف اختیار کر کے اسی ایک چال سے پھرتا رہا — آگے اور پیچھے، آگے اور پیچھے۔ جب میں آگے بڑھتا تو میری آنکھیں اُس آب دار دروازے پر جم جاتیں اور جب میں واپس ہونے لگتا تو میں اکثر ٹھہر جاتا اور پیچھے مڑ کر دیکھتا، تب برف کی تیز تیز سوئیاں میرے چہرے پر گر گر کر اُسے چھلنی کر ڈالتیں اور وہ سوئیاں اتنی لمبی اتنی تیز اتنی ظالم ہوتیں کہ میرے سینے میں اتر جاتیں اور میرے دل کو میرے اس یاس آمیز انتظار پر پژمردگی اور غصے کے تیروں سے پاش پاش کر دیتیں۔ برفانی ہوا چیختی چلاتی ہوئی روشن شمال سے تاریک جنوب کو چل رہی تھی۔ وہ مکانوں کی برفانی چھتوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی نیچے اترتی تھی اور میرے چہرے پر برف کے چھوٹے چھوٹے تیز گالوں کے تھپیڑے لگاتی ہوئی سنسان کوچے کی ان شمعوں کے شیشوں سے جا کر ٹکراتی تھی جن میں تنہا زرد رو شعلہ سردی سے کانپ کانپ کر تند و تیز ہوا کے آگے جھک جھک جاتا تھا۔ اس بے کس و بے نوا شعلہ کو دیکھ کر میں بہت رنجیدہ ہوا۔ اُس کی زندگی بس رات کی رات تھی اور میں نے خیال کیا کہ اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کوچہ میں حیات کی ایک رمق بھی باقی نہ رہ جائے گی اور صرف برف کے گالے خالی فضا میں اُڑتے اُڑتے پھریں گے اور زرد رُو شعلہ اس تنہائی اور سردی میں کانپتا اور ٹھٹھرتا رہے گا۔

میں اُس کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آئی۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ تنہا شعلہ اور میں ایک ہی جیسے ہیں، سوائے اس کے کہ میرا فانوس اُس کی طرح خالی نہ تھا۔ کیونکہ کبھی کبھی کوئی انسان اُس مقام پر آ نکلتا تھا جسے میں اپنے قدموں سے ناپ رہا تھا، وہ چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے بڑھتے چلے آتے، میرے پاس سے گزر جاتے اور یکایک کسی خیالی تصویر کی طرح اُس سفید عظیم الشان عمارت کے کسی کونے کے پیچھے غائب ہو جاتے۔ پھر دوبارہ وہ اس کونے کی اوٹ سے نمودار ہوتے میرے قریب پہنچتے اور پھر آہستہ آہستہ کہر سے لدی ہوئی وسیع فضا میں جسے خاموشی سے گرنے والی برف نے پیدا کر رکھا تھا جذب ہو جاتے۔ لپٹے لپٹائے بے وضع و قطع اور خاموش، وہ ایک دوسرے سے اور مجھ سے ایسی مماثلت رکھتے تھے کہ ایسا ظاہر ہوتا جیسے بیسیوں آدمی میری ہی طرح، اِدھر سے اُدھر پھر رہے ہیں۔ انتظار کر رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، خاموش ہیں اور اپنے پیچ در پیچ اور الم انگیز خیالات میں منہمک ہیں۔

میں اُس کا انتظار کرتا رہا اور وہ نہ آئی۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس درد و کرب میں چیخ چیخ کر کیوں نہ رو دیا۔ میں نہیں جانتا کہ میں اُس وقت کیوں ہنستا تھا اور خوش تھا، اور اپنی انگلیوں کو اس طرح بند کرتا تھا جیسے وہ کسی خونخوار جانور کے پنجے ہیں، اور

مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کے فشار میں مَیں اُس زہریلے سانپ کو بھیں رہا ہوں جس کا نام "جھوٹ" ہے۔ وہ میری پہلو سے لپٹا ہوا تھا اور میرے قلب کو ڈس رہا تھا یہاں تک کہ میرا سر اُس کے زہر سے چکر لانے لگا۔ دنیا کی ہر بات ایک "جھوٹ" تھی۔ اُس وقت جب میں ابھی پیدا نہ ہُوا تھا اور اُس وقت کے درمیان جب مجھے یہ زندگی ملی ایک حدِ فاصل کھنچ گئی تھی اور میں نے خیال کیا کہ میں ہمیشہ سے زندہ ہوں اور اگر یہ نہیں تو پہلے کبھی نہ تھا۔ اور ہمیشہ میری زندگی سے پہلے اور میری زندگی کے بعد میں اُس نے مجھ پر حکومت کی ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ اُس کا کوئی نام اور کوئی جسم بھی ہے اور اُس کے وجود کی کوئی ابتدا اور کوئی انتہا بھی ہے۔ اُس کا کوئی نام نہ تھا۔ وہ ہمیشہ وہ تھی جس نے جھوٹ بولا اور جس ہمیشہ ایک ابدی انتظار میں رکھا اور کبھی نہ آئی۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں، مگر میں ہنسا۔ برف کی تیز سوئیاں میرے دل کو زخمی کر رہی تھیں اور کوئی غیر مرئی ہستی میرے کان میں قہقہے لگا رہی تھی: "ہو! ہو! ہو!"

اپنی آنکھیں کھول کر میں نے ایک نگاہ اُس عالی شان مکان کی روشن کھڑکیوں پر ڈالی اور انہوں نے چپکے چپکے اپنی زرد اور سرخ زبانوں کے ساتھ مجھ سے کہا:۔

"وہ تم کو دھوکا دے رہی ہے۔ تم یہاں آوارہ منتظر اور مضطرب پھر رہے ہو اور وہ حسن، مسرت اور فریب میں ڈوبی ہوئی اپنے گھر کے اندر اُس بالاقد اور خوبصورت شخص کی سرگوشیاں سن رہی ہے جو تمہیں حقارت سے دیکھتا ہے۔ اگر تم اندر گھس جاؤ اور اُس کو قتل کر ڈالو تو تم ایک نیک کام کرو گے۔ کیونکہ درحقیقت تم جھوٹ کو قتل کرو گے۔"

میں نے اپنے اُس ہاتھ کو زور سے بند کر لیا جس میں چاقو تھا، اور ہنستے ہوئے جواب دیا: "ہاں میں اُسے ضرور مار ڈالوں گا۔" کھڑکیوں نے مجھے حسرت اور اندوہ سے دیکھا اور کہا "تم اُسے کبھی قتل نہ کر سکو گے۔ کبھی نہیں، کیونکہ تمہارے ہاتھ کا ہتھیار بھی اُس کی محبت کی طرح جھوٹا ہے۔"

خاموش سائے مدت ہوئی غائب ہو چکے تھے اور اُس زمہریر میں مَیں اکیلا رہ گیا تھا —— میں اور شعلہ کی بےکس و تنہا زبان سردی اور مایوسی میں کانپ رہے تھے۔ پاس کے گرجا میں سے گھنٹے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ اُداس، درد بھری آواز تھرتھراتی اور سسکیاں لیتی ہوئی فضا میں پرواز کرتی اور پھر ہوا میں دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے برف کے گالوں میں گم ہو جاتی تھی۔ میں نے ضربوں کو گننا شروع کیا اور مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی: کلاک نے پندرہ بجائے! یہ ایک پرانا گھنٹہ گھر تھا اور اسی طرح کلاک بھی پرانا تھا، اور گو اس کا وقت درست ہوتا تھا لیکن گھنٹہ اس کا بے تحاشا ہی بجا کرتا تھا، اس طرح کہ اکثر بوڑھے گھنٹہ بجانے والے کو کلاک کے مینار پر چڑھ کر اُس کی زبان کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے بند کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا، گھنٹے کی اس اداس اور تھرتھراتی ہوئی آواز نے جو کہر کی ظلمت سے الجھی ہوئی اور لپٹی ہوئی ہے آخر یہ جھوٹ کس لئے بولا ہے؟ آہ، یہ

بے فائدہ جھوٹ کس قدر ذلیل اور بے سود ہا ہے۔

گھنٹے کی آخری آواز کے ساتھ وہ چمکتا ہوا دروازہ کھلا اور دہ بلند و بالاقد کا شخص سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ صرف اُس کی پشت پر میری نظر پڑی لیکن میں نے اُسے شناخت کرلیا۔ کیونکہ غرور اور تبختر کے اُس پتلے کو ابھی میں نے کل شام ہی دیکھا تھا میں نے اُس کا قدم پہچان لیا جو گزشتہ شام کی بالنسبت زیادہ ہلکا اور زیادہ مطمئن پڑ رہا تھا۔ میں بھی اکثر اوقات اس گھر سے یوں ہی نکلا تھا۔ اُس کی یہ چال مردوں کی وہی چال تھی جو اُس وقت پیدا ہوتی جب اُن کے لب کسی عورت کے جھوٹے لبوں سے ملتے ہیں۔

۳

میں نے اُس کی منتیں کیں، اُسے دھمکایا، اُس پر دانت پیستا رہا۔

"بتاؤ، مجھے سچ سچ بتاؤ!"

مگر برف جیسے سرد مہر چہرے کے ساتھ، اُٹھے ہوئے متحیر ابروؤں کے ساتھ، سیاہ عمیق چمکتی ہوئی پُراسرار و پُرسکون آنکھوں کے ساتھ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں"۔

وہ جانتی تھی کہ میں ثابت نہ کرسکوں گا کہ وہ جھوٹ کہہ رہی ہے اور یہ بھی اُسے معلوم تھا کہ اُس کے ایک لفظ سے اُس کے ایک جھوٹے لفظ سے میرے اِن جاں خراش و جاں ستاں خیالات کا تمام بوجھ یکسر ہلکا ہوکر رہ جائے گا۔ اسی لفظ کا مجھے انتظار تھا اور وہ اُس کے شیریں لبوں سے ٹپکا۔ صداقت کی تمام رنگینیوں کو لئے ہوئے موتی کی طرح چمکتا ہوا ٹپکا مگر اُس کی گہرائیوں میں اب بھی وہی تاریکی موجود تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ کیا میں کلیتہً تمہاری ہی نہیں ہوں؟"

ہم شہر سے دور تھے اور برف پوش کھیت تاریک کھڑکیوں میں سے نظر آرہے تھے۔ اُن کے اوپر تاریکی تھی اور اُن کے چاروں طرف تاریکی تھی، بے حرکت، خاموش تاریکی، لیکن کھیت اپنی ذاتی روشنی سے اس طرح چمک رہے تھے جیسے اندھیرے میں کسی لاش کا چہرہ نظر آرہا ہو۔ کمرہ خوب گرم تھا اور صرف ایک موم بتی اُسے روشن کر رہی تھی اور اُس بتی کے سرخ شعلہ پر بھی مردہ کھیتوں کی زردی کا اثر پڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کہا "میں حقیقت کو معلوم کرنا چاہتا ہوں خواہ وہ میرے لئے کتنی ہی پُرالم کیوں نہ ہو۔ شاید میں اُسے سن کر مرجاؤں لیکن موت میرے لئے بہتر ہے اُس زندگی سے جس میں جھوٹ کو دخل ہو۔ تمہارے لبوں میں ایک جھوٹ ہے۔ تمہاری آنکھوں میں ایک بطلان ہے۔ مجھ سے سچ کہہ دو اور میں ہمیشہ کے لئے تم کو چھوڑ دوں گا۔" مگر وہ خاموش رہی اور اُس کی تجسس ظاہر

میرے دل میں اتر گئیں۔ میری روح کو انہوں نے کھینچ کر باہر نکال لیا اور ایک عجیب پُرجستجو طریقہ سے انہوں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں چلا کر بولا "میری بات کا جواب دو، ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا"!

اُس نے نہایت مطمئن لہجہ میں جواب دیا "مجھے مار ڈالو۔ بعض اوقات زندگی ایسی ہی اجیرن ہو جاتی ہے۔ مگر مجھ سے تمہیں حق نہ مل سکے گا"۔

میں اُس کے سامنے جھک کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھوں کو میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور رو رو کر اس سے رحم اور حق کے لئے التجا کرنے لگا۔

"آہ اے غریب"! اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

میں نے منت سے کہا "مجھ پر رحم کرو۔ میری روح حق کے لئے بیتاب ہے"۔

میں نے اُس کی شفاف پیشانی کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے حق اُس کی اُس باریک مانگ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ میرے دل میں اُس کے سر کو توڑ کر حق کو اُس میں سے نکال لینے کی ناقابلِ ضبط آرزو پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کا دل اُس کے سینے میں دھڑک رہا تھا اور میں دیوانہ وار اُس سینے کو اپنے ناخنوں سے پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ انسان کے دل کو عریانی میں دیکھنے کے لئے، خواہ وہ ایک ہی دفعہ کے لئے کیوں نہ ہو میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ مومی بتی کا نوکدار زرد شعلہ جواب خاموش ہوا ہی چاہتا تھا بے حرکت ہو رہا تھا۔ مکان کی دیواریں بڑھتی ہوئی تاریکی کے اندر وسعتِ فضا میں گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ غم بے کسی اور ہیبت ہر طرف چھا رہی تھی۔

"آہ اے غریب!" اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

بتی کے زرد شعلے پر تشنج سا طاری ہو گیا۔ ذرا سی دیر کے لئے وہ تڑپا اور پھر بجھ گیا۔ تاریکی کی چادر نے ہم کو اپنے اندر لپیٹ لیا۔ اب نہ میں اُس کے چہرے کو دیکھتا تھا اور نہ اُس کی آنکھوں کو، اور چھوٹ بھی اب مجھے نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نہ میں سوچتا تھا اور نہ اپنے جسم میں زندگی محسوس کرتا تھا، بلکہ صرف اُس کے ہاتھوں کے مس کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا اور یہ مجھے سچ معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس اندھیرے میں اُس کی دھیمی سی سہمی اور ڈری ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"اپنی آغوش میں مجھے چھپا لو۔ میں ڈر گئی ہوں"!

"تم حق معلوم کرنا چاہتے ہو —— مگر کیا میں اُس سے واقف ہوں؟ آہ، کاش کہ میں اُس سے واقف ہوتی۔ مجھے بچا لو۔ آہ میں ڈر گئی ہوں"!

میں نے اپنی آنکھیں کھول ڈالیں۔ زرد و تاریکی بلند کھڑکیوں میں سے نکل کر دیواروں کے قریب جمع ہو گئی اور ادھر اُدھر کونوں

میں اپنا منہ چھپانے لگی۔ پھر نہایت آہستہ سے کسی بہت بڑی اور نہایت سفید چیز نے کھڑکیوں میں سے اندر کی طرف جھانکا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کی مردہ آنکھیں ہمیں تلاش کر رہی ہیں اور اپنی نگاہ کے برفانی تاروں سے جکڑ رہی ہیں۔ کانپتے ہوئے ہم ایک دوسرے کے ساتھ اور زور سے چمٹ گئے۔ اُس نے پھر آہستہ سے کہا "آہ، میں ڈر گئی ہوں"!

۴

میں نے اُسے مار ڈالا۔

میں نے اُسے مار ڈالا اور جب وہ کھڑکی کے قریب ایک بے جان تختے کی طرح چِت پڑی ہوئی تھی تو میں اُس کی لاش پر اپنا پاؤں رکھ کر خوب ہنسا۔ یہ ہنسی کسی مجنون کی ہنسی نہ تھی، نہیں! میں اس لیے ہنسا کہ میرا سینہ اب ہلکا ہو گیا تھا اُس میں اب سکون اور مسرت کی حکومت تھی اور میرے دل سے وہ کرم جھڑ کر گر پڑا تھا جو اُسے دم بدم کھائے جا رہا تھا۔ جھک کر میں نے اُس کی مردہ آنکھوں میں نگاہ ڈالی۔ وہ بڑی بڑی روشنی کے لیے حریص آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور چینی کی گڑیا کی آنکھوں کی مانند گول اور بے نور نظر آ رہی تھیں۔ میں اُن کو اپنی انگلیوں سے چھو سکتا تھا انہیں کھول سکتا اور بند کر سکتا تھا اور مجھے اُن سے کسی قسم کا خوف نہ آتا تھا کیونکہ اب اُن سیاہ اور عمیق تپلیوں میں جھوٹ اور شک کا دیو موجود نہ تھا جس نے اتنی طویل مدت تک حریصانہ میرا خون چوسا تھا۔

جب انہوں نے مجھے گرفتار کیا تو میں ہنس پڑا اور میری یہی حرکت گرفتار کرنے والوں کو نہایت وحشیانہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے نفرت کے ساتھ میری طرف سے منہ پھیر لیا اور پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ اور لوگ لعنت اور نفرین بھیجتے ہوئے میری طرف بڑھے لیکن جب انہوں نے میری مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو اُن کے چہرے زرد پڑ گئے اور اُن کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔

وہ مجھے دیوانہ کہتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ مجھے دیوانہ کہہ کر انہیں تسکین ہو جاتی ہے کیونکہ یہی وہ لفظ تھا جو انہیں قتل کے معمّے کو حل کرنے میں مدد دیتا تھا۔۔۔ کیونکر ممکن تھا کہ میں ایک عاشق ہو کر اپنی محبوبہ کو قتل کر دوں اور پھر ہنسوں۔ صرف ایک موٹا تازہ اور خوش بخوش آدمی مجھے ایک دوسرے نام سے پکارتا تھا جس سے ایک دھچکا سا آ کر مجھے لگتا تھا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا تھا۔

"آہ اے غریب آدمی!" اُس نے رحیمانہ لہجہ میں کہا۔ اُس کو بالکل غصہ نہ آیا کیونکہ وہ ترو تازہ اور خوش تھا "آہ اے غریب آدمی!"

میں نے چلا کر کہا "خبردار! مجھے اس طرح مخاطب نہ کرو"

میں نہیں جانتا کہ میں کیوں اُس پر جھپٹا۔ میں یقیناً اُسے مارنا نہ چاہتا تھا لیکن مجھ سے ڈرتے ہوئے یہ تمام لوگ جو مجھے دیوانہ اور مجرم سمجھتے تھے اور زیادہ خائف ہو گئے اور اس طرح چیخیں مارنے لگے کہ مجھے پھر ہنسی آ گئی۔

جب وہ مجھے اُس کمرے میں لے گئے جہاں لاش پڑی ہوئی تھی تو اُس لحیم وشحیم اور مسرور آدمی کی طرف دیکھ کر میں نے پے بہ پے بلند اور پتلی آوازیں کہنا شروع کر دیا "میں خوش ہوں۔ میں خوش ہوں"
اور یہ سچ تھا۔

۵

بچپن میں ایک مرتبہ چڑیا گھر میں مَیں نے ایک چیتے کو دیکھا تھا جس کا تصور میرے دل میں مدتوں رہا اور مدتوں میرے خیالات اُس کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ دوسرے درندوں کی طرح احمقانہ نشے میں سرشار پڑا نہ رہتا تھا اور نہ ہی بیہودہ طور سے تماشائیوں کی طرف مبہوت ہو کر دیکھتا تھا۔ وہ ایک خطِ مستقیم پر سیدھا ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتا تھا اور ہر بار ایک ہی مقام سے پلٹتا تھا اور ہر دفعہ اُس کی صاف اور چمکیلی کھال اُس کے پنجرے کی ایک ہی سلاخ سے ٹکراتی تھی اُس کا خونخوار سر جھکا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں بالکل سامنے کی طرف متوجہ تھیں کبھی ایک دفعہ بھی اُس نے اِدھر اُدھر نظر نہیں ڈالی۔ دن بھر لوگ آ آ کر اُس کے پنجرے کے سامنے شور مچاتے تھے مگر وہ برابر ایک نہج پر آگے اور پیچھے چلتا رہتا تھا اور کبھی آنکھ اٹھا کر بھی اُن کی طرف نہ دیکھتا تھا۔ ہجوم میں سے چند مسکراتے تھے مگر اکثر سنجیدگی اختیار کر لیتے تھے بلکہ افسردگی اور پژمردگی کی اس زندہ تصویر کو دیکھ کر مغموم ہو جاتے تھے ایک آہ بھر کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ اور جب وہ کچھ دور نکل جاتے تو ایک مرتبہ پھر ایک مستفسرانہ اور متحیرانہ نگاہ اُس پر ڈالتے جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ اُن کی اپنی انسانی حالت میں اور اس مقید درندے کی حالت میں کوئی بات مشترک ہے جو فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اور جب میں بڑا ہوا اور لوگوں کی زبانوں کو اور کتابوں کو ازل و ابد کا تذکرہ کرتے دیکھا تو مجھے وہ چیتا پھر یاد آگیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ہمیشگی اور اُس کے رنج و تعب کی ایک تصویر کو میں نے کبھی دیکھا ہے۔

اُس چیتے کی طرح میں اپنے پتھر کے پنجرے میں بند تھا۔ ٹہلتا تھا اور سوچتا تھا۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک سیدھی لکیر پر میں چلتا تھا اور میرے خیالات بھی ایک ایسے ہی خطِ مختصر پر سفر کرتے تھے لیکن یہ خیالات اتنے بوجھل تھے کہ مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں نے صرف ایک سر کو اُٹھا رکھا ہے بلکہ مجھے اپنے کندھوں پر ایک دنیا کا بار پڑا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ تمام خیالات صرف ایک لفظ پر مشتمل تھے لیکن کیا ہی وسیع، کتنا پُر عذاب اور کیسا تباہ کن تھا وہ لفظ !

وہ لفظ "جھوٹ"

تمام کونوں سے وہ پھنکارتا ہوا نکلتا تھا اور میری سوچ کے گرد لپٹ جاتا تھا۔ لیکن اب وہ چھوٹا سا سانپ نہ رہا تھا اب وہ بہت بڑا، خونخوار، شعلہ ریز اژدہا بن گیا تھا وہ مجھ کو ڈستا تھا اور اپنی آہنین لپیٹوں میں جکڑ کر مجھے نیم جاں کر دیتا تھا میرے سینے میں چھوٹے چھوٹے سانپوں کا ایک طوفان اٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا میں درد و کرب سے چیخ اُٹھتا تھا اُس وقت میرے منہ سے

وہی ایک چھنکاتا ہُوا خوفناک لفظ نکلتا تھا "جھوٹ"!

اور جب میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہُوا نیدخانہ میں ٹہلتا تھا تو اُس کا بھورا بھورا فرش میری آنکھوں کے سامنے ایک بھورے رنگ کے شفاف غار میں تبدیل ہو جاتا تھا میرے پاؤں فرش کو چھوتے معلوم نہ ہوتے تھے اور میں خیال کرتا تھا کہ میں کسی ناقابلِ فہم بلندی پر گُہر کی تاریکیوں میں بہا چلا جا رہا ہوں۔ اور جب میرے سینے سے وہ سنسناتا ہُوا لفظ نکل جاتا تو نیچے سے کُہر کے اس ناقابلِ نفوذ پردے کے نیچے سے آہستہ آہستہ ایک ہیبت ناک گونج اُٹھتی اور اتنی آہستہ اور دھیمی ہوتی گویا وہ ہزارہا سال کے زمانے میں سے گزر کر آ رہی ہے اور دھند کے ایک ایک بخرے میں اُس کی طاقت کا ایک ایک ذرہ گم ہو گیا ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہاں، نیچے یہ اُس آندھی کی طرح چل رہی ہے جس سے درخت بھی اکھڑ اکھڑ کر گر پڑتے ہیں، لیکن جب یہ میرے کانوں تک پہنچتی تو اس کی بساط اُس مختصر سے لفظ سے زیادہ نہ رہتی جو سرگوشی کی آواز میں کہا جائے "جھوٹ"!

یہ ذلیل اور کمینہ سرگوشی مجھے طیش میں لے آتی اور میں زور سے زمین پر پاؤں مارتا اور چلا کر کہتا "جھوٹ کہیں بھی موجود نہیں میں نے جھوٹ کو مار ڈالا ہے"۔

میں جان بوجھ کر پرے ہٹ جاتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کا جواب مجھے کیا ملے گا ـــــ اور اتھاہ غار میں سے آہستہ آہستہ جواب اوپر کو آتا "جھوٹ"!

جانتے ہو، میں نے ایک خطرناک غلطی کی۔ عورت کو قتل کر کے میں نے جھوٹ کو ابدی زندگی دے دی۔ عورت کو کبھی قتل نہ کرو۔ یہاں تک کہ دعا، رنج اور عذاب سہہ سہہ کر تم اُس کی ریح سے سچ کو پا لو۔

۶

تاریک اور خوفناک ہے وہ جگہ جہاں وہ سچ کو اپنے ساتھ لے گئی، اور جھوٹ کو ـــــ اور وہیں میں بھی جا رہا ہوں۔ شیطان کے تخت کے نیچے میں اُسے پکڑ لوں گا اور اُس کے سامنے جھک کر اور رو رو کر اُس سے کہوں گا "مجھے سچ بتاؤ! مجھے سچ بتاؤ"!

لیکن خدا! اے خدا! یہ بھی تو جھوٹ ہے۔ یہاں تو خلا ہی خلا ہے، صدیوں کا خلاء بے پایاں خلا، مگر وہ کہاں ہے ـــ وہ کہیں بھی نہیں ہے لیکن جھوٹ کو وہ باقی چھوڑ گئی ہے۔ یہ غیر فانی ہو گیا ہے۔ میں ہوا کے ہر ذرے میں اُسے پاتا ہوں اور جب میں سانس لیتا ہوں تو یہ میرے سینے میں داخل ہو کر پھنکارتا ہے اور کاٹ کاٹ کر میرے دل کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔

اوہ! کسی شخص کے لیے حق کی تلاش کتنا بڑا جنون ہے، کتنا بڑا دکھ ہے۔

بچاؤ! مجھے اس دکھ سے بچاؤ!

اندریف ـــــــــــــ منصور احمد

شاعر کی التجا

(محبت کی دیوی سے)

سر جھکائے ہوئے، خاموش پجاری کی طرح تیرے دربار میں آیا ہوں بھکاری کی طرح
روح افسردگیٔ ذوق سے بے حد ہے ملول خلشِ شوق کے ناپید ہیں اسبابِ حصول
سازِ دل نغمۂ بیتاب سے یکسر خالی کشتِ جاں موجۂ شاداب سے یکسر خالی
زندگی خنکیٔ جذبات سے برباد و خراب بے حسی وہ کہ جوانی بھی مری ننگِ شباب
ذہن ناکام و مقید ہے، نگاہیں محدود طائرِ شوق کے پرواز کی راہیں مسدود
روح ٹھٹھری ہوئی بیگانۂ تابش ہے الگ عقل افسردہ و محرومِ نوازش ہے الگ
دل سے جولانیٔ ارماں کی حرارت مفقود کشمکشہائے تمنا کی جسارت مفقود
قلب پر ابرِ کثافت کی گرانباری ہے سینۂ سرد پہ خاموشیٔ غم طاری ہے

پھونک دے وہ نفسِ گرم مرے سینے میں بال پڑ جائے مرے قلب کے آئینے میں
فطرتِ عشق کو اسبابِ ضیا باری دے دل کے سوئے ہوئے جذبات کو بیداری دے
طائرِ روح کو مل جائے وہ پروازِ خیال لے اُڑے بامِ فلک کو بھی تگ و تازِ خیال
چشمِ پُرشوق کو مخمورِ تماشا کر دے دل میں "وجدانِ محبت" کا اجالا کر دے
میرے الفاظ میں وہ سوز و اثر پیدا ہو ہر طرف شعلہ نوائی کا مری چرچا ہو

سارے عالم پہ ہو محویتِ وجداں طاری
جھوم جائے مرے اشعار سے دنیا ساری!

ذوقی

جوہری

کاروبار کے جھمیلے میں نو بج گئے اور کثرتِ کار کے سبب میرا دماغ چکرانے لگا۔ تازہ دم ہونے کے لئے آخر "چانسری لین" سے نکل کر میں "ام بینک منٹ" کی طرف چل دیا۔

راستے میں دریا کی درخشانی فردوسِ نظر تھی۔ میں بہاؤ کا تماشا دیکھنے کے لئے رکا ہی تھا کہ معاً میرے کانوں میں یہ آواز آئی: "رات گرم ہے۔"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو ایک شخص پل پر دیوار سے سہارا لئے کھڑا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ شخص راندۂ روزگار اور آوارۂ قسمت ہے۔ اگر اس کو جواب دیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ وہ کھانے پینے کا سوال کر بیٹھے۔ میری نظریں اُس کے چہرہ پر مرکوز ہو گئیں۔ اُس کا چہرہ اُس کی پریشانیٔ خاطر کا بھانڈا پھوڑ رہا تھا۔ اُس کی پیشانی پر ذہانت و فطانت کے آثار ہویدا تھے اور اُس کے ہونٹ متحرک اور مرتعش تھے۔

میں نے جواب دیا "رات واقعی گرم ہے لیکن اس جگہ دریا کے قرب کی وجہ سے کچھ خنکی سی پیدا ہو گئی ہے۔"

اُس نے دریا کے اُس پار نظر ڈال کر کہا: "اُس شخص کے لئے جو سارا دن فکرِ دنیا میں سر کھپائے لندن بھر میں یہی ایک پُرکیف جگہ ہے جہاں دماغ کو تازگی اور نظروں کو آسودگی ملتی ہے .... پھر اُس نے رک رک کر کہا: زندگی کاہشوں سے لبریز ہے ––– میرا خیال ہے کہ آپ بھی میری طرح تھکے ماندے اور غمِ روزگار کے شاکی ہیں ––– دل چاہتا ہے کہ نام و نمود کی ہنگامہ طرازیوں سے ہمیشہ کے لئے بیزار ہو جاؤں اور زر و مال کو تج دوں" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور مجھے اضمحلالِ شکستہ کے ساتھ مگر متحیر نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے عمر بھر اس جیسا حیرانی و حسرت کا مارا انسان نہیں دیکھا تھا اُس کا ملبوس میلا چکٹ اور دریدہ تھا۔ مجھے اس سے ایک بوئے کہنگی آنے لگی۔ اُس کے طرزِ تخاطب سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کوئی دیوانہ ہے۔

میں نے کہا: "واقعی زندگی کاہشوں سے لبریز ہے۔ زندگی میں فائز المرام ہونے کے لئے سر کھپانا پڑتا ہے ––– کہو کسب معاش کا کیا ذریعہ ہے؟"

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "کیا کہوں آپ کو یقین نہیں آئے گا ––– میرا کاروبار نہایت ہی اعلیٰ پایہ کا ہے لیکن اب کچھ تکالیف کا سامنا ہو رہا ہے۔ میں .... میرے .... بنا سکتا ہوں۔"

"شاید اب کام سرد پڑ گیا ہے ؟"

"نہیں ——— مصیبت یہ ہے کہ لوگ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے "

پھر اُس نے اپنے صد تار کوٹ کے بٹن کھول کر جیب سے کپڑے کا ایک بٹوا نکالا اور اُس سے ایک بڑا ہیرا نکال کر میرے ہاتھ میں دیا اور کہا: "ایک سال کا عرصہ گزرتا ہے کہ میں علم الطبیعیات کی آخری سند لے چکا ہوں۔ یہ میرا خود ساختہ ہیرا ہے"

حقیقتاً یہ ہیرا بہت موٹا اور بڑا تھا۔ میں نے اطمینان کی غرض سے پہلے تو گھڑی کے شیشے کو کاٹا اور پھر چاقو کو خراش دی۔ میرے دل میں خلش تجسس پیدا ہو گئی اور پوچھا: "یہ ہیرا ہے ——— کہو یہ کیسے ہاتھ آیا ہے ؟"

اُس نے ہیرا میرے ہاتھ سے لے کر کہا: "میں کہہ چکا ہوں کہ یہ میرا خود ساختہ ہیرا ہے۔ آپ سے ایک سو پاؤنڈ کی حقیر رقم لوں گا جو اس کی قیمت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے"

یہ سن کر میرے دل میں کئی قسم کے شبہات پیدا ہوئے "اگر یہ ہیرا ہے تو اس آشفتہ سر کے ہاتھ کیونکر آیا ہوگا اور یہ اِسے بیچنا کیوں چاہتا ہے ؟"

پھر ہماری نگاہیں دوچار ہوئیں اور مجھے اُس کی دیانت داری اور ایمانداری کا یقین سا ہو گیا۔ ادھر یہ خیال میرے دل میں جاگزین ہو گیا کہ ہیرا یقیناً بے حد قیمتی اور گراں مایہ ہے۔ جواہرات عالم پر جب کوئی کتاب لکھی جائے گی تو اس ہیرے کا تذکرہ کیا جائے گا۔ میں یہ ہیرا خرید لیتا لیکن مصیبت یہ تھی کہ یک صد پونڈ میرے پاس پس انداز نہیں تھے۔ یہ رقم راس المال سے دینی پڑتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کاروبار میں دشواریاں پیدا ہو جاتیں۔

میں نے اطمینان کی غرض سے ایک بار پھر پوچھا: "آپ نے یہ ہیرا کہاں سے لیا ہے ؟"

یہ میرا خود ساختہ ہیرا ہے پھر اُس نے آہ کھینچ کر کہا: "دل چاہتا ہے کہ آپ کو اپنی سرگذشت سنا دوں شاید آپ کے شکوک رفع ہو جائیں ——— لیکن . . . . "

پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں ہیرے کے کیمیاوی اجزا پر ایک بصیرت افروز علمی لیکچر دیا اور کہا کہ میں نے سترہ سال کی عمر میں یہ کام شروع کیا تھا۔ اب میری عمر بتیس سال ہے۔ گویا پندرہ سال اس شغل کی نذر ہو چکے ہیں۔ میرا کل اندوختہ اسی جنوں کی تکمیل میں صرف ہوا اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور برابر تجربات کرتا رہا۔ میرے لئے سب سے بڑی مشکل اس راز کا چھپانا تھا۔ میں نے کنگسٹن ٹاؤن میں تن تنہا اپنے مختصر سے معمل میں ایک عجیب النوع تجربہ کیا۔ کاربن اور بعض سیال چیزوں کے امتزاج کو بندوق کی نلی میں ڈال کر اُسے گلخن کے سپرد کر دیا"

میں نے کہا: "یہ تجربہ تو خطرناک ثابت ہوا ہوگا"

اُس نے جواب دیا "نلی پھٹ گئی اور دروازہ کھڑکی اور جو کچھ اثاث البیت باقی تھا سب جل بجھ کر رہ گیا۔ پھر میں نے پیرس کے ایک محل میں جاکر یہ خطرناک کھیل کھیلا اور وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر مایوس ہوکر وہاں سے چلا آیا۔ اور ایک دن فولادی سلنڈر میں بعض کیمیاوی اجزا بھر کر اُسے لَو دیتے ہوئے گلخن میں ڈال کر سیر کو نکل گیا۔"

یہ سُن کر میں بے اختیار ہنس دیا اور کہا "کیا اس کرہ میں آدمی نہیں تھے یا تمہیں پچھلا تلخ تجربہ بھول گیا تھا"

اُس نے جی کڑا کر کے کہا: "اِس قسم کے خمیازے تجربات کے شوق میں کھینچنے ہی پڑتے ہیں ——— بالائی منزل میں مالنیں رہتی تھیں اور نیچے ایک بڑا کنبہ اقامت گزیں تھا۔ میں سیر سے واپس آیا تو سلنڈر صحیح وسالم پڑا تھا۔ میں نے اس ڈر سے کہ شاید ایک آنچ کی کسر کا معاملہ کہیں پیش نہ آئے اُس کو گلخن سے نکالنا مناسب نہ سمجھا گو دل ایک کشمکش اور اضطراب میں تھا۔ ان دنوں میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اِدھر مکان کے کرایہ کا تقاضا ہو رہا تھا۔ اِس جنون میں جو کچھ کیا اُس کا اعادہ تحصیلِ حاصل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ دربانی کی، اخبار بیچے، سائیس بننا منظور کیا اور ایک ہفتہ تو کاسۂ گدائی ہاتھوں میں لے کر دریوزہ گری کرتا رہا۔

ایک بار دو دن کا فاقہ تھا، اِدھر گلخن کی آگ ٹھنڈی ہو رہی تھی اور کوئلے ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ حسن اتفاق سے ایک چھوٹی بچی کو اُٹھا کر اُس کے گھر پہنچا آیا اور وہاں سے چھ پیسے ملے جن کے آتے ہی کوئلے خرید لئے۔

تین ہفتوں کے بعد وہ سلنڈر نکال کر دیکھا تو کیمیاوی اجزا کبریتِ احمر کی طرح کھول رہے تھے۔ جب سلنڈر سرد پڑ گیا تو اُسے کھولا۔ اُس میں سے تین بڑے بڑے اور پانچ چھوٹے چھوٹے ہیرے برآمد ہوئے۔ میں اُنہیں دیکھ رہا تھا کہ ایک نشے میں مخمور شرابی میرے کمرے میں در آیا۔ میں نے جھنجھلا کر اُس کا منہ نوچ لیا اور پھر دھکے دے کر اُسے مکان سے نکال دیا۔ گو وہ بکتا رہا لیکن میں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی اور اپنی دُھن میں لگا رہا۔ کمبخت نے یہاں سے نکل کر پولیس میں میرے خلاف چغلی کھائی اور مجھے تھانہ میں اپنے سربستہ راز کو خود ہی افشا کرنا پڑا۔ اگر حقیقت کا اعلان نہ کرتا تو بہت ممکن تھا کہ کسی سازش کے الزام میں دھر لیا جاتا۔ صبح کو اخبارات نے جو ہمیشہ بے پر کی اڑاتے ہیں میرے کلبۂ احزان کو "کنگسٹن ٹاؤن بم فیکٹری" لکھا۔

آپ ہی دنیا بھر میں پہلے شخص ہیں جن سے یہ راز کی بات کہہ رہا ہوں کیونکہ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔"

میں نے ازراہ تمسخر کہا۔ "خدا کا شکر ادا کیجئے کہ سستے چھٹے ورنہ کیا معلوم کہ کونسی افتاد پڑتی۔"

اس سرگذشت کے بعد میرے لئے ہیرے کا خریدنا حماقت کا کام تھا۔ اِس لئے میں نے جواب دیا کہ "مجھے

پوری طرح سے تو نہیں، کچھ نہ کچھ یقین ضرور ہو گیا ہے۔ بہتر ہے کہ کل آپ میری دوکان پر تشریف لے آئیں تاکہ مکمل گفتگو ہو سکیں"

اُس نے جھلا کر کہا: "آپ ملاقات کا دن معین کر کے مجھے گرفتار کرانا چاہتے ہیں —— لیکن میں کچی گولیاں نہیں کھیلا"

میں نے آواز کے مطمئن لہجہ میں جواب دیا: "یہ آپ کا سوءِ ظن ہے۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے —— اچھا کل نہ سہی کسی دن تشریف لائیے۔ یہ ہے میرا کارڈ"

اُس نے کارڈ لے کر جاتے ہوئے کہا: "اگر آپ نے یہ راز افشا نہ کیا تو معقول ہدیہ دوں گا"

یہ کہہ کر وہ تاریکی میں غائب ہو گیا اور میں بھی چلا آیا۔ کچھ دنوں کے بعد اُس کے دو خطوط ملے جن میں لکھا تھا کہ فلاں پتے پر بینک نوٹ بھیج دو۔ لیکن میں نے دونوں تحریروں کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک بار میں کہیں باہر تھا کہ وہ میری دوکان پر آیا۔

واپسی پر میرے ملازم نے مجھ سے کہا کہ "ایک شخص آپ سے ملنے کے لئے آیا تھا جس کا ملبوس کہنہ اور دریدہ تھا۔ اُسے کالی کھانسی کا روگ بھی تھا"

یہ سُن کر مجھے خیال آیا کہ غالباً وہی دیوانہ جوہری آیا ہوگا۔ میں اکثر راتوں کو سوچتا رہتا ہوں کہ کیا واقعی وہ ہیرے بنا سکتا ہوگا —— یا کوئی دیوانہ ہوگا۔ اب وہ مر چکا ہوگا اور اب اُس کے ہیرے پھینک دیئے گئے ہونگے۔ پھر رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہوگا اور ہیروں کو بیچتا پھرتا ہوگا۔

(مختار) صادق ایوبی

اگر میرے پاس آسمانوں کی اقلیم کے قالین ہوتے —— نور کی سیمیں و زریں کرنوں سے مزین قالین، رات دن اور شام کے نیلے دھندلے اور سیاہ قالین،

تو میں اُن کو تمہارے قدموں میں بچھا دیتا،

مگر میں نادار ہوں اور میرے پاس صرف میرے خواب ہیں،

مَیں نے اپنے خوابوں کو تمہاری راہ میں بچھا دیا ہے،

آہستہ چلو، کیونکہ تمہارے قدموں کے نیچے میرے خواب ہیں۔

ییٹس

کنول

کیسا جھلک رہا ہے رنگ آب میں کنول کا
کیا خوشنما ہے منظر تالاب میں کنول کا

کیا صبح ہو رہی ہے کیا نور کا سماں ہے
پانی پہ اللہ اللہ کیا فرشِ ارغواں ہے

ہوتے ہی صبح انجم گردوں سے سب سدھارے
پر جلوہ گر ہیں کیسے پانی کے یہ ستارے

ہے داغ دار لالہ وہ کس حساب میں ہے
نسبت کنول سے کیا دوں کا نٹا گلاب میں ہے

ہے سطحِ آب ساکن یا روئے آب فق ہے
بے طرفہ تر تماشا پانی پہ بھی شفق ہے

تاباں نہیں کنول میں شبنم کا قطرہ قطرہ
موتی سے ہے لبالب یا قوت کا پیالہ

روشن نہ ہوں کنول سے کیوں رمزِ حسنِ فطرت
اس کا ورق ورق ہے اک دفترِ حقیقت

ڈنٹھل ہیں نرم و نازک پتے ہرے ہرے ہیں
کیسے بڑے بڑے ہیں کیسے بچھے ہوئے ہیں

ہے دلفریب کیسا نظارۂ زرِ گل
رکھا ہوا ہے گویا اک تاج برسرِ گل

کیا آ رہی ہیں کرنیں خورشید سے نکل کر
کیا کھل رہی ہیں کلیاں رنگت بدل بدل کر

کیا اُڑ رہے ہیں بھونرے کیا آ کے گر رہے ہیں
کیا جاں چھڑک رہے ہیں کیا گرد پھر رہے ہیں

کیا لوٹتی ہیں موجیں پھولوں کی اس ہنسی سے
بے تاب خود ہے جل بھی ان کی شگفتگی سے

لہروں کے پیچ و خم کا کیا دل کشا ہے نقشا
پھولوں میں ہے ہوا سے یہ اہتزار کیسا

پانی میں بھی ہے قائم، یہ نشہ رنگ کا ہے
رہ رہ کے ہائے کیسا ہر پھول جھومتا ہے

دکھلا رہا ہے کیا کیا اپنی بہار ساگر
کثرت سے ہے کنول کی اک لالہ زار ساگر

نسریں، گلاب، سوسن ہیں خندہ زن چمن میں
چمپا چنار، جوہی، ٹیسو، کھلے ہیں بن میں

لالہ بنا ہے زینت افزائے کوہسار اں
ہے پردۂ حجر میں نورِ شرار پنہاں

یعنی نہیں کوئی جا حسنِ ازل سے خالی
پانی کی سطح رہتی کیونکر کنول سے خالی

میر سعادت حسین نجیب

اَبدی خواب

وہ ایک صاف شفاف چشمے کے کنارے محوِ خواب تھا کل کی طرح آج پھر اُس کے گھنگریالے بال سرخ گلاب کو شرمانے والے رخساروں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی اور سنیوں میں بھیگی ہوئی ہواؤں کے جھونکے آتے اور اُس کے سنہرے بال رقص کرنے لگتے۔ کتنا خوبصورت؟ ــــــ بہت ہی حسین! منظر ہو! مگر سونے والے کو کیا خبر؟ یہ چشمہ ایک شاداب وادی میں ہچکولے لے رہا تھا۔ بہت ہی سرسبز وادی ہیں۔ وہ لوگ جو اس سبزہ زار اس رنگ و بوزار سے لطف اندوز ہونے کے لئے سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے سیر کے لئے نکل پڑتے ہیں خوب جانتے ہیں کہ ہنگامِ سحر یہ شبنمستانِ فطرت کس قدر نظر نواز ہوتا ہے۔

آفتاب بلند ہو رہا تھا اور سنہری کرنیں شبنم کے موتیوں میں تابشِ زریں پیدا کر رہی تھیں، پاس کے گاؤں کی دوشیزہ لڑکیاں اور مناظر پرست نوجوان سیر سے فارغ ہو کر لوٹ رہے تھے۔ بے فکر ــــــ دنیا سے آزاد ــــــ نوجوان ابھی تک گہری نیند میں تھا، ایک کہن سال بوڑھے دہقان نے نوجوان کے پاس سے گذرتے ہوئے کہا۔

"نکما ــــــ اور دنیا کے لئے بیکار محض بے کار" ــــــ ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد! "جوانی میں مَیں بھی اسی طرح آزاد تھا۔ بیوقوف لڑکے تو بھی میری طرح زمانے کی ٹھوکریں کھائے گا!"

نوجوان اُسی طرح محوِ خواب تھا۔

اب ایک فلاسفر کی باری آئی اور اُسے چشمہ کے کنارے بے فکر سوتے دیکھ کر اُس نے دل ہی دل میں کہا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ نوعمر لڑکا دنیا کا بہترین فلاسفر ہوگا زندگی اگر نام ہے سکون اور آزادی کا تو وہ اُسے حاصل ہے"

فلاسفر چلا بھی گیا مگر سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا۔

دوشیزہ لڑکیوں کے قہقہے اب قریب سے قریب تر ہو رہے تھے۔

یہ "طوفانِ جمال" اب اُس کے بالیں پر تھا اور وہ بے خبر سو رہا تھا۔ "اُف کس قدر حسین نوجوان ہے" ایک

معلوم ہوتی تھی۔ "حسن کی شہزادی" دوشیزہ نے کہا جو صبح کا بہترین لباس پہنے ہوئے
"غریب لڑکیوں کا دل لینے والے! بیدار ہوجا!" بہت سی لڑکیوں نے ایک ساتھ کہا ایک حسین ترین لڑکی
جھکی اور اُس کے کان کے قریب ہوکر بولی "آدمی کے بھیس میں سونے والے کیوپڈ کیا تو میرے سجدوں کا منتظر ہے"
کافر جال لڑکا ابھی تک نیند کے مزے لے رہا تھا ———
ایک شوخ حسینہ نے اپنی پھولوں کی ٹوکری کے سب پھول اُس پر قربان کردیئے مگر نتیجہ؟ مایوسی! ———
"سرد اور نہایت سرد پانی کے چھینٹے" انتہائی شوخ دوشیزہ نے کہا اور بہت سی لڑکیوں نے چشمہ کا پانی اچھالنا
شروع کردیا۔ مگر سونے والا برابر سوتا رہا۔

لڑکیاں غصے میں اپنے لبوں کو دانتوں میں دباتی ہوئی چلی گئیں انہیں
مایوس ——— ناکام ——— محروم ———
افسوس اور انتہائی افسوس تھا کہ ایک جوانی کی نیند سونے والا اُن کی تمام کوششوں کے باوجود نہ جاگ سکا وہ لڑکی
جس نے سونے والے کو کیوپڈ قرار دیا تھا کچھ سوچ کر لوٹی اور نوجوان کے پاس پہنچ کر ایک لڑکے اور لڑکی میں محبت
پیدا کردینے والا گیت گانے لگی۔ سونے والے نے ایک انگڑائی لی پاؤں سکیڑے اور آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا ———
اُس نے حُسن کی ملکہ کو دیکھا اور "میری پیاری معشوقہ" کہہ کر اُسے آغوش میں لے لیا۔

حسین لڑکی اُس سے رخصت طلب کررہی تھی "میری پیاری ملکہ" کل میں یہیں تمہارا منتظر ہونگا ——— جاؤ ———
خدا حافظ۔ لاؤ یہ پھولوں کی ٹوکری مجھے دو" اُس نے ایک پھول اُٹھایا ——— اور ناک کے قریب لے جاکر بولا۔
"بہت ہی خوشبودار ——— پھول ——— لو یہ تمہیں نذر کرتا ہوں مگر نیچے اس سے اچھے پھول ہونگے اُس نے
ٹوکری کو کریدنا شروع کردیا ——— "سی" کی صورت میں ایک خوفناک آواز اُس کی زبان سے نکلی اور خاموش حسینہ نے گھبرا
کر اُس کی خون آلودہ انگلی کو دیکھا اور پھر اُس زہریلے مگر چھوٹے سے سانپ کو جو ٹوکری کے پھولوں میں چھپنے کی کوشش کررہا
تھا۔ اُس کے نازک دل کی حرکت بند ہوگئی۔
سانپ! ——— اُف سانپ!" اُس کی زبان سے نکلا اور "ابدی خواب" میں سونے والے کے برابر
لیٹ گئی۔

روشؔن صدیقی

پیاری دوستی

خوش نما رنگیں ادا ننھی سی پیاری دوستی

دوستی سی دوستی ہے یہ ہماری دوستی

زندگی معمور ہو جاتی ہے حق کے نور سے

جب فضائے روح میں ہوتی ہے طاری دوستی

مصلحت نا آشنا راحت سے یکسر بے نیاز

دل کی مجبوری ہے اور بے اختیاری دوستی

جان و دل صاف و سبک ہوتے ہیں دیدِ دوست سے

دردِ فرقت ہیں مگر دل پر ہے بھاری دوستی

دوست کا ملنا نہ ہو صد حیف اپنے دوست سے

بے قراری دوستی ہے آہ و زاری دوستی

کب وہ دن آئے کہ میرے دل کا بھی غنچہ کھلے

ہے کسی سے مجھ کو بھی بادِ بہاری دوستی

"گلریز"

عمل اور علم

انسان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اُس کی زندگی تمام کی تمام قلب سے ظہور کرتی ہے اور قلب اُس کی عادات کا ایک مجموعہ ہے جسے وہ پیہم کوشش سے ایک غیر معیّن حد تک تبدیل کر سکتا ہے؛ اور جس پر وہ کامل غلبہ اور اقتدار حاصل کر سکتا ہے۔ اسی طریقہ سے وہ کلید اُس کے قبضہ میں آ جاتی ہے جس سے نجات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

لیکن زندگی کی مصائب و آفات سے (جو در اصل انسان کے اپنے ہی قلب کی مصائب و آفات ہیں) نجات ایک ایسا معاملہ ہے جو بتدریج نفس سے نشوونما پاتا ہے اور یکایک کہیں باہر سے اس کا حصول ناممکن ہے۔ ہر گھڑی اور ہر روز نفس کی تربیت ایسی ہونی چاہئے کہ اُس میں بے لوث خیالات پیدا ہوں اور وہ اُن حالات میں بھی جو انسان کو غلط کاری اور ظلم کی طرف لے جاتے ہیں، راست بازی اور انصاف پسندی کی طرف مائل ہو۔ اُس صابر و شاکر بت تراش کی طرح جو مجسمہ کے ایک ایک عضو پر پہروں صرف کر دیتا ہے راستی کی زندگی کے طالب کو اپنے نفس کے سنگین مجسمہ پر نہایت صبر و استقلال سے بتدریج کام کرنا چاہئے، یہاں تک کہ وہ اپنے اُس مطمح نظر کو پالے جس کے پاکیزہ اور شیریں خواب وہ دیکھا کرتا تھا۔

اس قسم کے بلند پایہ نتائج حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے سب سے نچلی اور آسان ترین سیڑھی پر قدم رکھا جائے اور بلند اور مشکل مقامات کی طرف باقاعدہ اور بتدریج ترقی کی جائے۔ نشوو ارتقا اور ترقی و فلاح کا یہ قانون کہ آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ بامِ رفعت تک پہنچا جائے ، زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب ہونے کے لئے اپنے اندر ایک قطعیت رکھتا ہے اور جہاں اس قانون، اس دستور العمل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے قطعی ناکامی اس کا نتیجہ ہوتی ہے۔ علم پڑھنے میں، فن سیکھنے میں یا کوئی تجارت اختیار کرنے میں اس دستور العمل کو پوری طرح تسلیم کیا جاتا ہے اور اس پر نہایت دقتِ نظر سے عمل کیا جاتا ہے، لیکن نیکی سیکھنے میں، صداقت کا سبق پڑھنے میں اور زندگی کا حقیقی تجربہ اور علم حاصل کرنے میں اسے عموماً بھلا دیا جاتا ہے اور اس پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اسی لئے نیکی، صداقت اور کامل زندگی ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے۔

یہ فرض کر لینا ایک عام غلطی ہے کہ اعلیٰ زندگی محض دینیاتی اور مابعد الطبیعاتی قیاسات کو پڑھ لینے اور اُن پر یقین کر لینے کا معاملہ ہے اور یہ کہ اس طریقہ سے روحانی حقائق سمجھے جا سکتے ہیں۔ اعلیٰ زندگی نام ہے خیالاً، لفظاً اور عملاً اعلیٰ زندگی بسر کرنے کا۔ اور ان روحانی حقائق کا علم جو انسان میں اور کائنات میں مرکوز ہیں صرف اخلاقِ فاضلہ کی پیروی

اور عمل کی باقاعدگی سے حاصل ہوتا ہے۔

قبل اس کے کہ زیادہ کو جانا اور سمجھا جائے کم کو کامل طور پر جان اور سمجھ لینا چاہئے، اور یہ ایک کلیہ ہے کہ عمل ہمیشہ حقیقی علم پر مقدم ہوتا ہے۔ مدرسہ کا استاد کبھی اپنے شاگردوں کو ابتدا میں ریاضی کے مختصر اور دقیق اصول نہیں بتاتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس طریقہ سے پڑھانا بیکار اور پڑھنا ناممکن ہوجائے گا۔ وہ پہلے پہل اُن کے سامنے ایک سادہ اور آسان سوال رکھ دیتا ہے اُس کے حل کا طریق انہیں سمجھاتا ہے اور پھر انہیں حل کرنے کو کہتا ہے۔ جب بار بار کی ناکامیوں اور پے بہ پے کوششوں کے بعد وہ اس کا صحیح جواب نکالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو وہ انہیں ایک اور اس سے مشکل سوال دیتا ہے اور پھر ایک اور، اور ایک اور۔ یہاں تک کہ جب طالب علم سالہا سال کی مسلسل مشق سے ریاضی کے تمام اسباق پر حاوی ہوجاتے ہیں تو اُس وقت استاد اُنہیں علم ریاضی کے وہ حقایق بتاتا ہے جو پہلے اُن سے پوشیدہ تھے۔

اول اول کسی فن کے حاصل کرنے میں مبتدی کو اُس فن کے حقائق و اصول نہیں بتائے جاتے بلکہ ایک معمولی سا اوزار اُس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے اور اُسے اُسکے استعمال کرنے کا صحیح صحیح طریقہ بتا کر کوشش اور مشق کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب وہ اپنے اوزاروں کو درست طور پر استعمال کرنے لگتا ہے تو پہلے سے زیادہ مشکل کام اُس کو تفویض کئے جاتے ہیں یہاں تک چند سالوں کی کامیاب مشق کے بعد وہ اس فن کے حقائق کو سمجھنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔

ایک مہذب خاندان میں پہلے بچے کو فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اُسے یہ بتایا بھی نہیں جاتا کہ وہ ایسا کیوں کرے اور ایسا کیوں نہ کرے بلکہ اُسے حکم دیا جاتا ہے اور بہت بعد میں جا کر اُسے علم ہوتا ہے کہ اُسے نیکی اور صداقت کی تعلیم کیوں دی گئی تھی۔ کوئی باپ اپنے بچے کو اُس وقت تک اخلاقیات کی غایت نہیں بتائے گا جب تک کہ وہ اُس میں ماں باپ کے لئے اطاعت اور دوسروں کے لئے نیکی کا مادہ پیدا نہ کرے۔

یوں ہی معمولی سے معمولی دنیاوی امور میں بھی عمل ہمیشہ علم پر سبقت رکھتا ہے، اور روحانی امور میں اور اعلیٰ زندگی بسر کرنے میں تو یہ قانون اور بھی شدید قطعیت رکھتا ہے یعنی نیکی صرف عمل سے مل سکتی ہے اور صداقت کا علم صرف نیکی کے ساتھ اپنے نفس کی تکمیل میں حاصل ہوسکتا ہے اور وہ شخص جو نیکی کے حصول اور عمل میں کامل ہوگیا اُس نے حقیقت و صداقت کو پالیا۔

صداقت صرف اس طریق سے حاصل ہوسکتی ہے کہ ہر روز اور ہر گھڑی نیکی کے اسباق کا مطالعہ کیا جائے اور آسان ترین اسباق سے شروع کر کے بتدریج مشکل اسباق پر عبور حاصل کیا جائے جس طرح ایک بچہ مدرسہ کے اندر نہایت صبر اور اطاعت شعاری سے سبق پڑھتا ہے اور مسلسل اور متواتر مشق سے تمام مشکلوں اور ناکامیوں پر غالب آجاتا ہے بالکل اسی طرح صداقت کا علم سیکھنے والا مبتدی بھی ناکامیوں سے بے پروا ہو کر اور مشکلات سے اپنی طاقت کو بڑھا کر اپنے آپ کو خیال اور عمل کی نیکی میں مصروف کردیتا ہے اور جب نیکی کے حصول میں کامیاب ہوجاتا ہے تو اُس کا دل حقیقت اور صداقت کے علم سے معمور ہوجاتا ہے اور یہ وہ علم ہے جس کی موجودگی میں وہ امن و آرام کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔

منصور احمد

" ایلین "

محفلِ ادب

جنگلی پھول

اُف یہ رنگینی و دلآویزی ۔۔۔ اُف یہ رعنائی و جنوں خیزی
اُف یہ نقش و نگارِ زیبائی ۔۔۔ اُف یہ جوشِ بہارِ زیبائی
شوق نے حشر کر دیا دل میں ۔۔۔ سوز ہی سوز بھر دیا دل میں
اُف مرے اضطراب کا عالم ۔۔۔ دل ہے اور ایک لرزشِ پیہم
چاہتا ہوں کہ رازِ حسن کہوں ۔۔۔ ہائے میں اپنے آپ میں کب ہوں
کیا کہوں تو جہاں میں کیا شے ہے ۔۔۔ عقل جاتی رہی مری ہے ہے
ایک تصویر تیرا نقشہ ہے ۔۔۔ دفترِ حُسن کا خلاصہ ہے
اور بھی پھول ہیں جہاں میں بہت ۔۔۔ قدر ہے جن کی گلستاں میں بہت
اُن میں یہ خوبیٔ جمال کہاں ۔۔۔ اُن میں یہ شانِ ذوالجلال کہاں
ماند ہے تجھ سے رونقِ گلزار ۔۔۔ گرد ہے تیرے آگے رنگِ بہار
پھونک ڈالے دل و جگر میرے ۔۔۔ بھر دیئے سینے میں شرر میرے
آہ صبر و قرار کھو بیٹھا ۔۔۔ راحتِ زندگی کو رو بیٹھا
ہے عجب کیف لیکن اس غم میں ۔۔۔ اڑ رہا ہوں میں اور عالم میں
اب یہی جان کی تمنا ہے ۔۔۔ اب یہی روح کا تقاضا ہے
تیرے سائے میں خاک پر بیٹھوں ۔۔۔ دین و دنیا سے بےخبر بیٹھوں
اور سجدے میں ہو جبیں میری ۔۔۔ تر ہو اشکوں سے آستیں میری

"زمانہ"

تعلیم اور ظرافت

بیچارے معلموں کو اپنے پیشہ کی بدولت جو بیماریاں ہو جایا کرتی ہیں اُن میں دماغ کی خشکی بھی ہے۔ آپ خیال تو کیجیے کہ جو شخص

خود روز دس بجے سے چار بجے تک ناک بھوں چڑھائے آنکھیں نکالے نہی عن المنکر کی صورت بنائے بیٹھا ہے۔ اور آدمیوں کے بچوں کو مولویوں کی طرح "صمٌ بکمٌ" بنا کر بٹھائے رکھے، جو نہ خود ہنسے نہ دوسروں کو ہنسنے دے اُس کے دماغ کا کیا حال ہوگا علم خشک کی حالت اصل میں زاہدِ خشک سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ کیونکہ زاہد تو دنیا کی دلچسپیوں کو سائن کمیشن یا بدیسی کپڑا سمجھ کر سرے سے بائیکاٹ کر چکا ہے لیکن معلم ان دلچسپیوں میں رہنے کے باوجود اُن کا لطف اُٹھانے سے محروم ہے۔

معلم میں ظرافت کی کمی اور متانت کی زیادتی سے خود اُس کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے کہیں زیادہ مضر اثر طالب علموں پر پڑتا ہے۔ بچے اور نوجوان جو گھر کا سکھ چین چھوڑ کر زندگی کے کٹھن سفر کی تیاری کے لئے مدرسے میں آتے ہیں۔ انہیں پہلے ہی قدم پر ایک مجسم مارشل لا سے سابقہ پڑے تو اُن کے دل میں ہمیشہ کے لئے ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ جہاں ڈر بیٹھا تو سمجھئے کہ روح کی بالیدگی اور آزاد نشو و نما رخصت ہوئی۔ یہ عمر کھیل اور کام "سادگی و پرکاری بے خودی و ہوشیاری" کی درمیانی منزل ہے اور ان اضداد کی ترکیب جیسی صحیح ظرافت میں ہوتی ہے اور کسی چیز میں ناممکن ہے۔ اگر اس کا استعمال صحیح اور احتیاط کے ساتھ کیا جائے تو نوجوان زندگی کا بوجھ ہنستے کھیلتے اٹھا لیتے ہیں تعلیم کا یہ اہم ترین مسئلہ باتوں باتوں میں حل ہو جاتا ہے۔

جہاں معلم کے لئے یہ جائز نہیں کہ نوجوانوں کو دنیا کی تصویر ضرورت سے زیادہ مہیب دکھائے وہاں یہ بھی دیانت داری اور احتیاط کے خلاف ہے کہ وہ اُن کے سامنے زندگی کو "خالہ جی کے گھر" کی صورت میں پیش کرے۔ یا کسی نیم سرکاری یونیورسٹی کی شکل میں پیش کرے جہاں انسان اصولِ تقویم کے خلاف دن کو عید رات کو شب برات مناتا ہے اور دین و دنیا کی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے۔ ہنسی دل لگی کی زیادتی انسان میں دماغی کاہلی پیدا کرتی ہے۔ وہ زندگی کے اہم مسائل پر غور کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور ہر بات کو مذاق میں ٹالنا چاہتا ہے۔

ظرافت سے پورا تعلیمی فائدہ اُٹھانے کے لئے نیک نیتی بھی ضروری ہے معلم کو اس بات کا پورا احساس ہونا چاہئے کہ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی قوت ہے جسے وہ ایمانداری کے ساتھ طلبہ کی بہبود کے لئے استعمال کرنے پر مجبور ہے محض ذاتی جانبداری یا مخالفت کرنے کے لئے یا محض زودِ طبع آزمانے کے واسطے بچوں کو نشانۂ ظرافت بنانا بڑے کمینہ پن کی بات ہے ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اگر معلم ظرافت سے کام لے تو یقین ہے کہ وہ بچوں کے لئے بہترین رہنما اور رفیق ثابت ہوگا۔ خود سوداوی امراض کمیشن کی شہادت اور کونسل کی ممبری سے محفوظ رہے گا اور اپنے دوستوں کے لئے تفننِ طبع کا باعث ہوگا۔

"تعلیم و تربیت"

ماں اور بچّہ

ماں نے کہا "ننھے بچے تو میری مسرتوں کا خزانہ ہے۔ تو میرے ارمانوں کا گنجینہ ہے"

بچہ ہنسنے لگا۔ اس طرح جیسے گلستاں کی کلیاں ایک ساتھ چٹک گئی ہوں ۔

"ہاں ماں! پھر کہہ۔ میں کیا ہوں؟"

"خوبصورت پھول! تو میری روحانی مسرتوں کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ تو قدرت کی بے نظیر دستکاری کا اعلیٰ نمونہ ہے"

بچہ مسکرایا۔ ایسی مسکراہٹ جیسے یاقوت کی موتیوں سے لبریز ڈبیا کھل گئی ۔

"ماں پھر کہہ میں کیا ہوں؟"

"تو میری دنیاوی محبت کا ثمر ہے۔ خدا کا بیش بہا عطیہ ہے"۔ بچہ خفا ہوگیا "میں یہ نہیں جانتا۔ اور کہہ"

"آہ تو معصوم ہے۔ گُل نوشگفتہ ہے۔ میرے لیئے دنیا میں جنت کا نمونہ ہے۔ میری خوشیاں تجھ سے وابستہ ہیں۔ تو

میری راحت اور سکون کا سامان ہے"۔

بچہ رونے لگا۔ اُس کے پھول جیسے رخساروں پر گوہر اشک ڈھلکنے لگا "میں نہ سنوں گا، مجھے نہیں معلوم"

"میرے لال۔ تو میرا بچہ ہے۔ اللہ نے تیری صورت میری تسکین کے لیئے بنائی ہے مجھے کھیلنے کو ایک چلتا پھرتا اور بولتا

ہُوا کھلونا دیا ہے"

بچہ زور سے ہنس پڑا "ماں ماں میں بھی ایسا ہی کھلونا لوں گا"

"بیشک اے معصومیت و نیکی کی تصویر!! چند روز بعد تو بھی بہت سے کھلونوں کا مالک ہوگا۔ لیکن میں اُس وقت

کیا ہونگی؟ ایک کمر خمیدہ بڑھیا۔ دھوپ جیسے سفید بالوں والی۔ ننھے میں درخت ہوں اور تو ابھی پودا ہے۔ چند روز بعد تو

ثمردار شجر ہوگا اور موت میری جڑ اکھاڑ دے گی"

بچہ زور سے اچھل پڑا "ماں موت کیا ہے؟ میں اُسے نہ آنے دوں گا!"

"میرے ننھے سیدھے راستہ پر چل۔ خوش رہ۔ نیکی کر۔ لطف و محبت سے ہر انسان کے ساتھ پیش آ۔ میں پھر نہ مروں گی"

"عصمت"

موسمِ بہار کے پردہ میں کون ہے؟

موسمِ بہار آیا، راحت و انبساط کا پیغام لے کر آیا، لوگ موسمِ بہار کی رنگینیوں کو دیکھ رہے ہیں، میں موسمِ بہار میں رنگ بھرنے والے کی تلاش میں ہوں، تیتریوں کو یہ خوبصورتی کس نے دی، پھولوں میں یہ رنگ کس نے بھرا غنچوں کو یہ دل کشی کس نے عطا کی، لوگوں کے دلوں میں یہ مسرت کی لہر کس نے دوڑائی،

خوبصورت عورتیں سمندر کے ساحل پر تیتریوں کی طرح رنگ برنگ کا لباس پہنے ہوئے، اپنے دوستوں کے ساتھ موسمِ بہار کا لطف

اٹھا رہی ہیں، لیکن میں موسم بہار سے لطف اٹھانے والوں کی امنگوں کا مطالعہ کر رہا ہوں کہ یہ امنگیں کس نے پیدا کیں، اور یہ روح پرور نظارے کس نے عطا کئے،

یہ ایک مخفی طاقت ہے، یہ ایک پوشیدہ قوت ہے، اگر اس قوت کا مشاہدہ کرنے میں ہم کامیاب ہو جائیں تو دنیا کی ساری مسرتیں اور ساری بہاریں ہمیں خزاں نظر آنے لگیں، اور حقیقی اور سچی راحت ہمیں میسر آ جائے۔

اِنسانی زندگی کی رُوح

دولت مند دولت کو راحت سمجھتے ہیں، عیش پرست عیش کو زندگی کی روح بتاتے ہیں، لیکن زندگی کی روح ضمیر کی وہ آواز ہے جو انسان کی ہمیشہ راستی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، جب انسان تاریکیوں میں بھٹکتا ہے جب انسان گناہ میں پھنس جاتا ہے، جب انسان اخلاقی جرائم کا مرتکب ہوتا ہے، جب انسان دیانت کو چھوڑتا ہے تو یہ خاموش آواز اُسے ہدایت کرتی ہے کہ اے تاریکی کی طرف جانے والے سنبھل جا، اے گناہ کی وادی میں تباہ ہونے والے ہوش میں آ، اے اخلاقی جرائم کے مرتکب اپنے فرائض کو پہچان، اے بددیانتی کے تمنائی دیانت کی خوبصورت دیوی تجھ پر لعنت کر رہی ہے بیدار ہو، لیکن جب انسان آواز کی طرف رخ نہیں کرتا تو اُس کی زندگی کی روح مر جاتی ہے،

تمہاری زندگی کی روح تمہارا ضمیر ہے، اگر تم نے اُس کی آواز پر توجہ نہ کی تو تمہارا ہونا نہ ہونا بیکار ہے۔

"طور"

رام کا رتھ

راون کو کل سامانِ جنگ کے ساتھ رتھ پر سوار ایک طرف اور اُس کے مقابلہ کے لئے پیادہ پا رام کو دوسری طرف دیکھ کر بھیکن جیسے راسخ الاعتقاد اور وفادار بھگت کا دل بھی دہل گیا۔ وہ مہاراج رامچندر سے سوال کرتا ہے کہ مہاراج! فتح کیسے ہوگی؟ ہاتھے کیا روحانیت اور اخلاقی تہذیب پیروں سے کچلی جانے ہی کے لئے بنی ہے؟ اس موقع پر مہاراج رام فرماتے ہیں کہ فتح کے لئے جو رتھ ہے اُس کے اجزا کی تفصیل اے بھیکن سنو۔

بہادری اور استقلال جس رتھ کے پہیے ہیں، مضبوط سچائی اور محبت جس کے جھنڈے اور پھریرے ہیں۔

طاقت، تمیز، نفس کشی اور پراوپکار، یہ چار گھوڑے عفو، رحم و مساوات کے باگ ڈور سے اس رتھ میں جتے ہوئے ہیں۔

ایشور کا بھجن اُس رتھ کا چلانے والا ہے اُس کی ڈھال بیراگ اور تلوار قناعت ہے۔

فیاضی اُس کا پھرسا اور عقلِ سلیم شکتی بان ہے اور افضل ترین علم اُس کی مضبوط کمان ہے۔

پاک اور مستقل طبیعت جس کا ترکش ہے اور سنجم (اصولِ اخلاقِ ذاتی) اور نیم (اصولِ اخلاقِ تمدنی) ... نعمت بجز سے برہمن کی خلوص دل سے پرستش ہے، اُس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا ذریعہ فتح کا نہیں ہے۔

تبصرہ

اسلامی کہانیاں۔ مرتبہ جناب اسلام صاحب فضلی بی اے۔ بی ٹی۔ اس کتاب میں تاریخ اسلام کا خلاصہ نہایت آسان اور دلچسپ پیرایہ میں درج کیا گیا ہے۔ چھوٹے بچوں کو دینی روایات سے واقف کرانے کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ حجم ۹۰ صفحات، قیمت ۸ آنے ہے۔

پھولوں کی ڈالی۔ مرتبہ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی۔ رسالہ کا مات نصیحت آمیز آسان اور سلیس نظموں کا خوبصورت مجموعہ، جو مذہب و ملت کے بچوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ حجم ۳۰ صفحے، قیمت چار آنے ہے۔

جنت کے پھول۔ چھوٹی تقطیع پر ۵۰ صفحے کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں تبلیغی نظمیں درج کی گئی ہیں۔ جوش عمل پیدا کرنے کے لئے مفید ہے۔ قیمت ۲ پیسے۔ ملنے کا پتہ ۔۔۔ مالی بک ڈپو پانی پت سے طلب فرمائیے۔

یورپین شعرائے اردو۔ اس کتاب میں انگریزی، فرانسیسی اور پرتگیزی شعرائے اردو کے صحیح مختصر حالات اور ان کے منتخب اردو کلام کے نمونے پیش کئے ہیں۔ یہ اپنی قسم کا پہلا تذکرہ ہے۔ حجم ۸۰ صفحے اور قیمت آٹھ آنے ہے۔

تذکرہ شعرائے اورنگ آباد۔ جب اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اس نے اورنگ آباد کو اپنا مرکز حکومت قرار دیا۔ اس سے اورنگ آباد علوم و فنون کا مرکز بن گیا اور وہاں بڑے بڑے نامور شعرا پیدا ہوئے۔ اس مختصر تذکرے میں ان کے حالات اور منتخب کلام درج ہے۔ حجم ۸۰ صفحے اور قیمت ۶ آنے ہے۔ دونوں کتابیں کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد دکن سے ملتی ہیں۔

بلقیس ۴۸ صفحے کا ایک دردناک و نتیجہ خیز افسانہ ہے جس کے مصنف سید محمد رشید الملک صاحب ہیں۔ انداز تحریر مؤثر اور دلکش ہے۔ قیمت چار آنے ہے۔ مینیجر بلیغ آباد گزٹ، مقام فتح پور (ہسوہ)

آئینۂ حساب حصہ اول و دوم۔ ان دو کتابوں میں گنتی، پہاڑوں اور پیمانوں کو شکلوں اور نقشوں کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ بچوں کے لئے یہ کتابیں نہایت مفید ہیں۔ ابتدائی حساب کی تعلیم ان میں ایسے طریقہ سے دی ہے کہ نہایت آسانی سے ہر بات ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ زین الدین بنگڑی والا۔ دادر مارکٹ ۱۴ بمبئی۔

کامل صابون ساز۔ صابون سازی ایک کارآمد فن ہے۔ اس کتاب میں دیسی انگریزی اور دوا والے صابون بنانے کے سہل اور آسان نسخے دئے ہیں۔ حجم ۴۲ صفحے ہے۔ مجلد کتاب کی قیمت پانچ آنے مقرر ہے۔ کامل بک ڈپو ۔۔۔ سے مل سکتی ہے۔

عصمت کا جوبلی نمبر

اُردو رسائل میں نظیر نہیں نکل سکتی

ہندوستان کے مشہور زنانہ رسالہ عصمت کا جوبلی نمبر شائع ہو چکا ہے اور مذاق سلیم رکھنے والے ہر شخص نے تسلیم کر لیا ہے کہ مضامین تصاویر اور کارٹونز سے چھپائی ضخامت غرض کسی اعتبار سے عصمت جوبلی نمبر سے بہتر خاص نمبر آج تک اردو زبان میں شائع نہیں ہوا۔

مضامین عام اشاعتوں سے قریباً دوگنے سائز کے ڈیڑھ سو صفحوں سے بھی زیادہ پر صرف مضامین ہیں (ٹائٹل تصاویر اشتہارات کے صفحات انکے علاوہ ہیں) اور یہ مضامین ہندوستان کے چوٹی کے لکھنے والے مردوں عورتوں کے بہترین مضامین ہیں۔ جو نہایت قابلیت سے مرتب کیے گئے ہیں جنہیں ۴۴ بے نظیر مضامین حضرت علامہ راشد الخیری کے ہیں ۲ بے مثل مضامین پروفیسر ستار خیری نے جرمنی سے بھیجے ہیں۔

تصاویر ہاف ٹون بلاک کی ۶۰ تصویریں ہیں ۶ بے نظیر رنگین اور ۵۴ سادہ جن میں ۱۲ بلاک جرمنی میں طیار ہوئے ہیں اور سقدر دلاویز تصویریں ہیں کہ آپ دیکھ کر پھڑک اٹھیں گے۔ یقیناً کسی ہندوستانی رسالہ میں اس پایہ کی اعلیٰ تصاویر نہیں چھپیں نصف کے قریب رسالہ رنگین چھپا ہے ٹائٹل پیج ۳ رنگین خوبصورت بلاک کا ہے ہندوستانی رسالے تو الگ رہے اکثر اعتبار سے

عصمت جوبلی نمبر انگریزی رسائل پر بھی فوقیت رکھتا ہے

آپ نے اگر نہ دیکھا تو ہمیشہ آپ کو افسوس رہے گا قیمت صرف ۱۲؁ ہے علاوہ محصولڈاک لیکن عصمت کے مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ ہی میں ملیگا۔ سالانہ چندہ صرف ۴؁ ۸؁ قسم دوم ۳؁ روپے مع محصول ڈاک ہے۔

بنات مسلمان لڑکیوں کے لیے خالص مذہبی رسالہ علامہ راشد الخیری کی نگرانی میں تربیت گاہ بنات دہلی سے کامیابی سے شائع ہو رہا ہے سالانہ چندہ، ایک روپیہ گیارہ آنے (۱۱؍ ۱؁) نمونہ مفت

مینیجر عصمت و بنات دہلی

۹۰ فیصدی اشرف المخلوقات کی دائمی تکالیف کا قلع قمع

قبض اور بدہضمی جو تمام امراض کے منبع ہیں، تقریباً ۹۰ فی صدی انسان ان سے نالاں ہیں طرح طرح کی تدابیر کرتے ہوئے بھی پوری صحت حاصل نہیں کر سکتے بلکہ دیگر امراض کے شکار بن جاتے ہیں ایسے کے لئے ہماری تیار کردہ مشہور عالم آتنگ نگرہ گولیاں عجیبی امداد ہیں گولیاں قبض دائمی کو دور کر کے معدہ کو مضبوط بناتی ہیں، قوت ہاضمہ کو تیز کر کے خوراک اچھی طرح ہضم کر کے خون صالح پیدا کر کے اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی بخشتی ہیں، عورتوں اور مردوں کے امراض کے شرطیہ علاج ہیں، لاکھوں اشخاص مستفید ہو کر صحت حاصل کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں، ایک دفعہ ضرور تجربہ کریں، قیمت فی ڈبیہ ۱۶ روز کے لئے صرف ایک روپیہ، پانچ ڈبیہ صرف چار روپے للعہ

امرتار نوا ہمہ یعنی آبِ حیات نحیف الاجسام ضعیف الدماغ و قوے کے لئے امرتار نوا ہمہ بہ صفت موصوف ہے جسم کو معقول فربہی و دیگر دماغ اور دل کو فرحت بخشتا ہے قبل از وقت کی ضعیفی کو دور کر کے قوی الجسم بنا دیتا ہے، قوی آیورویدک دوا کا مرکب ہے اور نہایت لذیذ مزیدار صبح بطور ناشتہ ایک تولہ استعمال کر سکتے ہیں، قیمت فی ڈبیہ صرف دو روپیہ عہ

وید شاستری منی شنکر گووندجی جام نگر کاٹھیاواڑ

علیا حضرت ملکہ ثریا خانم افغانستان کی فرمائش

اگر پردہ کی نوعیت تبدیل نہ ہوگی تو زمانہ پردہ قطعی اٹھا دے گا۔ قومی ترقی کی غرض سے پردہ میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ محافظ کامل ہونے کے باوجود تعلیم و امور زندگی میں مانع ہو۔ ہمارا

برقعہ نو ایجاد

اس فرمان کی تعمیل ہے جس کی علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی پسندیدگی کے بعد تمام ہندوستان کی ممتاز اور شریف خواتین نے سرپرستی فرمائی ہے۔

آپ کے ہاں اگر ابھی تک اس برقعہ کو دخل نہیں تو ہماری استدعا پر ایک برقعہ ضرور منگائیں۔

پھر اگر گھر کی عزیز خاتون کے لئے علیحدہ علیحدہ نہ منگائیں تو ہمارا ذمہ۔

اگر پسند نہ آئے تو دو دن کے اندر واپس

ناپ کندھے سے پیر کے ٹخنے تک لمبان۔ سر کی گولائی روانہ کردیں۔ سفید کالٹھ + رنگین ساٹن اٹلین + ٹسر سلک + چینی ریشم

40/ 35/ + 25/ + 18/ 20/ + 10/ + 12/

خاتون اسٹورز۔ دریا گنج نمبر ۱۲ دہلی

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی، ادبی، تمدنی اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍ نمونہ ۶؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیے۔

مینجر رسالہ ہمایوں

۳۲۔ لارنس روڈ۔ لاہور

منشی محمد ال[illegible] ... بابو جی گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

بابتہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ہمایوں

بیادگار علامہ فیضی آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر - بشیر احمد - بی - اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر
حامد علی خاں - بی - اے
منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۴

بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۲۸ء

تصویر:- روحوں کی کشتی

جہاں نما

ایران

سردار اقبال علی شاہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے مشرقی اسلامی ممالک کی سیاحت کے سلسلہ میں تقریباً چالیس ہزار میل کی مسافت طے کی ہے۔ اخبار "مارننگ پوسٹ" میں "مستقبل اسلام" کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں ایران کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:۔

"موجودہ اسلام کی کوئی کہانی اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہم اُن کوائف و حالات کا مطالعہ نہ کریں جو ایران اور افغانستان میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ترکی اور عرب کی طرح یہاں بھی وہ یک داغی کوششیں نمایاں طور پر نظر آرہی ہیں جو وہاں کے بادشاہوں کے کام کو ممتاز کرتی ہیں۔ رضا شاہ پہلوی اور امان اللہ خاں دونوں ترکی کی بیداری کی تقلید کر رہے ہیں۔ دونوں انگورہ کے قومی رہنما کی طرح سمجھتے ہیں کہ مغربی اقتصادی دباؤ کا مقابلہ منظم اعتلاد ارتقا ہی سے ہوگا اور اُس کے لئے محض یورپی طور طریقوں کا اختیار کرنا کافی نہیں۔

پہلوی ٹوپی جس کا پہننا ہر ایرانی اہلکار کے لئے ضروری ہے، فرانسیسی فوجی ٹوپی سے مشابہ ہے اور اُن کا لباس ہندوستانی سوار فوج کے لباس سے ملتا جلتا ہے لیکن حیران کن یہ بات ہے کہ جب ایک افسر بولتا ہے تو حافظ یا عمر خیام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بولتا ہے میں نے اس لئے کہا کہ میں نے کبھی کسی ایرانی کو چلاتے نہیں سنا، یہاں تک کہ قواعد کرانے والا تند و تیز سارجنٹ بھی آہستہ بولتا ہے۔

فوجی ساز و سامان میں جدید ترین قسم کی بندوقیں، توپیں بلکہ ٹینک تک اُن کے پاس موجود ہیں اور طہران کے میدانِ سپاہ میں آپ ہر روز اُن کے دستے اور ٹولیاں دیکھ سکتے ہیں لیکن فوجی اکھڑپن آپ اُن میں نہ پائیں گے۔ ایک دن دو سپاہی بھنے ہوئے چنے اور سوکھے ہوئے پھل خرید رہے تھے اور اُن کے قریب ہی میں قواعد میدان کی تصویر اتار رہا تھا۔ ایک نے اُن میں سے پوچھا "اِن تصویروں کو تم کیا کرتے ہو؟" دوسرے سپاہی نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ تصویریں یورپ جائیں گی۔" پھر یہ دونوں اپنا من بھاتا کھاجا اڑاتے ہوئے مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اُسی وقت ایک موٹر آندھی کی طرح اڑتی ہوئی ہمارے پاس سے گزر گئی اور ہر سپاہی کو تعظیم کی طرف متوجہ کرتی گئی۔ یہ اُن کا بادشاہ تھا جو غیر متوقع طور پر کسی شعبہ کا معائنہ کرنے کے لئے جا رہا تھا۔

شام کے قریب پولیس کے ایک سپاہی سے جو چوک میں ایک چھوٹی سی چھتری کے نیچے کھڑا گاڑیوں کی آمد و رفت

کی رہنمائی کررہا تھا۔ میں نے سینما کا پتہ دریافت کیا۔ وہ میرے ساتھ ہولیا —" روسی سینما یہ ہے" کہہ کر اُس نے مجھے جھک کر سلام کیا اور خود اُس ہجوم میں مل گیا جس میں مردوں کے علاوہ نقاب پوش عورتیں بھی شامل تھیں۔ میں اُن فلموں کو دیکھنے لگا جو ماسکو کے ہوائی راستوں کے ذریعہ سے ایران میں لائی گئی تھیں۔ ایک ترجمان پردے پر آنے والے الفاظ کا ترجمہ کرتا جاتا تھا، لیکن ناظرین بڑے بڑے جوش آور نظاروں کو دیکھ کر بھی ایسی دلچسپی کا اظہار نہ کرتے تھے جس سے شور و غوغا پیدا ہو۔ شاید ایسا کرنا ایرانی متانت کے خلاف تھا۔

کچھ دیر کے بعد پردے کے پیچھے سے زنانہ آواز میں ایک فارسی نغمہ سنائی دیا۔ حاضرین پر کامل سکوت طاری ہوگیا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک نوجوان ایرانی نے مجھ سے کہا "یہ یہودی عورت اچھا گاتی ہے لیکن میری بہن کی آواز اس سے بھی اچھی ہے مگر وہ صرف بہار کے دنوں میں کبھی کبھی اپنے باغ میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے سامنے گاتی ہے۔" میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ سچ ہے کہ تجدید کی لہر ایران میں پہنچ گئی ہے مگر ایرانیوں نے مغرب اور مشرق کے امتزاج سے ایک ایسی فضا پیدا کرلی ہے جو اُن کے ملک کے لئے موزون و مناسب ہے۔ ہاں، اسلام کی صورت بدل رہی ہے مگر اُس کا قلب کبھی نہ بدلے گا۔

دوسری رات میں مسجدِ سپہ سالار میں تھا جو ایرانی پارلیمنٹ کی عمارت سے متصل واقع ہے۔ اجتماع کثیر تھا کیونکہ ایک اعلیٰ درجہ کے مجتہد جنگِ شہدا کے متعلق صحیح معلومات سے مؤمنین کو مستفیض کرنے والے تھے۔ جب مجلس گرما گئی تو واعظ نے کہا "ان سب باتوں کو اب گذرا ہوا سمجھو۔ اب وہ وقت ہے کہ ہم اتحاد اور یک جہتی میں ایک دوسرے سے پیوست ہوجائیں اور اسلام کے اُس مقصد کو سمجھیں جو پیغمبرِ اسلام کے پیشِ نظر تھا۔" اتحادِ بین المسلمین کی تحریک ایک مرتبہ پھر میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بجلی کے قمقموں کی روشنی ماند پڑ گئی یہاں تک کہ اُن میں محض ایک جھلک سی باقی رہ گئی۔ ہم سب منتشر ہوگئے اور اپنے اپنے راستے پر پڑ لئے۔ لوگ کہتے تھے کہ روشنی اس لئے گھٹا دی گئی ہے کہ بادشاہ خود شہر کو دیکھنے نکلے ہیں۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے بتیاں پھر روشن ہوگئیں۔ دورِ حاضر کا نوشیرواں اپنا دورہ ختم کرچکا تھا۔"

ترکی میں لاطینی رسم الخط کا رواج

جاپان کی طرح ترکی میں بھی کچھ مدت سے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی تحریک ہو رہی تھی چنانچہ اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کا دفتر پہلے انگورہ میں تھا، لیکن پھر قسطنطنیہ میں تبدیل کردیا گیا، تاکہ کمیٹی کے ارکان کو وزیرِ معارف اور صدرِ جمہوریہ سے مشورہ لینے میں آسانی ہو۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ترکی حکومت کے بعض صیغوں میں لاطینی رسم الخط کا استعمال شروع ہوگیا ہے اور جہازراں کمپنیوں نے جہازوں کے نام اسی رسم الخط میں

لکھنے شروع کر دیتے ہیں۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا اس مسئلہ پر خاص توجہ صرف کرتے ہیں۔ کاظم پاشا رئیس مجلس وطنی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ "پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں رسم الخط کا مسئلہ زبردست اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ تمام لوگوں کو اس کی سخت ضرورت ہے اور ترکی قوم کی داخلی اصلاح پر بھی اس کا نمایاں اثر پڑے گا۔ عربی رسم الخط کی تعقیدات ذہن میں مشکل سے آتی ہیں اور یہ ترکوں کے جاہل رہ جانے کا ایک بہت بڑا سبب ثابت ہوا ہے چونکہ جدید رسم الخط میں تعقیدات بہت کم ہیں اس لئے اس کے رواج سے عام جہالت ایک حد تک جاتی رہے گی۔"

کمیٹی نے کل بائیس حروف بجا مقرر کئے ہیں ۱۷ اور ۵ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ حروف متحرکہ آٹھ ہونگے اس لئے کہ O اور U میں سے ہر ایک کی دو آوازیں ہیں جن کا امتیاز دو فوقانی نقطوں سے ہوا کریگا جیسا کہ جرمن رسم الخط میں رواج ہے۔ جدید رسم الخط کی ترویج سے عام لوگ نیک شگون لے رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے متعلمین کی تعداد میں بھی معتد بہ اضافہ ہوگا۔

تصنیف کا مقصد

مشہور و معروف ادیب مسٹر آرنلڈ بینٹ کے متعلق اُن کے ایک ہم عصر ڈرامانویس (جو اپنے فن میں انتہا درجہ کامیاب بھی ہیں) کہتے ہیں کہ ایک دن آرنلڈ بینٹ کے پاس ایک متین و سنجیدہ نوجوان امریکن آیا اور اُس نے دریافت کیا:

"مسٹر بینٹ جب آپ لکھتے ہیں تو اُس وقت آپ کے سامنے کون سی چیز ہوتی ہے؟"

مسٹر بینٹ نے جواب دیا "روپیہ"

نوجوان امریکن نے کہا: "نہیں، نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کسی بڑی معرکۃ الآرا تصنیف میں مشغول ہوتے ہیں تو اُس وقت آپ کے خیال میں کونسی چیز ہوتی ہے؟

بینٹ نے پھر اُسی متانت سے کہا۔ "روپیہ"

جب وہ امریکن نوجوان جا چکا تو وہ کامیاب ڈرامانویس صاحب جنہیں اب اس معاملہ سے خود بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی آگے بڑھے اور جیسے ایک نامی آدمی دوسرے نامی آدمی سے کوئی امر دریافت کرتا ہے حقیقت معلوم کرنے کی امید میں بینٹ سے کہنے لگے!

"بینٹ سچ سچ بتاؤ جب تم ایک بلند پایہ تصنیف میں مصروف ہوتے ہو اُس وقت تمہارے دل میں کس چیز کا خیال ہوتا ہے؟"

مسٹر بینیٹ نے جھک کر اُن کے کان میں نہایت رازداری کے لہجہ میں کہا: "سموپے کا"

خون کی تجارت

دیانا میں انسانی خون کی فروخت کا مقابلہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب ایک لیٹر (۱/۴ ۴ لیٹر - ایک گیلن) خون کی قیمت صرف پچاس آسٹرین شلنگ رہ گئی ہے۔

یہ خون ایک شخص کے جسم سے نکال کر دوسرے کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ ویانا میں یہ عمل اس قدر رواج پا گیا ہے کہ وہاں اس نے ایک باقاعدہ تجارت کی صورت اختیار کر لی ہے اور بعض لوگوں کا تو گزارا ہی اب اپنے خون کی فروخت پر رہ گیا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ بارہ بارہ چودہ چودہ مرتبہ اپنا خون نکلوا چکے ہیں۔ ایک شخص نے سولہ مرتبہ اپنا خون فروخت کیا۔ ایلس برگ تقسیم خون کا مرکز ہے۔ خون بیچنے والے اس جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور یہاں سے مختلف ہسپتالوں میں حسبِ ضرورت بھیج دیئے جاتے ہیں۔

عسرت زدوں کے لیئے خون کی تجارت دراصل آخری امن ہے۔ تقریباً چودہ مرتبہ خون نکلوانے کے بعد وہ اپنے آپ کو بے زور اور بے زر پاتے ہیں اور زندگی کی جدوجہد کی قابلیت اُن کے دست و بازو سے مفقود ہو جاتی ہے۔

اُن مریضوں کے نام جن کی جانیں ایسے لوگوں کے خون سے بچائی جاتی ہیں پوشیدہ رکھے جاتے ہیں تاکہ خون فروش آئندہ کبھی اُن کے سامنے دست سوال دراز نہ کریں۔ اس طرح اُن کا احسان شخصی طور پر انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

حال ہی میں خون فروشوں نے ایک انجمن قائم کرنے کی تجویز کی تھی تاکہ اُن کے خون کی قیمت بڑھ سکے لیکن یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی اور خون کی تجارت اب تک غیر منظم دوکانداری کے اصول پر ہو رہی ہے۔

رُوحوں کی کشتی کے ناخدا سے خطاب

لئے جا رہا ہے ہمیں تُو عدم کو
مگر شک نہیں اِس حقیقت میں ہم کو

کہ باطل ہے معدوم ہونا ہمارا
عدم کا خرابہ ہی آباد ہوگا

ہر اِک گھر کے بننے کو اِک کا اُجڑنا
اور اِک شے کے بننے کو اِک کا بگڑنا

سراسر یہ آئین ترا ناروا ہے
یہ دنیا ہے یا کھیل بچّوں کا؟ کیا ہے؟

ابھی نیست سے ہست میں آ رہے ہیں
ابھی ہست سے نیست میں جا رہے ہیں

نہ مرنے کی فرصت نہ جینے کی مہلت
نہ ہنگامِ آمد، نہ آہنگِ رخصت

بسانی ہے تجھ کو اگر کوئی بستی
فضا جس کی ہے زندگی کو ترستی

اور اُس کا بسانا ہے دشوار تجھ کو
جو ہے عجزِ قدرت کا اقرار تجھ کو

تو اک اور آدم کو اُس میں بسا دے
جو اُس دشت کو بھی گلستاں بنا دے

حامد علی خاں

ازدوں کی کشتی

CALCUTTA
ART PR. WORKS
LAHORE

سرمایۂ مشترک

قومیت کا سنگِ بنیاد۔ سیاسیات کا یہ مسلمہ مسئلہ کہ اتحادِ زبان قومیت کا پیشرو ہے مزید بحث و تمحیص کا محتاج نہیں۔ صاف بات ہے کہ جب تک کسی ملک کی زبان ایک نہ ہو اُس کے باشندے قوم کہلانے کے حقدار نہیں ہوتے۔ چند ایسے شخص جن کی زبانیں مختلف ہوں ایک جگہ جمع ہو جائیں مگر کوئی مشترک زبان نہ جانتے ہوں تو وہ اپنا مافی الضمیر بوضاحت ایک دوسرے پر ظاہر نہیں کر سکتے اور اُن کی اس خاموش ملاقات سے کوئی موانستِ باہمی پیدا نہیں ہوتی۔ تبادلۂ خیالات کا فقدان جس طرح انفرادی طور پر ربط ضبط کے خلاف ہے اُسی طرح قومیت کے نشوونما کے منافی ہے۔ اس سوال پر نفسیاتی پہلو سے نگاہ ڈالیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اتحادِ زبان نردبان ہے اتحادِ ذہنی کی اور اتحادِ ذہنی پیش خیمہ ہے اتحادِ عمل کا اور اتحادِ عمل معراجِ قومیت ہے۔ جب زبان اس طرح ایک قوم کے سرمایۂ مشترک کی صُورت اختیار کرلے اور یہ دھارا چل پڑے تو فروعی اختلافات کی پایاب ندیاں آپ سے آپ اس میں آملتی ہیں، اور جملہ منافقانہ تحریکیں بلامنتِ تدبیر اپنی موت آپ مرجاتی ہیں۔ پس جو لوگ قوم یا ملت بننا چاہیں اُن کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ بیک زبان زبان کے سرمایۂ مشترک ہونے کو تسلیم کریں۔ ایسی زبان کو جو اتحادِ اقوام کی شیرازہ بندی میں حبل المتین کا کام دے قومی یا ملکی زبان کہتے ہیں۔

قومی زبان۔ ہندوستان ماشاء اللہ اس قدر وسیع اور آباد ملک ہے کہ اس میں ایک برّاعظم کی بیشتر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مذاہب والسنہ کے تنوع کو چھوڑ کر بولیوں کا یہ عالم ہے کہ ہر صُوبہ بجائے خود بابل بن رہا ہے جس سے صاف نظر آتا ہے کہ ان لوگوں کے دل و دماغ ایک روش پر چل رہے ہیں۔ اس ذہنی افتراق کے انسداد کی یہی سبیل ہے کہ زبانوں اور بولیوں کی کثرت کو وحدت میں تبدیل کیا جائے اور ہندوستان کی کسی موزوں زبان کو قومی زبان قرار دیا جائے تاکہ یہ غرضِ مشترک سب کو ایک ذہنی سطح پر لے آئے۔ اس انتخاب میں زیادہ جھنجھٹ کی ضرورت نہیں۔ بس وہ زبان اٹھا لیجئے جو سب زبانوں سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ اس بارے میں مردم شماری کی رپورٹ یہ شہادت دیتی ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ وہ بولی سمجھی جاتی ہے جو ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد اور فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ اُسے ہندوی ریختہ، دہلوی، اردو، ہندوستانی یا ہندی

کسی نام سے موسوم کرو، فارسی دیوناگری یا رومن کیرکٹر میں لکھو، مگر زبان وہی ہے جسے عرف عام میں اردو کہتے ہیں اور موجودہ پنجابی، دکھنی، ملتانی، سندھی، اور ہندی اُس کی ابتدائی شکلیں ہیں۔

دوسری منزل :- مگر مردم شماری کی یہ سند کافی نہیں اور اُردو کو قومی زبان بنانے میں ابھی بہت سی مشکلوں کے پہاڑ کاٹنے ہیں۔ مغائرت کے اسباب کو ملیامیٹ کرنا، مشکلاتِ تحصیل کو حل کرنا، زبان کو اس قابل بنانا کہ وہ علوم و فنونِ جدیدہ کا لنگر سنبھال سکے اور اسی قسم کے ترددہیں جنہیں کئے بغیر یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ، مرکزِ اردو کی تخصیص، اردو ہندی کا قضیہ، شیخ و برہمن کی منافرت، صرف و نحو کی پیچیدگیاں گو محض سطحی خرخشے ہیں اور محبت و رواداری کے دریا کے سامنے خس و خاشاک سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے مگر ہٹ دھرمی ضد اور تمنائے استبداد نے ان رائی کے دانوں کو پربت بنا رکھا ہے۔ جب تک ان کا تدارک نہ ہو جائے اور ازمنۂ ماضیہ کی طرح آج بھی ہندو اور مسلمان اردو کو اپنی مادری زبان اور سرمایۂ مشترک نہ خیال کریں اردو ہندوستان کی قومی زبان نہیں بن سکتی۔

ہم اِن امور پر محض اِس لئے اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ وہ حضرات جو اس میدان کے مرد ہیں توجہ گرامی مبذول فرمائیں اور اپنے ناخنِ تدبیر سے اس عقدہ کو حل کر دیں ورنہ اس ضمن میں اپنا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے ہمارے لئے اتنا ہی بس ہے کہ ہم نے اِن امور کو معرضِ بحث میں لانے کی جسارت کی۔

اہلِ زبان :- اہلِ زبان کہلانے کا خبط کوئی نئی بات نہیں محض اہلِ فارسی کی تقلید ہے۔ عرب ایرانیوں کو عجمی کہتے تھے۔ ایرانی شعرائے ہند کو "پوچ گویاں" کے نام سے یاد فرماتے تھے۔ ایرانیوں پر بس نہ چلا تو ہند کے مسلمان ہندوادبائے فارسی کی زبان کے متعلق "بوئے کچوری مے آید" کہہ کر دل کی بھڑاس نکالنے لگے جب دہلی میں اردو کا چرچا ہؤا تو اہلِ دہلی نے اپنے اہلِ زبان ہونے کا اعلان کر کے، اور لئے سکّانِ دہلی ہر جگہ کے باشندوں کو غیر اہلِ زبان یا بے زبان قرار دیا۔ حتیٰ کہ لکھنؤ بایں ادعائے زبان اس لپیٹ میں آگیا درحالیکہ خود دہلی کا اردوئے معلّٰی لکھنؤ میں اس انداز سے منتقل ہؤا تھا کہ بقول علامہ طباطبائی خود "دتی گوش بر آواز لکھنؤ ہو گئی۔ شرح غالب صفحہ ۱۵۸" لکھنؤ کے لئے اِس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ دہلی کی سیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ چنانچہ لکھنؤ میں زبان کا جدید سکول قائم ہو گیا۔ اسی طرح جب پنجاب کی باری آئی تو اُس نے بھی حلقۂ غلامی اتار پھینکا۔ اور اہلِ زبان اُس شخص کا نام رکھا جو خدمتِ زبان کی اہلیت رکھے۔ جو خواہ کوئی ہو کہیں کا رہنے والا ہو۔ زبان کی عمدگی کا معیار مکان کی بجائے عمل کو قرار دیا گیا۔ مذہب و ملت اور رنگ و مسکنت کے حجاب دور کر دیئے گئے

اگرچہ صاحب فرہنگِ آصفیہ (جلد اول صفحہ ۲۳) اہلِ زبان کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ اہلِ زبان اُس شخص کو کہتے ہیں جس کی زبان دانی مسلم الثبوت ہو" لیکن اکثر اہلِ دہلی ہنوز اس بات پر اڑے بیٹھے ہیں کہ صرف اہلِ دہلی ہی اہلِ زبان اور اردو کے واحد وارث ہیں۔ چنانچہ صاحبِ تسہیل البلاغت صفحہ ۱۵ میں فرماتے ہیں "دہلی کا ہر چھوٹا بڑا عالم ہو یا جاہل، شریف ہو یا رذیل اہلِ زبان ہے" اس سے پہلے بھی ایک صاحب "نصرت الاخبار" دہلی مورخہ ۱۱۔اپریل ۱۸۷۸ء میں لکھ گئے ہیں" دہلی میں درباری اور بازاری زبان ایک ہے" یعنی ہر کس و ناکس جو دہلی وال ہو اہلِ زبان ہے۔ اور دربارِ ادب میں چھدامی بھٹیارا داغ کے برابر کرسی کا مستحق ہے۔ یہ دعویٰ اتنا بلند ہے کہ کچھ کہنے کی جرات نہیں پڑتی مگر دریائے لطافت میں سید انشائے دہلوی اس کا ساکت و صامت جواب بار بار دے گئے ہیں:۔

"ازراہِ حماقت فصاحت و بلاغت را مقید کردہ اند بتولدِ شخص در شاہجہان آباد۔ و نمیدانند کہ منبع فصاحت و معدنِ بلاغت کہ زبانِ شاں مشہور بر اردوست سوائے بادشاہِ ہندوستان کہ تاجِ فصاحت بر سرِ امے زیبد چند امیر و مصاحب شاں و چند زنِ قابل از قسمِ بیگم و خانم و کسبی ہستند ہر لفظے کہ در اینہا استعمال یافت زبانِ اردو باشد نہ ایں کہ ہر کس کہ در شاہجہان آباد باشد ہرچہ گفتگو کند معتبر باشد صفحہ ۲۶ "فصاحت در دلی نصیبِ ہر کس نیست صفحہ ۲۲" فصاحت بر تولدِ کسے در شاہجہان آباد نیست صفحہ ۲۳" دریائے لطافت کے ان مندرجات کے بین السطور سے عیاں ہے کہ اُس زمانے میں بھی دہلی کی طرف سے اس قسم کے دعاوی ہوتے تھے جنہیں خود دہلی کے فصحا لغو سمجھتے تھے۔ اُس زمانے میں جن کے دم سے چراغِ فصاحت بقولِ انشا دہلی میں روشن تھا اُن میں سے اب کسبیاں ہوں تو ہوں باقی سامان رخصت ہو گئے۔ زمانۂ حال میں مرزا یاس اس کے متعلق چراغِ سخن صفحہ ۱ میں تحریر فرماتے ہیں "۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے یہ مشہور تھا کہ اردو زبان فقط دہلی اور لکھنؤ والوں کی ملک ہے۔ اور اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔ اس وقت تک یہ خیال کسی حد تک صحیح تھا مگر غدر کے بعد یہ خیال بالکل باطل ثابت ہو گیا۔ آج بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زبانِ اردو کے مالک بلاشرکتِ غیرے لکھنو اور دہلی والے ہیں مگر یہ صرف انہیں لوگوں کا خیال ہے جو کبھی اپنی چار دیواری سے باہر نہیں نکلے جنہیں یہ نہیں معلوم کہ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا اور اردو کہاں سے کہاں پھیل گئی" بہرحال اگر اس دعوے کو تسلیم کیا جائے تو زبانِ اردو کی حیثیت محض مقامی ہو جاتی ہے اور وہ قومی زبان نہیں رہتی۔ یہ دعویٰ کر کے یہ حضرات زبان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

مرکزِ زبان - یہ دعویٰ گزشتہ ادعا کی صدائے بازگشت ہے - اہلِ دہلی فرماتے ہیں کہ دہلی ایامِ قدیم سے زبانِ اردو کا مرکز ہے اور چاہتے ہیں کہ جو الفاظ، محاورات اور اصطلاحات چلن پائیں اُن پر اہلِ دہلی کی مہر ہو۔ ہم مرکزِ زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر ایک مجلس کی شکل میں - تاکہ چار کھونٹ کی زبان ہموار ہو اور تباین و تضاد کا اندیشہ نہ رہے۔ لیکن مقامی مرکزیت سراسر آل اندیشی کے خلاف ہے۔ اس امتیاز سے تحجر و استبداد کے علم بلند ہونگے۔ اور اُن کے سایہ میں بغض اور حسد اور رشکِ رقابت کے بازار گرم ہونگے - نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایۂ مشترک منتشر ہو جائے گا اور اُردو ہندوستان کی قومی زبان بننے سے عاجز ہو جائے گی - مگر اس میں کلام نہیں کہ انتزاعِ سلطنتِ مغلیہ سے پہلے دہلی اور لکھنو کو مرکزیت کی منزلت حاصل تھی اور انہیں زیب دیتی تھی نشر و اشاعتِ زبان مشاعروں اور مکتبوں تک محدود تھی کتابیں کمیاب تھیں اور اُن کا معقول التزام فقط دار السلطنت میں ممکن تھا۔ کیونکہ رسل و رسائل اور آمد و رفت کے وسائل ناقص تھے - پایۂ تخت علوم و فنون کا مرکز، تجارت کی منڈی اور روایاتِ بذل و سخا کا محلِ وقوع تھا۔ اور بلاشبہ ایسی جگہ میں زبان مفصلات کی بہ نسبت زیادہ پنپ سکتی ہے۔ دراصل دہلی اور لکھنؤ سے مراد وہ اینٹ پتھر نہیں جن سے لال قلعہ جامع مسجد اور قیصر باغ کی دیواریں کھڑی ہوئیں، بلکہ دہلی و لکھنؤ عبارت ہے اُن خوبیوں سے جو افسوس ہے کہ اب نہیں اور مرکزیت کا دعوےٰ ساتھ لے گئیں۔

وہ تو باقی ہی نہیں جن سے کہ دہلی تھی مراد
دھوکا اب نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز (مجروح)

ہم کہتے ہیں کہ اگر سلطنتِ مرحوم قائم بھی ہوتی تو دورِ حاضر کے پریس ریل ڈاک اور تار کی مستعدی کے ہوتے مقامی مرکزیت کی بہت کم ضرورت رہتی۔ بے شک سلطنت کے سایہ میں زبان بہت ترقی کر سکتی لیکن مرکز بے معنی چیز ہو جاتی۔ اب بھی جس شہر میں یہ باتیں ہوں اُسے مرکزِ زبان بنانے میں ترجیح دے سکتے ہیں لیکن فرعونِ بے سامان کا سکہ نہیں چل سکتا۔

صاحبِ تسہیل البلاغت (صفحہ ۱۱) مندرجہ ذیل اصول وضع کر کے دہلی کے مرکز ہونے کی ضرورت کو ثابت کرتے ہیں :-

الف - وہ زبان اُس خاص قریہ میں پیدا ہو اور وہاں سے تمام ملک میں پھیلے۔

ب - شہر کے خاص و عام وہی زبان بولیں یہ نہیں کہ خواص کی زبان کچھ اور ہو اور عوام کی کچھ اور جیسے لاہور میں

خواص کی زبان اردو اور عوام کی پنجابی ہے۔ پورب کے عام لوگ پوربی بولتے ہیں اور خواص اردو۔

ج۔ اس شہر میں ایسے بہت سے لوگ ہوں جو زبان کو تراش خراش کر خوشنما اصلاحیں دیں، موثر اور دلنشین انداز بیان نکالیں۔ نئے نئے اسالیب بیان پیدا کریں اور زبان کو ایسی وسعت دیں کہ وہ ہر طرح کے ادائے مطلب پر قادر ہو جائے۔

د۔ ان لوگوں کے کلام دوسرے لوگوں کے لئے زبان دانی میں سبق آموز ہوں:۔

لازم ہے کہ ہم ان پر سلسلہ وار نگاہ ڈالیں۔

الف ۔ کا جواب کلیتاً نفی میں ہے۔ اردو زبان نہ دہلی میں پیدا ہوئی نہ وہاں سے دیگر ملکوں میں پھیلی حکیم نجم الغنی فرماتے ہیں "یہ صرف شاہ جہاں کا اقبال ہے کہ یہ زبان اُس کے اردو کی طرف منسوب ہوئی ورنہ بنا اُس کی اُس زمانہ میں پڑ گئی تھی جب کہ مسلمانوں کا قدم پہلے پہل ہندوستان میں آیا (بحر الفصاحت صفحہ ۲۸)" حکیم شمس الدین قادری ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں "تاریخ زبانِ اردو کا یہ حصہ اگر روشنی میں لایا جائے اور اس کی بنیاد پر اردو زبان کی عہد بعہد ترقیاں مطالعہ کی جائیں تو ماننا پڑتا ہے کہ آلِ سبکتگین کے زمانہ میں اردو کی ابتدا ہوئی۔ اردوئے قدیم صفحہ ۱۸" خدا جانے یہ حضرات معموں میں کیوں باتیں کرتے ہیں اور صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آلِ سبکتگین کی حکومت پنجاب میں تھی لاہور اُن کا مستقر تھا اور یہیں زبانِ اردو کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اب رہا یہ سوال کہ زبان ملک میں پھیلی کس طرح تو اس بارے میں یہ عرض ہے کہ "غوریوں کے عہد میں یہ زبان لاہور سے دہلی پہنچی وہاں سے خلجی لے گجرات اور دکھن لے گئے۔ محمد تغلق جب دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو آباد کرنے پر آمادہ ہوا تو یہ زبان اِن نو آبادکاروں کی زبان بن کر دکھن میں پھیل گئی۔ (دیباچہ پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی صفحات و ھ) وہاں سے پھر ولی اورنگ آبادی کا دیوان آتا ہے۔ اور دہلی میں دکن کی طرح زبانِ اردو ادبی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ اور محمد شاہ کے عہد سے شاہ عالم ثانی کے زمانے تک اردو صرف دلی کی مِلک رہی اس سے ظاہر ہے کہ زبان کی ابتدا بھی لاہور سے ہوئی جو اس زبان کا جنم بھوم ہے۔

ب ۔ یہ درست نہیں۔ آج کل کا اندازہ تو ہر شخص آسانی سے دہلی جا کر لگا سکتا ہے اور ماضی کے متعلق سُننے سید انشا کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

"اگر چنیں باشد ساکنانِ مغل پورہ چہ تقصیر کردہ اند کہ زبانِ ایشاں معیوب و خلافِ اردو شمردہ شود یا فرزندانِ سادات بارہہ کہ در دار الخلافت می باشند از کجا گفتگوئے ایشاں سند نباشد۔ دریائے لطافت صفحہ ۹۴" رہا لاہور تو اُس کے

متعلق میرزا صاحب کو تسامح ہوا ہے۔ اس شہر میں سب لوگ کیا ہندو کیا مسلمان اردو ہی بولتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ عوام قدیم اردو میں بات چیت کرتے ہیں جیسے دکنی کی طرح پنجابی کہتے ہیں اور خواص وہ اردو جو ذرا سنور گئی ہے پنجابی دراصل کوئی جداگانہ زبان نہیں بلکہ اردو کے دورِ ارتقا کی ابتدائی یا درمیانی منزل کا نام ہے چنانچہ مولوی سید احمد مرحوم فرہنگِ آصفیہ جلد ا صفحہ ۲۴۵۰ میں تحریر فرماتے ہیں۔ "پنجابی میں اکثر ہندی الفاظ اپنی اصلی ہیئت پر موجود ہیں" یعنی پنجاب میں زبان کی وہی حالت رہی مگر دہلی میں اُس نے زیادہ مہذب شکل اختیار کرلی۔

ج۔ اسلاف کے ذکرِ خیر کو چھوڑ کر کوئی تفصیل سے نہیں بتا سکتا کہ عہدِ رواں میں اہلِ دہلی نے کون کون سے نئے اسالیبِ بیان پیدا کئے اور زبان کو کیا وسعت دی۔ اِس عہد میں لے دے کے فرہنگ آصفیہ ایک کام کی چیز پیدا ہوئی جس کی طباعت کا سہرا لاہور کے سر ہے اور امداد کا فخر دکن کو۔ اگر یہ دو طاقتیں بروئے کار نہ آتیں تو سید احمد اُس کی اشاعت کی حسرت قبر میں ساتھ لے جاتے۔ بلکہ اخبار عام لاہور مورخہ ۱۹۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء کا یہ مبہم فقرہ بہت معنی خیز ہے کہ "خود اہلِ دہلی کی عنایت تھی جو مصنف کو بہت عرصہ تک پریشان ہونا پڑا"۔ اب سنئے حکیم نجم الغنی رامپوری جیسا ایک غیر جانبدار گواہ جس کا پنجاب دہلی اور لکھنؤ کسی سے بھی تعلق نہیں کیا کہتا ہے "زباندانانِ لکھنؤ کو الفاظ کی تراش و خراش کا بڑا خیال رہتا ہے اور حضراتِ دہلی ایسی باتوں کو فضول سمجھتے ہیں۔ بحر الفصاحت صفحہ ۲۸"

ہم ذیل میں وہ اصلاحات درج کرتے ہیں جو فصحائے لکھنؤ نے دورِ حاضر میں یعنی امیر اور داغ کے بعد زبان میں کیں۔ حامیانِ دہلی بھی ارشاد فرمائیں کہ اِس دور میں اُن کے "یاں" کیا کارِ نمایاں ہوئے؟

(۱) صیغۂ امرِ حاضر میں "یو جیو" کا اضافہ نہ کرو جیسے آئیو۔ جائیو۔ آئیے۔ جائیے کہو۔

(۲) جب ترکیب فارسی ہو تو آخر لفظ کے نون کا اعلان نہ کرو۔ جیسے تابعِ فرماں۔

(۳) مضارع کے صیغوں میں واؤ زیادہ نہ کرو۔ مثلاً آویں جاویں نہ کہو۔ آئیں جائیں بولو۔

(۴) جو لفظ خود جمع ہے اُس کی جمع بقاعدہ اردو بنانا ناجائز ہے جیسے احباب سے احبابوں

(۵) فارسی میں "ہا" علامتِ جمع ہے اس کے استعمال سے احتراز لازم ہے۔ جیسے گلہا۔ داغہا۔ ہزارہا۔

(۶) آخر کلمہ کی یائے معروف کو مشدد استعمال نہ کرنا چاہئے۔ جیسے۔ کیوں کیا حال "بتائیے" دل کا۔

(۷) "رشکِ گل" "رشکِ پری"۔ "غیرتِ ماہ" وغیرہ الفاظ جن سے کنایتاً معشوق مراد ہوتا ہے بغیر اشارہ کے استعمال کرنا غیر مطبوع ہے۔

(۸) مصادرِ فارسی کا استعمال متروک ہے مثلاً "بعدِ مُردن" کی جگہ اب پسِ مرگ یا بعدِ مرگ بولتے ہیں۔

(۹) تا - جو - جب - غرض - کاش اور گو کے ساتھ "کہ" کا اضافہ خلاف فصاحت ہے۔

(۱۰) جو شخص مرگیا ہو اُس کے نام کے ساتھ "صاحب" کا لفظ لگانا معیوب ہے۔

(۱۱) مصدر کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال نہ کرو - مثلاً - آیا چاہئے - دیکھا چاہئے۔

(۱۲) "ساتھ" اور "ہاتھ" کو "بات" اور "رات" کے ساتھ قافیہ نہ کرو۔

(۱۳) "اوپر" کی جگہ جو "بر" کے معنوں میں آتا ہے "پر" استعمال کرو

(۱۴) لفظِ فارسی یا عربی اور ہندی کے درمیان واؤ عاطفہ نہ لاؤ۔

(۱۵) جو نون آخر الفاظِ فارسی یا عربی میں بلا ترکیب ہو اُسے باعلان استعمال کیا جائے۔ باستثنا خزاں - رواں - طپاں - عیاں - وغیرہ۔

(۱۶) مضاف الیہ میں نون واقع ہو تو اس کا اعلان نہ کرو۔

(۱۷) "اور" کہ حرفِ عطف ہے اس میں ظاہر ہونا واؤ اور رائے مہملہ کا ضرور ہے۔

(۱۸) بائے موحدہ کو الفاظِ عربی اور فارسی کے قبل نہ لگاؤ - مثلاً بوقتِ صبح - بہنگامِ شام۔

(۱۹) عرصہ بمعنی دیر کے لئے دفعہ استعمال کرو۔

(۲۰) آتے ہے - جائے ہے کی جگہ آتا ہے جاتا ہے کہو۔

(۲۱) رکھا - چکھا - اٹھا کو حرفِ اوسط کی تشدید سے استعمال کرو۔

(۲۲) اِس باب میں کی بجائے اِس بارے میں استعمال کرو۔

(۲۳) لفظِ ہر کو جمع کے ساتھ استعمال نہ کرو (دیباچۂ نور اللغات و بحر الفصاحت صفحہ ۴۳ و اصلاحِ زبانِ اردو)

مندرجہ ذیل الفاظ جو داغ و امیر اور اُن کے معاصرین نے استعمال کئے ہیں متروک قرار دیئے :-

مارے - باعث - (امیر) یہ خبر سنتے ہی میں مارے خوشی کے مرگیا۔

نجانے - نہ معلوم (شاد) کیا گذرتی ہے نہ جانے وطن آواروں پر۔

آپی - آپ ہی - (داغ) ہم نظر آپی چرا جاتے ہیں اکثر دیکھ کر۔

آخر کو - آخر - (نوح) آخر کو گذر جائے گی میری شبِ ہجراں۔

آسا - مانند (امیر) شمع آسا کبھی جلتے کبھی روتے گذری۔

اتنے لئے - اِس واسطے - (امیر) لوٹتا ہوں نہ خنجر فقط اتنے لئے ہیں۔

اخیر۔ آخر۔ (داغ) اخیر کچھ نہ بنی صبر اختیار کیا۔

اس طرح سے۔ اس طرح (داغ) اس طرح سے آئے کہ نہ آئے مرے آگے۔

امداد۔ مرحمت (داغ) جو عطا غیر کو ہو وہ مجھے امداد نہ ہو۔

اے بلبلو۔ اے زاہدو۔ (شاد) حباب وار تم اے بلبلو اُبھر لینا۔

بارے۔ ایسا ہو۔ (امیر) بارے جھپٹ کے ہیں نے گلے سے لگا لیا۔

برابر میں۔ ساتھ میں (داغ) آپ کیوں میرے برابر میں چلے آتے ہیں۔

برخلاف۔ خلاف (داغ) کس درجہ برخلاف ہے دل کس قدر خلاف۔

بلا۔ بغیر (جلیل) ملنے لگا ہے مجھ سے بلا واسطہ وہ شوخ۔

بل بے۔ واہ رے (شاد) بل بے ناکامی کہ ہے حسرت ہی حسرت جانِ زار۔

بن۔ بغیر (آتش) دام میں لا کر کیا جب بن چھری مجھ کو حلال۔

پَیر۔ پاؤں (داغ) جب اُس کی بات کا کوئی سر ہو نہ پَیر ہو۔

تڑپن۔ تڑپ (شاد) دکھائیں کس طرح تڑپن دلِ مضطر کی ڈرتے ہیں۔

تلک۔ تک (امیر) جب تلک تم تھے کشیدہ دل تھا شکووں سے بھرا۔

تلے۔ نیچے (داغ) وہ دل ہے جو ترے تلووں تلے ہوا پامال

جُوں تُوں۔ بہرطور (داغ) ہو گیا جُوں تُوں گذارا ہو گیا۔

خود سے۔ آپ سے آپ (جلال) خود سے ادھر نہ جائیں ہم۔

دلا۔ اے دل (امیر) دلا ہم سے گلہ اُس دلربا کا۔

سدا۔ ہمیشہ (شاد) سدا دید بازی میں اے شاد گذری

سمیت۔ ساتھ (شاد) آئے تھے تنہا چلے رنج و غم و ارماں سمیت۔

سر پر سے۔ سر سے (داغ) صدقہ کر ڈالیں ترے سر پر سے ہم۔

سندیسا۔ پیغام (داغ) آئے ہیں آپ محبت کا سندیسا لے کر۔

صفا۔ صاف (داغ) سچ یہ ہے صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے۔

کتنے۔ کیسے (شاد) دیکھنے میں غریب کتنے ہیں۔

کمتی۔کم (شاد) کیا لہو رونے سے کمتی شاد مجھ ناشاد کو۔
کون مدت۔کتنی مدت (داغ) کون مدت سے ہے عادت مجھے تنہائی کی۔
میاں۔صاحب (امیر) کیوں میاں کیا ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا جاتا رہا۔
ناپیدا۔ناپید (داغ) مدعا یہ تھا کہ پیدا کر کے ناپیدا کروں
نگھرا۔بےگھر (امیر) نگھرا کر کے تو ہیں آپ سدھارے گھر کو۔
وار۔باری (داغ) کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے وار پر۔
وصلت۔وصال (شاد) خواہش وصلت نے پھاڑا جامۂ یوسف جواں۔
واں۔وہاں (امیر) واں جام سے دریغ یہاں سبے صبو پسند۔(قرار اصطلاحات صفحہ ۴۳ لغایت ۵۰)

یہ اصطلاحات اچھی ہوں یا بُری اس سے بحث نہیں۔لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کون اُن کے موجد ہیں۔سندِ جواز کہاں سے ملی۔اگر اردو صرف لکھنو کی زبان ہے تو جو چاہیں کریں ورنہ جو اس وقت اُس کی خدمت کر رہے ہیں ان سے استصواب لازم آئے گا۔حکومت قانون بناتی ہے تو رعیت کی رائے لیتی ہے اور یہاں تو مساوات اور برادری کا معاملہ ہے

زبان کی اصلاح کے علاوہ لکھنؤ کو ڈراما، مرثیہ، سلام، ناول اور ریختی رنگین کا تفنن کسی شمار میں نہیں، لکھنو کے ایجاد ہیں لغت میں بھی لکھنو نے بہت کام کیا ہے۔امانت۔دلگیر۔انیس، دبیر، نفیس، اوج، محسن، امیر، سرشار اور رجالنصاحب کے مدمقابل پیدا کرنے میں دہلی کی سرزمین عاجز نظر آتی ہے لیکن یہ لفظی زیب و زینت حقیقت کی نگاہ میں چنداں وقعت نہیں رکھتی۔اس سے فہم و ادراک، علومِ جدیدہ کے انکشاف اور تراجم میں کوئی مدد نہیں ملتی، زبان میں کوئی وسعت نہیں ہوتی، البتہ ذرا رنگ شوخ ہو جاتا ہے۔ہم آیندہ چل کر بتائیں گے کہ اُن کی جدت طرازیوں نے زبان کے اثر کو محدود کر دیا ہے اور تصنع اور تکلف کی بدولت تاثیر، شیرینی اور گھلاوٹ میں فرق آ رہا ہے۔ہاں اگر سرمایۂ کمال فقط زبان ہی زبان ہے اور معاملہ بندش روزمرہ اور محاورہ ہی علم و فضل کی کل کائنات ہے اور زبان میں مزید وسعت کی ضرورت نہیں تو اور بات ہے۔لیکن اگر جدید علوم سے اردو کو مالا مال کرنا ہے۔اگر اردو کو مغربی زبانوں کے دوش بدوش دیکھنا ہے تو ایسے لغات اور محاورات اردو میں آ کر رہیں گے جن سے موجودہ فصاحت کے کان ہنوز نا آشنا ہیں۔اِن اگلے وقتوں کے لوگوں سے کوئی پوچھے کہ یہ غزل، قصیدے اور طلسمات کے پہلنے کب تک دکھاؤ گے۔زمانہ بدل گیا اور اگر زمانہ کے ساتھ یہ نہ بدلے تو کہیں ٹھکانا نہ ملے گا۔

وہ دن گئے جب علم و ادب محض تفریح کے سامان تھے۔ اب تو زندگی کا مدار انہی پر ہے۔ جو زبان زیادہ علوم کو اپنے دامن میں پناہ دے گی وہی پھولے پھلے گی۔ اور صرف حسن صوری محفلِ علم میں درخور کا ضامن نہ ہوگا۔ یہ تعلیوں کا نہیں کام کا وقت ہے۔ اردو کب تک کھلونا بنی رہے گی۔ اسے اب مادی اور ذہنی ترقی کا آلہ بنا دیجیے۔ اسے سرمایۂ مشترک سمجھیے اور مل کر کام کرنا سیکھیے۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں یہ جم غفیر کس طرح سمائے گا۔

ھ۔ یہ قول واضح نہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ طالبانِ علم مرکز میں حاضر ہو کر کسب فیض کریں تو اس کے متعلق عرض ہو چکا کہ دورِ حاضر میں اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ باکمالوں کے دواوین سے محاکنِ زبان ڈھونڈ کر نکالے جائیں، محاورات جمع کئے جائیں، تراکیب کی فرد مرتب ہو، تذکیر و تانیث کی فہرست قلم بند کی جائے، تو معاف فرمائیے، آج کل ہر دنیادار سے اس کھڑاگ کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اہلِ لکھنؤ کی طرح دستور العمل بنا کر دکھائیے۔ مگر آپ نے تو اس طرف توجہ ہی نہیں کی اور جب کسی نے کچھ پوچھا بھی تو انگلی پکڑ کر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لڑھکنے کے لئے چھوڑ آئے۔

ہندی اور اُردو۔ زبانِ اردو کی عالمگیر حیثیت اختیار کرنے میں یہ شاخسانہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اصل میں صرف آپس کا ہنسی مذاق تکدرِ خاطر کی حد تک جا پہنچا ہے۔ ہندو اپنے قابلِ احترام بزرگوں کی طرح اردو کی خدمت میں کمربستہ تھے، مگر مسلمانوں میں ہندو دوست اور رواداری پسند ہستیاں پھبتیاں کھینچنے لگیں۔ چند غیر ذمہ دار مسلمان نوجوانوں نے ہندوؤں کی زبان پر حرف رکھنا شروع کیا اور اُن کی زبان کا نام "دھوتی پرشادوں کی بھاشا" رکھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ متروکات کا خنجر اُٹھایا اور بہت سے معصوم ہندی الفاظ کا سر اڑا دیا۔ ضد اور کش مکش نے اس پر کفایت نہ کی بلکہ ایسے محاورات جو ہندوؤں سے خاص تھے فصاحت کے متبائن قرار دیئے۔ اور فارسی و عربی کے غیر مانوس الفاظ کا ایک لشکر اردو میں داخل کر دیا۔ متحمل مزاج اور آشتی پسند ہندو تو پی گئے لیکن اُن میں آتش مزاج نوجوانوں کی قلت نہ تھی انہوں نے بڑے تپاک سے اِس چیلنج کا استقبال کیا اور اُنہی ہتھیاروں سے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے جو اُن کے حریفوں نے چھانٹے تھے۔ رسم الخط کے لئے دیوناگری منتخب ہوئی عربی فارسی کی جگہ سنسکرت نے سنبھالی وہ تلمیحات اور اصطلاحات جو مسلمانوں سے وابستہ تھیں متروک قرار پائیں۔ ہندی پر پرزے سنبھال کر اردو کے سامنے ڈٹ گئی۔ ہمارے عندیہ میں گو اردو موجود ہے اور اُس کا ستارۂ اقبال روشن ہے لیکن اس جنگ میں اُس کی ماہیت کھو گئی اور اس نام سے پکارے جانے کے قابل نہ رہی۔ اردو اُس سرمایۂ مشترک کا نام تھا جو فارسی اور بھاشا کے اتصال سے پیدا ہوا۔ جب بھاشا کی علیحدگی سے اس میں پراگندگی آگئی تو اردو کے

سے خیمے خود بخود اکھڑ گئے اور قصرِ اقبال متزلزل ہوگیا۔ ہندوؤں نے بھی ہندی کی چندی نکالنے میں کسی آل انڈیا کا ثبوت نہیں دیا، بلکہ جوشِ غضب سے ہندوستان کی قومیت پر وہ چرکا لگایا ہے جس کا اندمال قرنوں میں ہو تو ہو۔ اردو ہندو مسلمان اتحاد کی ایک زندہ یادگار ہے جسے ہمارے بزرگوں نے بڑی جانکاہی سے استوار کیا تھا۔ اس میں رخنہ ڈالنا قصرِ قومیت کی بنیادیں اکھیڑنا ہے اس کے علاوہ پرانی بھاشا کو پھر سے زندہ کرنے میں انہوں نے الٹی زقند بھری ہے اور زبان کی ترقی یافتہ شکل سے اغماض کرکے اس کی ابتدائی ہیئت کی پرورش کرنے لگے ہیں۔ گویا وہ ازسرِنو وہی کام کر رہے ہیں جو ایک مدت کا ہو چکا ہے۔ بعینہٖ یہی عالم اُن پنجابی حضرات کا ہے جو پنجابی کو اردو سے علیحدہ خیال کرکے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

ہندو اپنی فطرت کے مطابق ذرا بردباری سے کام لیتے تو اُن مسلمانوں کو انہیں کے منتخب طریق میں جواب دے سکتے تھے۔ وہ قوم جو ٹیک چند بہار، ہرگوپال تفتہ، سرب سنگھ دیوانہ، طوطا رام شایان، مادھو رام سرشار اور کیفی جیسے فارسی دان پیدا کر سکتی ہے کیا وہ فارسی ہی میں مسلمانوں کا منہ بند کر سکتی تھی؟

اب وقت کا تقاضا یہی ہے کہ رسم الخط خواہ دیوناگری ہو یا فارسی مگر زبان وہی رہے جسے اردو کہتے ہیں۔ موجودہ اردو میں غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ نہ لائے جائیں اور ہندی کو سنسکرت کے بھولے بسرے شبدوں سے سرفراز نہ فرمایا جائے۔ ورنہ قومی زبان بنانے کا خیال دل سے نکال دو اور لڑتے جاؤ۔ ارشد کہتے ہیں کہ؎

زبانِ ترکی کو کون ناداں بھلا بنائے کا برج بھاشا
زبانِ ہندی پہ کون جاہل بھلا کرے گا گمانِ اردو

لیکن وہ یہ شاعرانہ رو سے فرما گئے ہیں ورنہ حضرت داغ کی تو یہ رائے ہے۔؎

کہتے ہیں اُسے زبانِ اردو   جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

یعنی اردو سے فارسی رنگ نکالو تو جو باقی رہتا ہے وہ ٹھیٹھ اردو ہے۔

(باقی)

"ڈرامی"

ذوقِ فطرت

پئے تسکینِ خاطر حسن اگر ہو تو یہی بس ہے
یہ ساکت رات یہ ٹھنڈی ہوا یہ چاندنی بس ہے

انہیں کی دید سے ہوتی ہے پیدا تازگی جاں میں
سحر کی نور پاشی، دلفریبی شام کی بس ہے

ضرورت انجمن کی ہے نہ حاجت ہے احبا کی
یہ تنہائی یہ کنجِ عافیت یہ خامشی بس ہے

نہیں ثروت نہ ہو جمعیتِ خاطر نہیں کچھ کم
دو روزہ زندگی میں زیست اطمینان کی بس ہے

بہت کافی ہے مجھ کو سیر باغ و کوہ و صحرا کی
گیاہ و لالہ و گل سے مری دل بستگی بس ہے

کہوں کیا چھاؤں سے ہوتی ہے کیسی قلب کو فرحت
مری تسکینِ دل کو سایۂ اشجار ہی بس ہے

حقیقت میں یہی ہے انبساطِ روح کا سامان
یہ غنچوں کا تبسم اور پھولوں کی ہنسی بس ہے

نظر افروز کیا ہی جلوہ ہے اس حسنِ فضاں کا
نگاہِ نکتہ بیں کے واسطے اک تیتری بس ہے

کبھی ہے کوک کوئل کی کبھی پی پی پپیہے کی
نشاطِ طبع کو وہ راگ اور یہ راگنی بس ہے

بہت دل کو لبھاتی ہیں صدائیں آبشاروں کی
یہ موسیقی حقیقت کی یہ صوتِ سرمدی بس ہے

مجھے بے خود بنانے کو مجھے مدہوش کرنے کو
مرے ہی گیت کافی ہیں مری ہی بانسری بس ہے

گھٹا میں ہائے کیا عالم ہے بگلوں کی قطاروں کا
اگر ہے ذوقِ نظارہ تو نظارہ یہی بس ہے

یہ وادی یہ شجر یہ جھیل یہ طاؤس یہ سارس
انہیں سے شاد ہوں اتنا ہی لطفِ زندگی بس ہے

نجیب ان سے نہیں ہے کوئی اندیشہ برائی کا
درختوں اور پرندوں ہی سے اپنی دوستی بس ہے

میر سعادت حسین نجیب

ضریاب

تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے بسا اوقات ایسے اشخاص کے حالاتِ زندگی نظر سے گزرتے ہیں۔ جو اپنے فن میں لاثانی اور اپنے دائرہ عمل میں بے مثال تھے مگر جن کو زمانے نے ایسا فراموش کر دیا کہ اُن کی یاد میں آنسو بہانا تو درکنار کوئی نام لینے والا بھی نہیں رہا۔ انہی ہستیوں میں سے وہ ماہِ آسمانِ موسیقی تھا جس نے مطلعِ فارس سے نکل کر مطلعِ بغداد پر جھلک دکھائی اور اندلس پر ضیا پاشی کرتا ہوا وہیں غروب ہو گیا۔ ضریاب جو سلطان عبدالرحمٰن ثانی شاہِ اندلس کے زمانے میں مشہور ترین آدمی گزرا ہے فارس میں پیدا ہوا اور خلیفہ ہارون الرشید کے دربار کے مشہور مغنی اسحاقِ موصلی کا شاگرد بنا، یا یوں کہئے کہ اسحاقِ موصلی سے فنِ موسیقی کی ابجد پڑھ کر اُس نے وہ کمال پیدا کیا کہ استاد کی شہرت اور فخر کا باعث ہوا۔ یہاں تک کہ معلم متعلم کو نگاہِ رشک سے دیکھنے لگا۔

اسحاقِ موصلی کے ساتھ ضریاب بھی ہارون الرشید کے دربار میں علوم و فنون کی محفلوں میں شمولیت کے لئے جایا کرتا تھا۔ اس کی ذہانت اور حافظہ جسے ظاہر کرنے کا اسے اکثر موقع مل جاتا تھا سمجھنے والے دلوں میں طرح طرح کی امیدیں پیدا کرتا تھا اور دُور بین نظروں کو اُس کا مستقبل شاندار دکھائی دیتا تھا۔ ایک روز خلیفہ کے حضور میں نغمۂ سرود جاری تھا اور تمام ماہرینِ فن جمع تھے۔ جب ضریاب کی باری آئی تو بدقسمتی سے اُس نے وہی راگ جو اسحاق گا چکا تھا اُسی سر سے گانا شروع کیا اور استاد پر سبقت لے گیا۔ محفل کے برخاست ہونے پر بادشاہ نے اُسے حکم دیا کہ یا تو بغداد کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دے یا مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ ضریاب نے جلاوطنی کو موت پر ترجیح دی اور بغداد سے نکل کر اندلس کی راہ لی۔

یہاں اُن دنوں عبدالرحمٰن ثانی سریرِ مملکت پر جلوہ افروز تھا اور شاہانِ اسلام کا تخت ایک صدی سے زیادہ عرصے کی حکومت کے بعد اب بالکل مستحکم ہو چکا تھا۔ بغداد کی علمی اور ادبی مجلسوں کی شہرت اور دربارِ ہارون الرشید کی شان و شوکت سُن کر سلطان کے دل میں دارالخلافہ اندلس (قرطبہ) کو رشکِ بغداد بنانے کا شوق تھا اس لئے اُس نے ضریاب کا بڑے شوق سے خیر مقدم کیا۔ سکونت اور خوراک کے علاوہ جس کا انتظام اُس نے اپنے ذمے لیا ایک معقول وظیفہ اور دیگر حقوق عطا فرمائے۔ اس طرح بے وطن ضریاب اپنے ہنر کی بدولت بہت مال دار ہو

گیا اور آرام و آسائش سے زندگی بسر کرنے لگا۔

قدر شناس سلطان اُس کے علم و ہنر اور قابلیت پر اس قدر ممنون ہؤا کہ جب یہ عندلیب فارس اپنی راگنی چھیڑتا تو گھنٹوں بیٹھا سنا کرتا اور اکثر کھانے میں بھی اپنے ساتھ شریک کرلیتا۔ ضریاب کا مطالعہ بہت وسیع تھا اس لئے وہ مختلف مضامین پر دیر تک گفتگو کرسکتا تھا۔ وہ شاہانِ سلف کے کارنامے ادبی حکایتیں اور علمی باتیں سُنا کر سلطان کی محفل کو گرم رکھتا تھا۔ اُس کو ایک ہزار سے زیادہ نظمیں یاد تھیں اور اُن میں سے ہر ایک نظم کو ایک مخصوص سُر کے ساتھ گایا کرتا تھا۔ اُس کا قول تھا کہ اُس نے تمام سُر ہوا کی حرکت اور اس کی فطری آواز سے سیکھے ہیں۔ اُس نے چار تاروں کی بجائے عود میں پانچ تار لگائے اور اُس کے بجانے کا طریقہ دوسرے ماہرینِ فن سے مختلف ہونے کے علاوہ اِس قدر موثر تھا کہ جو بھی سن پاتا تھا اُس کو پھر دوسرے کے راگ میں لطف نہ آتا تھا۔

جو شخص اُس کے پاس علم موسیقی سیکھنے کے لئے آتا تھا اُس کا امتحان ایک عجیب و غریب اور نرالے طریقے سے کرتا تھا۔ وہ اُسے اپنے پاس بٹھا کر اونچی سے اونچی آواز کے ساتھ گانے کا حکم دیتا۔ اگر آواز بہت ہلکی ہو تو اُس کی کمر کے گرد ایک پٹی بندھوا تا جس سے اُس کی آواز بلند ہو جاتی۔ اگر اُس کی زبان میں کوئی روکاوٹ یا تتلاہٹ ہو تو اُس کا علاج بھی عجیب ذریعے سے کرتا تھا یعنی متعلم کا منہ اس قدر کھلواتا جتنا وہ کھول سکے۔ اُس کے بعد وہ اُس کو لفظ "آہ" کہنے کا حکم دیتا تھا۔ اگر وہ شخص لفظ "آہ" کافی بلند آواز سے نکال سکے تو اُس کو اپنا شاگرد بنا لیتا تعلیم و تربیت میں مصروف ہو جاتا اور سمجھ لیتا کہ اُس کی تتلاہٹ دور ہو جانے والی ہے ورنہ نکما سمجھ کر چھوڑ دیتا۔

ضریاب طرزِ کلام اور آدابِ محفل سے خوب واقف تھا۔ اُس کے زمانے میں کوئی شخص اُس سے زیادہ خوش خلق اور خندہ پیشانی نہ تھا ان صفات نے ہر شخص کے دل میں اُس کی صحبت کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ ہر مہذب گھر میں اُس کے نام اور قابلیت کا چرچا تھا۔ تمام اندلس میں وہ طرزِ معاش طرزِ لباس اور طریقِ خورد نوش کا رہنما تھا۔ اُس کو دیکھ کر لوگوں نے اپنے بال کٹوانے کا طریقہ بدل دیا۔ اندلس میں کئی قسم کے کھانے اُسی کے اختراع کردہ ہیں اور ایک قسم کی پلیٹ بہت دیر تک اُسی کے نام سے منسوب رہی۔ دھات کی بجائے شیشے کے برتنوں میں پہلے اُسی نے شراب نوشی شروع کی، پھر تمام لوگ اُس کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔ چمڑے کے بستر پر سونے اور چمڑے کی چٹائیوں پر کھانا کھانے کی مثال پہلے اُسی نے پیش کی۔ وہ اس بات پر بہت زور دیا

کرتا تھا کہ موسمِ سرما کے گرم کپڑے پہنتے پہنتے ایک دم گرمیوں کا باریک لباس زیبِ تن کر لینا بہت بُرا ہے بجائے اس کے لباس کو بتدریج تبدیل کرنا چاہیئے۔

جو کچھ بھی وہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا لوگ اُسے ضروری اور افضل و احسن سمجھ کر بغیر کسی اعتراض کے اختیار کر لیتے تھے - یہاں تک کہ امورِ معاشرت میں بادشاہ بھی اُس کی پیروی کرتا تھا - کہا جاتا ہے کہ عبدالرحمٰن ثانی اپنے عہدِ حکومت میں چار اشخاص کے زیرِ اثر رہا (۱) یحییٰ جو اُس کے زمانے کا بہت بڑا مذہبی عالم تھا (۲) ملکہ زینب (۳) اُس کا غلام نصر اور (۴) ضریاب سیاسی جھگڑوں میں پڑنے سے ضریاب بہت بچتا تھا اس لیئے اُس نے اپنے اثر کو امورِ معاشرت ہی تک محدود رکھا اور انتہا تک پہنچایا۔

تاج محمد

غصّہ

ناراضگی پر رات نہ پڑنے دو۔

غصہ حماقت میں شروع ہوتا ہے اور ندامت میں ختم۔

وہ شخص جاہل ہے جو غصّے میں نہ آسکے اور وہ عقلمند جو غصّے میں نہ آئے۔

غصّہ ور آدمی اپنا منہ کھول دیتا ہے اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

غصّے میں پہلے وہی آتا ہے جو راستی پر نہ ہو۔

گلچیں

رُباعیات

(۱)

جب اشکوں سے آنکھ میری بھر آتی ہے
بجلی سی جھلک سے تیری نظر آتی ہے
ہوتا ہوا ہے غم دل ٹکڑوں پہ جیسے
ٹپکی ہوئی آنکھ سے یہ بھر آتی ہے

(۲)

دنیا کیا ہے؟ یہ بھول جانا ہوگا
دنیا میں بہشت کا بنانا ہوگا
راحت ہر شخص کو میسر ہوگی
اللہ اللہ کب یہ زمانا ہوگا

(۳)

پیدا ہوا کھول شرر سے لگی دل میں
کیسا ہی ہو دل آتش سے لگی دل میں
اس آہ کو بے کار نہ سمجھو افسرؔ
دل سے نکلی ہے پھر آگ لگی دل میں

(۴)

راحت سے کسی خمار کی کیفیت ہوگی
ہم کی زمانے کو ضرورت ہوگی
زندہ ہیں تو ہم بھی دیکھ لیجے افسرؔ
دنیا جسے کہتے ہیں وہ جنت ہوگی

حامد اللہ افسرؔ میرٹھی

بکھرے ہوئے موتی

معصومیت مسرت کی بنیاد ہے۔
لاعلمی اطمینان ہے۔
مسکراہٹ اظہارِ تشکر کا ایک لطیف ذریعہ ہے۔
صحت کا راز مسکراہٹ میں پوشیدہ ہے۔
الفت آنکھوں سے ظاہر ہوتی ہے۔
انسان کے خصائل کا عکس اُس کے قلم کی جنبش میں پنہاں ہے۔
خاموشی بزرگی میں اضافہ کرتی ہے۔
ناکامی کامیابی کی قدر کو دوبالا کر دیتی ہے۔
پشیمانی نیکی کا احترام ہے۔
شکرگزاری شرافت کی جان ہے۔
نیکیاں مر جاتی ہیں گناہ زندہ رہتے ہیں۔
عملی جنت خیالی جنت سے بہتر ہے۔
ابدی خوشی ازلی خوشی سے بالاتر ہے۔
بدگمانی غلط فہمی کی ماں ہے۔
وقعت محبت سے پیدا ہوتی ہے۔
تقریر کھو جاتی ہے تحریر نہیں کھوتی۔
عزم استقلال کی کنجی ہے۔
پہلا گناہ انسان کو دلیر بنا دیتا ہے۔
ایک گناہ سو گناہوں کی جڑ ہے۔

اخلاق فاطمہ

تاریخِ دنیا پر ایک نظر

نشاۃ الثانیہ اور اصلاحِ مذہبی

(۲۱)

عیسائیتِ وسطیٰ

فرنگی بادشاہت ۔ گیارھویں صدی کے اخیر میں مغربی عیسائیت سے درخواست کی گئی کہ وہ مشرقی عیسائیت کو سلجوقی ترکوں کے ہاتھوں سے اور فلسطین کی ارضِ مقدس کو مسلمان "کافروں" کے ہاتھوں سے رہائی دلائے۔

جب ہم نے آخری بار مغربی عیسائیت پر ایک نگاہ ڈالی تھی تو ہم نے دیکھا تھا کہ وہ متعدد "شمالی" حکومتوں یعنی مغربی گاتھی وینڈل مشرقی گاتھی فرنگی برگندی اور انگریزی حکومتوں پر مشتمل تھی جو روما کی سلطنت کے کھنڈروں پر بنی تھیں۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کس طرح یہ حکومتیں کچھ روما کی روایات لیکن زیادہ تر پاپائیت کی زندہ قوت سے ایک حقیقی اتحاد میں منسلک ہو رہی تھیں۔

اُن پانچ صدیوں میں جو اِن "شمالی" حکومتوں کے قیام اور اُن کے صلیبی جنگوں میں حصہ لینے کے زمانے کے درمیان (تقریباً ۵۵۰ء سے ۱۰۰۰ء تک) گذریں مغربی دنیا میں بعض قابلِ غور تغیرات وقوع میں آئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیسے وینڈلوں اور مشرقی گاتھوں کو جسٹنطین نے ملیامیٹ کر دیا اور مغربی گاتھوں کو عربوں نے ۔ صرف فرنگی اور انگریز جو باقی رہے ترقی کرتے رہے۔ انگریز ابھی تک دُور دنیا کے ایک کونے پر اپنے جزیرے میں ایک منقطع زندگی بسر کر رہے تھے اور ابھی دنیا کی تاریخ پر اُن کا کچھ اثر نہ ہو رہا تھا۔

فرنگیوں کا حال دگرگوں تھا۔ ابتدا ہی میں کیتھلک عیسائیت اختیار کر کے اور پاپائیت سے زبردست امداد حاصل کر کے انہوں نے اپنی قلمرو کو وسعت دی یہاں تک کہ ۸۰۰ء میں وہ براعظم یورپ کے بیشتر حصے پر حکومت کرنے لگے۔ وہ سارے گال پر حکمران ہو گئے۔ برگندی اُن کے علاقے میں شامل ہو گئی۔ مشرق کی جانب جرمنی میں پیش قدمی

کر کے انہوں نے اُن خطوں میں عیسائی تمدن کا جھنڈا گاڑ دیا جہاں روما کے فرماں رواؤں کی رسائی نہ ہو سکی تھی بلکہ انہوں نے سلاؤں اور ایشیائی حملہ آوروں کو بھی زیرنگین کیا۔ شمالی اطالیہ کو انہوں نے لمبارڈوں سے (جو تقریباً ۵۶۸ء سے ۷۷۴ء تک اُس خطے میں جہاں سے مشرقی گاتھ نکل چکے تھے آباد ہو کر حکومت کرتے رہے) چھین لیا اور جنوب مغرب کی طرف انہوں نے مسلمانوں کو دریائے ایبرو کے شمال سے پرے ہٹا کر عیسائیت کے لئے سپین کی بازیافت کا کام بھی شروع کر دیا۔

فرنگی بادشاہت کی شان و شوکت اور قوت چارلس مارٹل کے پوتے (وہی چارلس مارٹل جس نے عربوں کو طور کے میدان میں شکست دی تھی)، چارلس اعظم (شارلمین ۷۶۸ء تا ۸۱۴ء) کے عہد میں اپنے معراجِ کمال کو پہنچی۔ اُس نے نہ صرف قلمرو کو غایت درجہ وسعت دی بلکہ اُس نے ایک نہایت اعلیٰ نظامِ حکومت کے ذریعے سے اُسے ایک عجیب وغریب سیاسی اتحاد سے منتظم کر دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ایک بلند نظر ماہرِ تعلیم، علمِ ادب کا مربی، کلیسا کا محافظ اور ایک جنگجو مبلغ تھا۔ وہی شخص تھا جس کو پاپا نے شاہنشاہِ روما کا مدتوں سے فراموش شدہ لقب عطا فرمایا (۸۰۰ء)

مقدس سلطنتِ روما — ۸۰۰ء میں چارلس اعظم کی تاج پوشی سے مغرب میں سلطنتِ روما کی برائے نام بحالی زمانۂ متوسط کی تاریخ میں ایک نہایت عجیب وغریب اور غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس سے خاص طور پر روما کی روایات کی برقراری اور پاپائیت کی قوت ثابت ہوتی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیسے رومیولس آگسٹس کے ۴۷۶ء میں تخت سے اتارے جانے کے معنی بظاہر صرف یہی تھے کہ روما کا شہنشاہی اقتدار سب کا سب اُس حکمران کی شخصیت میں جمع ہو گیا جو قسطنطنیہ پر متمکن تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیسے مغرب کے وحشی بادشاہوں کو دنیا کے اصل فرمانروا سے شہنشاہی عہدے کا نشان حاصل کرنے کی تمنا تھی۔ پھر ہم یہ بھی ملاحظہ کر چکے ہیں کہ شاہنشاہ جسٹنطین نے رسمی اقتدار سے مطمئن نہ ہو کر گو تھوڑے عرصہ کے لئے ہی سہی روما کی اصلی حکمرانی کو کھوئے ہوئے لاطینی صوبوں پر پھر قائم کر دیا۔

جسٹنطین کے اطالیہ کی مشرقی گاتھی بادشاہت کو تباہ کر دینے کے اہم اور زیادہ تر بُرے نتیجے ہوئے۔ قسطنطنیہ اپنی فتوحات کی حفاظت نہ کر سکا۔ ۵۶۸ء میں لومبارڈی وحشیوں نے جولی ایلپس کو عبور کیا اور وہ سارے میدانی علاقے میں آباد ہونے لگ گئے۔ لیکن انہوں نے سارے اطالیہ پر قبضہ نہ کیا کیونکہ اُن کے پاس فصیل والے شہروں کو سر کرنے کا ساز و سامان نہ تھا نہ انہیں ایسا کرنے کی خواہش تھی۔ لہٰذا وینس نیپلز اور بالخصوص روما جیسے شہروں پر کبھی اُن کا قبضہ نہ ہو سکا اور وہ بظاہر بازنطینی شاہنشاہ کی رعایا بنے رہے۔ لیکن اُدھر بازنطینی شاہنشاہ اپنے ایشیائی صوبوں کی بغاوتوں میں اتنا منہمک تھا کہ وہ اپنی اطالوی رعایا کی کسی طرح نگہداشت نہ کر سکا۔ علاوہ بریں بازنطینی شاہنشاہ

اور مشرقی کلیسا جس پر اُسے اختیار حاصل تھا لغو الحادوں اور ضرر رساں تفرقوں میں پڑ گئے یہاں تک کہ آخر کار پاپائیت کے لئے قسطنطنیہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ناممکن ہوگیا + سنہ ۸۰۰ء میں پوپ لیو سوم نے کچھ تو بازنطینی حکمرانی سے قطعی انحراف ظاہر کرنے کے لئے اور کچھ اطالیہ میں ایک واقعی زبردست فرماں روا کی محافظت حاصل کرنے کی غرض سے سنہ ۸۰۰ء میں کرسمس کے دن یونانی شاہنشاہ کو چھوڑ کر فرنگی شاہنشاہ کی خدمت میں اپنی اطاعت پیش کی۔

یہ مقدس سلطنتِ روما جو یوں ظہور میں آئی بجائے ایک حقیقی ارادہ کے محض ایک خیال تھا + اس کا وجود صرف دلچسپی لینے والوں کے تخیل میں ایک سراب کی مانند تھا + لیکن یہ سراب فرنگی دانشمندی کے لئے بغایت نقصان دہ ثابت ہؤا + یہ اسی کی وجہ تھی کہ شارلمین اور اُس کے جانشین جرمنی میں حکومت کے فرائض ادا کرنے کے بجائے اطالیہ میں بے معنی یورشوں اور دنیا کے مسخر کرنے کے خوابوں میں ہمہ تن منہمک رہے +

نظامِ جاگیرداری ۔ شارلمین کے عہد کا زمانہ سادگی استواری اور امن وامان کا زمانہ تھا + ہندوستان کے حدود سے لے کر بحرِ اوقیانوس کے ساحلوں تک متمدن دنیا چار عیسائی اور دو مسلمان عظیم الشان سلطنتوں پر مشتمل تھی ۔ اِن چاروں کے مابین ایک نہایت جچا تُلا توازنِ قوت موجود تھا ۔ ایک طرف مقدس سلطنتِ روما اور خلافتِ بغداد تھیں اور دوسری طرف اُن کی حریف بازنطینی سلطنت اور امارتِ قرطبہ ۔ سیاسی طمانیت میں کسی قسم کا فضول مذہبی جوش رخنہ انداز نہ تھا ۔

لیکن شارلمین کی موت کے بعد ۸۱۴ء میں بادلوں کے دل کے دل پھر شمال سے اُٹھے اور عیسائیت اور اسلام دونوں پر بربریت کا ایک نیا طوفان جیسا پہلے شاید کم کبھی آیا ہوگا ٹوٹ پڑا + "شمالی" وحشی اور خانہ بدوش یکبارگی متمدن و شائستہ جنوب پر آ پڑے اور دو صدیوں تک انہوں نے قتل وغارت کا بازار گرم رکھا + کسی زمانے کو "زمانۂ تاریکی" کہا جا سکتا ہے تو بلا شبہ وہ ۸۵۰ء سے ۱۰۵۰ء تک کا زمانہ تھا +

خانہ بدوشوں کے بہت سے گروہوں میں سے جنہوں نے قفقاز سے لے کر کارپیتھین تک کی سرحدوں پر یورشیں کیں سب سے زیادہ خوفناک لوگ میگیار تھے جو زبردستی وادئ ڈنیوب کے اندر آ گھسے پھر جرمنی اور اطالیہ میں لوٹ مار کرکے ہنگری میں آ بسے + نئے شمالی حملہ آور وہ ہیبت ناک بحری قزاق تھے جو سیکنڈے نیویا میں اپنی کھاڑیوں سے نکل کر عیسائی دنیا میں چاروں طرف تاخت وتاراج کرنے لگے + وہ خونخوار کافر تھے جنہوں نے کلیساؤں اور خانقاہوں پر بدترین ظلم ڈھائے + انہوں نے انگلستان پر دھاوا کیا اور آخر کار وہ دریائے ٹیمز سے لے کر دریائے ٹائن تک کے سارے ساحل پر آباد ہوگئے ۔ شمال کی طرف وہ آرکنیز شیٹلینڈز ہیبرڈیز اور فیروز پر قابض ہوگئے + آئس لینڈ (برفستان)

اور گرین لینڈ (سبزستان) میں اُن کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں بلکہ وہ امریکہ بھی پہنچ گئے (سنہ ۱۰۰۰ء) انہوں نے فرنگیوں کی پُررعب سلطنت کا خاتمہ کردیا اور اُس کی سرحدوں پر جا بجا چھاپے مارنے کے بعد وہ نارمنڈی (۹۱۱ء) میں بس گئے۔ مشرق کی طرف بھی انہوں نے قدم بڑھایا اور بحیرہ ہائے بالٹک اور اسود کے درمیان کے بکھرے ہوئے سلافی لوگوں پر اپنی حکومت جما کر انہوں نے روس کی سلطنت کی بنا ڈالی۔

شارلمین کے جانشین آپ اپنے وقت کے اُن خطرات کا سدباب کرنے کے بالکل ناقابل ثابت ہوئے۔ وہ کمزور تھے۔ اپنے پادریوں کے آگے سرنگوں رہتے تھے اور خاندانی جھگڑوں اور خانہ جنگیوں میں گرفتار تھے۔ وہ سلطنت جس پر اُن کی حکومت تھی اتحاد سے عاری تھی اور وہ فرنگیوں کی اس حماقت سے کہ وہ شاہی خاندان کے مختلف ارکان میں تقسیم قوت کے خوگر ہوگئے تھے اور بھی زیادہ کمزور پڑتی گئی۔

نویں صدی میں مرکزی طاقت کے عام انتشار کے دوران میں عیسائیت کے لئے لازم ہوگیا کہ بربادی سے بچنے کے لئے وہ اپنے تئیں جاگیری روش پر منتظم و محفوظ کرلے۔ قلعے اور فصیلی برج ہر طرف نظر آنے لگے۔ بے بس آزاد رعایا نے اپنے تئیں مقامی رؤسا کے سپرد کردیا کہ اُن کی خدمت تواضع کرکے جان کی امان پائیں۔ حکومت کی ذمہ داریاں اور اختیارات بے شمار چھوٹے چھوٹے شہزادوں اور "معدودی" بلدیوں میں منقسم ہوگئے۔

صلیبی لڑائیاں ۔ جاگیرداری نظام نے بلاشبہ مغربی عیسائیت کو کفار کے اُس طوفانِ بے تمیزی سے جو نویں اور دسویں صدی میں اُس پر ٹوٹ پڑا بچائے رکھا۔ لیکن سنہ ۱۰۰۰ء تک یہ خطرہ دُور ہوچکا تھا بحری قزاقوں کی لُوٹ مار ختم ہوچکی تھی اور وہ لٹیرے جو انگریزی "ڈین لا" اور فرنگی "نارمنڈی" میں آباد ہوگئے تھے بپتسمہ لے چکے تھے اور عیسائی تمدن اختیار کرچکے تھے۔ خانہ بدوش ہنگیاروں نے بھی اپنی خانہ بدوشی چھوڑ دی، پاپائیت کے آگے سرِ تسلیم خم کردیا اور اُن کی ہنگری کی مملکت عیسائی قوموں کے دائرے میں لے لی گئی۔ وہ کالی گھٹائیں جو یورپ پر دو سو سال تک چھائی رہیں چھٹ گئیں۔ زمانۂ تاریکی کا خاتمہ ہوا۔ ایک نئی اور معمور زندگی کی ضیا و مسرت عیسائی دنیا کے کونے کونے میں ظاہر ہونے لگی۔ آخر کار رومی اور ٹیوٹنی کے درمیان مصالحت ہوکر وہ زمانۂ متوسط کے سچے آدمی بن گئے۔ علم ادب اُبھرا۔ قانون جلا پانے لگا نئے ایجادات ظہور میں آئے۔ نئے نویلے خیالات حکما کے دل میں چٹکیاں لینے لگے۔ دینیات کا تخیل حرکت میں آیا۔ فلسفہ پھر چمکا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فن نے اپنا سر نکالا اور خوش منظر گاتھی طرزِ تعمیر زمانۂ وسطیٰ کے خیالات و تصورات کی سچی عظمت کو نمایاں کرنے لگی۔

یہ تھی وہ پُرامن و متناسب اور زندہ و باہمت عیسائی دنیا جس نے مسلمان "کافروں" کے خلاف باطمینی

سلطنت کی چیخ پکار اور ارضِ مقدس کی دلگداز صدا سُنی۔ نکمّے جاگیردار اور بڑے بڑے اُمرا جو شہرت کے پیاسے
اور جوع الارض کے مارے تھے ترقی یافتہ شہر جو ایشیائی تجارت حاصل کرنے کے تمنائی تھے۔ کاشتکار جو جاگیرداری
خدمات ادا کرتے کرتے چُور ہو گئے تھے۔ متقی۔ زائرین جن کا تن من شہادت کی آگ میں جلنے کے لئے بے تاب
تھا۔ پوپ اور مجتہدین جو اپنے مذہب کے گہوارے کو اپنا بنا لینے کے لئے بے قرار اور لیوانت میں حواریوں کے
عہد کے صدر اسقفی صوبے حاصل کرنے کے آرزومند اور ہمہ گیر کلیسا کے مدتوں کے منقطع شدہ ٹکڑوں کو جوڑ
لینے کے واسطے مضطرب تھے۔ عیسائی دنیا کے اِن سب مختلف نمائندوں کے لئے مشرق کی طرف بڑھنے کا نعرہ
انتہا درجہ موثر اور ولولہ خیز تھا۔

تاریخِ دنیا میں ایسی گھڑیاں اکثر آئی ہیں جب اک ظلمت سے ابھرتی ہوئی قوم یا مجموعۂ اقوام کے دل و
دماغ میں ایسے جذبات نے ایک ہیجانِ عظیم برپا کر دیا ہے جن کی ترکیب میں راستی و ناراستی اور فہم و ناعاقبت
اندیشی کے عناصر بیک وقت شامل ہو گئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں عہدِ نپولین کی داستان اور تازہ ترین جنگِ فرنگ
کے واقعات اِسی ضمن سے ہیں۔ کچھ ایسی ہی تھیں صلیبی لڑائیاں جن کے دوران میں یورپ اپنے سر کو جس میں
اب پیشتر کی بہ نسبت عقل و خرد کے خون کا زیادہ دور دورہ تھا اسلامیوں کی مضبوط چٹانوں سے مدتوں تک بے سود
پٹکتا رہا۔

صلیبی نعرے کا سب سے پہلے سننے والا پوپ گریگوری ہفتم (ہلڈ برینڈ) تھا جس کے سامنے بازنطینی شاہنشاہ
نے منت سماجت کے ساتھ ایک درخواست ۱۰۷۳ء میں مان زی کرٹ کی تباہ کن جنگ کے دو سال بعد بھیجی۔
اُس نے شاہنشاہ کی خواہش کے پورا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن وقت یہ تھی کہ وہ ادھر نظامِ جاگیرداری کے
ساتھ ایک کشمکش میں جسے مباحثۂ رسم تشریف کہتے ہیں مبتلا ہو رہا تھا۔ ۱۰۹۵ء میں جو درخواست پوپ اربن دوم کے
آگے کی گئی وہ زیادہ کامیاب ہوئی۔ اُس نے کلیسا کی انجمن کے پے درپے دو جلسے کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
عیسائیت بیک ساعت متفق ہو کر اُٹھی اور مشرق پر جا پڑی۔

بشیر احمد

حُقّہ

ہے خاک میں جوشِ آب کا آتش کا ہوا کا
دریائے عناصر میں ہے طوفان بلا کا
یعنی لبِ شاعر پہ ہے پیغام خدا کا
سب ہاتھ اٹھاؤ کہ ہے یہ وقت دعا کا

اس شان سے اس طرز سے حقّے کی ثنا ہو
ہر طرف سے اک نعرۂ یا صلِّ علیٰ ہو

دیکھو نہیں معشوق سے کم بانکپن اِس کا
کیا حسن کے سانچے میں ڈھلا ہے بدن اِس کا
ہے پھولوں کی چادر سے بنا پیرہن اِس کا
پھولا پھلا رہتا ہے ہمیشہ چمن اِس کا

سوزاں ہے چلم آتشِ رُخسار کی صورت
اور اُس پہ دھواں گیسوئے خمدار کی صورت

جو بات ہے حقّہ میں کسی شے میں نہیں ہے
یہ کیفیت افیوں میں نہیں مے میں نہیں ہے
گڑگڑ سا ترنم بھی کسی نے میں نہیں ہے
جو لطف ہے اِس نے میں کسی نے میں نہیں ہے

اللہ رے بلاغت تری اللہ رے آواز
اعجاز ہے اعجاز ہے اعجاز ہے اعجاز

حقّے کا جو دشمن ہے وہ انسان کا دشمن
ہوش و خرد و عقل کا اوسان کا دشمن
ایمان کا ایقان کا عرفان کا دشمن
ہندو کا مسیحی کا مسلمان کا دشمن

دنیا کے لئے باعثِ عشرت ہے تو یہ ہے
عقبیٰ کے لئے چشمِ بصیرت ہے تو یہ ہے

دنیا میں مساوات ہے حقّے ہی کے دم سے
تخصیصِ ملاقات ہے حقّے ہی کے دم سے
خاطر ہے مدارات ہے حقّے ہی کے دم سے
جو چیز ہے جو بات ہے حقّے ہی کے دم سے

ہستی میں اولوالعزمیٔ ہمت ہے تو حقہ
پستی میں خیالات کی رفعت ہے تو حقہ

محفل میں ہوں یا بیٹھے ہوں آرام سے گھر میں — یا جاتے ہوئے ہوں کہیں گاڑی کے سفر میں
ہے اس کا دھواں سینے میں اور شکل نظر میں — یہ دلبر دمساز یہ معشوق ہے بر میں

ہم اور کسی شے کا اجارا نہیں کرتے
حقے کی جدائی کو گوارا نہیں کرتے

ہے چرخ پہ جب تک رخ خورشید منور — اور فرش پہ تابندہ ہیں جب تک زر و گوہر
جب تک مئے توحید کے چلتے رہیں ساغر — جب تک ہے ترا نام زمانے کی زباں پر

یارب تو جو دائم ہے تو دائم رہے حقہ
یہ بزم سلامت رہے قائم رہے حقہ

مرسلہ عبدالغفور مہجور

تاثرات

ترے حجاب میں ہے شانِ بے حجابانہ — حریم راز ہے تیرا جہانِ افسانہ
جمالِ یار! تجھے بے نیازیوں کی قسم — بس ایک جلوہ "بشانِ نیازمندانہ"
وہ لب کھلیں تو تڑپ جائیں سینکڑوں نغمے — وہ آنکھ اُٹھے تو برس جائے کیفِ میخانہ
ابھی تو دُور ہے رسوائی گناہِ نظر — کہ پردہ پوش ہیں انداز ہائے مستانہ
نگاہِ غیر! محبت کی لغزشوں کو نہ دیکھ — کہ یہ جہان ہے "نا آشنائے بیگانہ"

روشؔ جو کوئی نگاہِ عمیق سے دیکھے
ہر ایک ذرۂ تاریک ہے ضیا خانہ

روش صدیقی

اقوالِ زرّیں

تمہارا محبت آمیز سلوک تمہیں دائرۂ احباب کا مرکز بنا دے گا۔ اپنے تئیں پاک اور دلکش بنائے رکھو۔ ایک عالم کو تمہارے ساتھ بے غرض محبت اور حقیقی عشق پیدا ہو جائے گا۔

عالمگیر وہی ہے جس نے اپنے نفس کو فتح کیا ہو۔

صحیح خیالات اور صحیح کوششیں لامحالہ صحیح نتائج پیدا کریں گی۔

بے عقل انسان اپنے حصولِ مقصد کی محض خواہش کرتا ہے اور بے صبری کا اظہار۔ خلاف ازیں ایک عاقل کامیابی کے لئے سچی کوشش کرتا ہے اور انتظار۔

ہر وہ شخص جو اپنی ذات پر حکومت کر کے اپنے تئیں قابو میں رکھ سکتا ہے صحیح معنوں میں دوسروں پر حکمرانی کرنے کا مجاز ہے۔

پہلی منزل میں صحیح خیالات میرے ساتھ ساتھ تھے اور دوسری میں پاکیزگیٔ کلام تیسری منزل میں نیک اعمال کی ہمراہی نے مجھے یکایک اُس تخت پر متمکن کر دیا جو فردوس بریں کو مزیّن کئے ہوئے تھا۔

ہر تندرست و توانا شخص جو صبح دم کے خاموش اور بے بہا لمحات کو نیند کے خمار میں ضائع کرتا ہے ہرگز ہرگز عظیم الشان رفعت حاصل نہیں کر سکتا۔

جیسے سورج کی روشنی سے ایک نابینا شخص محروم رہتا ہے اسی طرح صداقت کے ضیا پاش نور سے محض وہ لوگ محروم رہتے ہیں جن کی بصیرت پر خود غرضی نے چھاپا مار کر اُنہیں بصارت سے محروم کر دیا ہو۔

سخاوت و صداقت لازم و ملزوم ہیں۔ جس انسان میں سخاوت کا عنصر غالب ہو اُس کی فطرت میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

جس طرح ہر شے کا سایہ اُس کے ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے اور آگ پر پھونکنے کے بعد دھوئیں کا اُٹھنا لازمی ہے۔ اسی طرح ہمارا ہر فعل اور ہمارا ہر عمل تاثرات سے بری نہیں۔ ہماری ہر عشرت اور ہماری ہر حسرت ہمارے خیالات اور ہمارے اعمال کا لازمی نتیجہ ہیں۔

ماخوذ ــــــ سیّد نیاز احمد ترمذی

رتناولی

(یہ کہانی سری ہرش دیو والیٔ قنوج کے رتناولی ناٹک سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں چند نہایت دلآویز ڈرامے لکھے جنہیں سنسکرت زبان میں درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پراچین ہندوستان کے ادیب پلاٹ کی ترتیب پر کس قدر قدرت رکھتے ہیں)

کسی زمانہ میں وتس (موجودہ الہ آباد) کا ایک راجہ اپنی راجدھانی کوسمبی میں راج کرتا تھا جس کا نام اُدین تھا اُس کے منتری یگندرائن کو یہ لگن تھی کہ کسی طرح اُس کا سوامی پرتھوی راج ہو جائے۔ آخر ایک رشی نے اُسے بتایا کہ سنہال (سیلون) میں بکرم باہو ایک راجہ ہے جو تمہاری مہارانی واسودتا کا ماموں ہے اُس کی ایک بیٹی ہے جسے رتناولی کہتے ہیں اس سے تمہارے راجہ کی شادی ہو تو پرتھوی راج کا تلک ملے۔

یہ سُن کر یگندرائن نے کسی کو کانوں کان خبر نہ کی اور چپکے سے ایک ایلچی سیلون روانہ کر دیا کہ رتناولی کا ڈولا لے آئے۔ جب ایلچی سیلون پہنچا تو بکرم باہو ویسے تو بڑے تپاک سے پیش آیا مگر رشتہ سے اس لئے انکار کیا کہ بیٹی کو بھانجی کا سَوت بنانا اچھا نہیں۔ ایلچی اپنا سا منہ لے کر چلا آیا مگر یگندرائن کے دل پر اُس کا کچھ اثر نہ ہوا اور اُس نے سیلون میں اپنے آدمی بھیج کر یہ خبر اڑا دی کہ رانی واسودتا کے محل کو اچانک آگ لگ گئی اور وہ جل کر خاکستر ہو گئی۔ یہ بات اڑتے اڑتے بکرم باہو کے کانوں تک پہنچی اور اُس نے اسے سچ سمجھا۔ جب یگندرائن کو پتہ ملا کہ بکرم باہو پر اُس کا جادو چل گیا تو اُس نے وہی سندیسہ دے کر ایک اور ایلچی اُس کے پاس بھیجا۔ اب انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ راجہ نے اپنے ایک اہلکار واسوبھوٹ کے ساتھ رتناولی کو جہاز پر سوار کر دیا۔ اکلوتی بیٹی کو جس قدر بھی جہیز ملے تھوڑا ہے مگر اُس نے رتناولی کو جو موتیوں کی مالا دی اُس کا جواب دنیا بھر میں نہ تھا۔ ایک لڑی کی مالا تھی مگر ساری دنیا کے جوہری اُس کی قیمت نہیں آنک سکتے تھے۔ جہاز کچھ دن تو آرام سے چلتا رہا لیکن ایک دن سمندر میں طوفان آیا جہاز بھنور میں پھنسا اور ڈوب گیا۔ رتناولی سمندر میں غوطے کھا رہی تھی بس معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا ایک اور ریلا اُس کے پران لے کر رہے گا۔ اتنے میں کوسمبی کے ایک سوداگر کا جہاز وہاں آ نکلا۔ اُس نے یہ نظارہ دیکھتے ہی جھٹ اپنے ملاحوں کو اُس کے بچانے کا حکم دیا۔ ملاح کود پڑے اور ادھ مری رتناولی کو ہاتھوں ہاتھ جہاز پر پہنچا دیا۔ سوداگر کو جب رتناولی کا حال معلوم ہوا تو اُس نے بادبان

کا رخ پھیرا اور کوسمبی کو واپس چل پڑا جب وہاں پہنچا تو سیدھا گیندرامن کے پاس گیا۔ ساری رام کہانی سنائی اور رتناولی کو اُس کے سپرد کر کے چلا آیا۔ منتری رتناولی کو لے کر مہارانی واسودتا کے پاس گیا اور کہا کہ ایک سوداگر کو یہ لڑکی سمندر میں ڈوبتی ہوئی ملی تھی لیکن اس کا کچھ اور حال اُسے معلوم نہ تھا۔ شکل صورت سے کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ مہارانی کی داسیوں کی سوبھا بڑھائے گی۔ واسودتا نے مان لیا اور سمندر کو دھیان میں رکھ کر اُس کا نام ساگریکا رکھا۔ لاکھوں داسیوں کی مالکہ پرتھوی راج کا تلک دلانے والی رتناولی آج ہاتھ باندھے داسیوں کی قطار میں کھڑی ہے مایا مایا نیرے کھیل نیارے۔

ہولی کے دن تھے سارا شہر رنگ رلیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ رنگ اُڑ رہا تھا۔ ہون ہو رہے تھے۔ ہولی کے گیت گائے جا رہے تھے۔ رنواس میں پوجا کی تیاریاں ہو چکیں تو رانی نے آ کر سب کچھ دیکھا بھالا تسلی ہوئی تو ایک داسی کو راجہ کے بلانے کو بھیجا رانی کے پاس ساگریکا کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے کی دمک سورج کو ماند کر رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پریم کی دنیا سوتی تھی۔ گدرایا ہوا جوبن سڈول جسم سے مل کر جادو سماں پیدا کر رہا تھا اُس کے سادے لباس میں ہزار چھبن تھی۔ اُس کی سادگی پر لگاوٹ مٹی جا رہی تھی۔ اُس کی زبان پر کھلاوٹ نثار ہوتی تھی۔ اُس کا نیچی نظروں سے دیکھنا دیکھنے والوں کو سنسار کے آثار چڑھاؤ دکھا رہا تھا۔ رانی ایک نظر میں بھانپ گئی کہ ساگریکا کو راجہ کی نظروں سے اوجھل رکھنا رنواس کے راج کی خیر منانا ہے راجہ نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا ہی تھا کہ ساگریکا کسی کام پر بھیجی گئی۔ آسمان سمجھ گیا کہ چاند سورج کی جوت سے ڈر کر منہ ڈھانپ رہا ہے۔ ساگریکا سامنے سے ٹل تو گئی مگر ایک درخت کی اوٹ سے کر پوجا کا نظارہ دیکھنے لگی۔ دیوتا کی پوجا ہو چکی تو رانی اپنے سوامی کی پوجا کرنے لگی۔ ساگریکا نے راجہ کو دیوتا سمجھا۔ اسے بڑا اچنبا ہوا کہ ہندوستان میں جیتے جاگتے چلتے پھرتے دیوتا پوجا کے وقت پر کاشت ہوتے ہیں۔ پاس تو نہ جا سکتی تھی وہیں کھڑے کھڑے پوجا کی رسمی ادا کر کے ایک طرف کو نکل گئی۔ اتنے میں بھاٹ آ گیا اور کبت اچارنے لگا۔ اب ساگریکا سمجھ گئی کہ وہ دیوتا نہ تھا بلکہ وتس کا راجہ تھا جس سے اُس کی شادی قرار پائی تھی دیوتا ہو یا راجہ اُس کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی اور ہٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔

پوجا کے ساتھ ساری چہل پہل ختم ہوئی اور رنواس میں ہولی کا کام کاج ہونے لگا تو ساگریکا چنبیلی کے جھنڈ کی تنہائی میں اپنے خیالوں سے کھیلنے لگی۔ بھوج اس کے سامنے تھا اور گیروے کی ڈلی ہاتھ میں۔ بے خبری کے عالم میں بے پروائی کے انداز سے وہ کچھ لکیریں کھینچتی رہی لیکن تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتی ہے کہ ان لکیروں نے ایک تصویر کی شکل اختیار کر لی ہے اُس کے اچنبے کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ یہ ہو بہو اُس تصویر کا چہرہ ہے جو کبھی اُس سے

دل ہی آنکلتی ہے اور کبھی اُس کی آنکھوں سے جھانکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ لگن پھل سے بے پرواہوتی ہے اور یہ بھی درست کہ حسن کا پرتو آنکھوں پر ایسی پٹی باندھتا ہے کہ انجام کا دھڑکا نظروں میں نہیں جچتا مگر یہ مدن کے سدھ پجاریوں کی باتیں ہیں۔ ساگریکا نے پہلی بار اِن مہاراج کو پرنام کیا تھا۔ اس لئے اُس کا کوئی دوش نہیں کہ کیوں اُس نے رسوائی کے کھٹکے سے لپٹے اس پریم پتر کو پھاڑنے کا دھیان کیا۔ بدھی کہتی تھی اری کیا کرتی ہے آگ سے نہ کھیل۔ مٹا دے۔ اس کا نشان تک نہ رکھ۔ دھو ڈال۔ لگن چلاتی تھی بنّو ایسی چیزیں ہر روز نہیں ملا کرتیں ان کی اس دین کو بسنت کی اس نشانی کو سنبھال کر رکھ۔ ہوا تک نہ لگنے دے۔ ساگریکا جذبات کی اس جھوڑ کے تماشے میں مگن تھی کہ ایک اور داسی سوسنتگا دبے پاؤں آئی اور پیٹھ پیچھے سے تصویر اُڑا لی۔ اُسے دیکھ کر پوچھا "اچھی کس کی تصویر بنائی ہے؟" ساگریکا نے جواب دیا "وہی دیوتا تو ہیں جن کی آج پُوجا ہو رہی تھی۔ سوسنتگا بولی پر ایک کسر رہ گئی۔ دیوتا جی مہاراج اکیلے گھبرا رہے ہونگے۔ اُن کی دیوی بھی پاس برجتی تو بات تھی" یہ کہہ کر اُس نے رنگ اُٹھایا اور ساگریکا کی سورت بنا دی۔ سہیلیوں میں ہنسی ٹھٹھول بول چال میں داخل ہے ایسی باتوں کی اتنی ہی کائنات ہوتی ہے کہ اِدھر سُنی اُدھر بھلا دی۔ بس۔ پر اس میں ایک راز کھل رہا تھا۔ اس لئے ساگریکا بہت بگڑی مگر اس بگاڑ نے بناؤ کی صورت پیدا کر دی۔ اُس کا چہرہ کنول روپ ہو گیا۔ اور پسینے نے اس پر اوس برسا کر وہ سمان پیش کیا کہ اگر اندر بھی دیکھتے تو جھوم جاتے۔ سوسنتگا ساگریکا کی طرح الہڑ کنیا نہ تھی وہ جانتی تھی کہ کام دیوتا جب کسی پر ریجھتے ہیں تو اُس کی کیا گت بناتے ہیں۔ اُسے پتہ تھا کہ مدن کے بان جو گھاؤ کرتے ہیں اُن کو جھانک کر دیکھو تو دل کی دنیا ہتھیلی کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ ساگریکا کی یہ گرمی دیکھ کر سوسنتگا ہنس پڑی اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے ساگریکا کو ایسا بھایا کہ اُس نے اپنے دل کی بات اُسے کہہ سنائی۔ سوسنتگا نے اُسے لاکھ ڈھارس بندھائی پر وہ اس واقعہ کو سپنا ہی سمجھتی رہی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ اِن باتوں کا تانتا نہ ٹوٹنے پائے۔ اِن میں ایک رس تھا، ایک نشہ تھا جس کا مزہ اُس نے آج تک نہ چکھا تھا۔ ہر لفظ جو سوسنتگا کے منہ سے نکلتا تھا ساگریکا کے کانوں تک پہنچتے ہی راگنی بن جاتا تھا۔ اتنے میں ہلڑ ہؤا کہ طویلے سے ایک بندر چھوٹ کر رنواس میں گھس آیا ہے اور جو اُس کے ہتے چڑھتا ہے اُسے نوچ ڈالتا ہے۔ یہ سُن کر ساگریکا اور سوسنتگا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ تصویر کو وہیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اور دور کھڑی ہو کر تماشا دیکھنے لگیں۔ راجہ کے بدوشک وسنتک پیٹ پکڑے دوڑ رہے تھے انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ آج ہنومان بلیدان لے کر رہیں گے۔ جب ہانپ گئے تو چنبیلی کے اُس جھنڈ میں گھس گئے اور دم لینے کے لئے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ راجہ بھی ساتھ لگا ہنستا ہؤا پہنچ گیا۔ اصل

میں یہ صرف دل لگی تھی۔ وسنتک کو بنانا چاہتے تھے۔ نہ کوئی بندر چھوٹا نہ رنواس میں آیا۔ راجہ کی شکل دیکھی تو وسنتک کی ڈھارس بندھ گئی۔ اوسان درست ہوئے تو سامنے تصویر پڑی پائی۔ اٹھائی اور راجہ کو دے دی۔ وسنتک جی کو اپنے سوا کسی کی شکل نہ بھاتی تھی اور اس لیئے انہیں کسی کی تصویر کو دیکھنا تک گوارا نہ تھا۔ راجہ کی نظر تصویر پر پڑی تو اچھل پڑا۔ ساگریکا اور سوسنتگا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور یہ سننے کے لیئے کان لگائے کھڑی تھیں کہ راجہ کیا کہتا ہے۔ راجہ نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور اُس مصوّر کو جس نے اُس کی تصویر بنائی تھی آسمان پر پہنچا دیا۔ اب سوسنتگا آگے بڑھی اور کہنے لگی کہ مہاراج بناؤ کا سماں ہے میں نے اتنے جتن سے اپنی سہیلی ساگریکا کی تصویر بنائی اور وہ الٹا مجھ سے بگڑ رہی ہے۔ اب سرکار ہی بیچ بچاؤ کرا دیں تو بات بنتی ہے۔ راجہ اور وسنتک دو سہیلیوں کی صلح کرانے چلے۔

ساگریکا انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر کچھ کھو سی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاجونتی کی ڈالی جسے کسی نے چھوُا ہو جھوم رہی ہے۔ ساگریکا کو دیکھ کر وسنتک جی کی آنکھیں چندھیا گئیں اور ایسے بوکھلائے کہ چلا کر کہنے لگے "اوہو اوہو۔ اس کے سامنے اوپسرا ایَن کیا مال ہیں۔ سنسار میں ایسی اُوپ روپی سندری کہاں سے آگئی برہما بھی اس کی ٹکر کی لڑکی پیدا کرنے سے رہے۔ جب اسے بنایا ہوگا تو حضور نے بھی گھڑیوں اپنے ہاتھ چومے ہونگے مہاراج یہ دیوی بھولی دکھائی دیتی ہے اور برہمن کا پیٹ بھی خالی ہے۔ کہیں تو بھوجن کا سربندھ ہو جائے!" یہ انوکھی باتیں سُن کر ساگریکا پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ ہرن کی طرح بھاگنے لگی۔ مگر راجہ نے کلائی پکڑ لی۔ اب ساگریکا ایک بے روح بدن ایک بے حس بُت تھی جس میں چلنے پھرنے بولنے چالنے کی سکت نہ رہی تھی۔ ابھی راجہ کے ہزاروں سوالوں میں سے اُس نے ایک کا بھی جواب نہ دیا تھا کہ وسنتک نے رانی آگئی، رانی آگئی کی ہانک لگائی۔ یا اُس نے رانی کو دُور سے آتے دیکھ لیا تھا۔ ہر صورت میں تھوڑی دیر کے بعد رانی سچ مچ آتی دکھائی دی اور راجہ نے وسنتک سے کہا کہ جھٹ پٹ تصویر کو چھپائے تاکہ رانی نہ دیکھنے پائے۔ وسنتک نے تصویر تو بغل میں داب لی اور تھوڑی دیر کے بعد بھول گئے۔ مگر باتوں ہی باتوں میں جوش آگیا اور ہاتھ کھل گئے اور تصویر زمین پر آرہی۔ ایک داسی نے اُٹھا کر رانی کو دے دی۔ اپنے پتی کے پہلو میں غیر استری کی تصویر کو دیکھ کر رانی آگ بگولا ہوگئی۔ ترچھی نظروں سے راجہ کو دیکھا۔ زہر بھری آنکھ وسنتک پر ڈالی اور انہوں نے سمجھا کہ اس بگڑی ہوئی بات کا بنانا اس کا کام ہے۔ وسنتک نے راجہ کو اشارہ کیا کہ گھبرائیے نہیں۔ چٹکیوں میں سب کچھ راس کئے دیتا ہوں یہ کہہ کر رانی کی طرف منہ کر کے بولے "مہارانی آپ نے دیکھا اب سرکار کا ہاتھ کس قدر صاف ہوگیا

ہے اور اپنی تصویر کیا پیاری اتاری ہے"۔ راجہ نے اس طرح مسکراتے ہوئے دیکھا۔ گویا داد مانگ رہے ہیں۔
رانی نے راجہ سے کہا " یہ دوسری کون اس ٹھسے سے بیٹھی ہیں"؟ راجہ نے جواب دیا " یہ صرف خیال کی پیدائش
ہے اس کی اصل آج تک ہم نے نہیں دیکھی"۔ وسنتک نے جھٹ جنیو ہاتھ میں لے کر کہا " مہارانی۔ سرکار سچ
کہتے ہیں برہمن بھی سوگند کھا رہا ہے کہ آج سے پہلے ایسی شکل دیکھی ہو تو دیدے پھٹ جائیں"۔ ساگریکا کو تو وہ
پہچان گئی مگر اس تصویر کی پہیلی اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔

رانی نے اپنے خاص بھروسے کی داسیوں سے صلاح کی۔ نِرا چلتر کا جادو جاگا۔ بہت سوچ بچار کے بعد
یہ ٹھہری کہ وسنتک سے کہا جائے کہ ساگریکا رانی کے کپڑے پہن کر پھول بن کے نچلے حصے میں راجہ سے ملنا چاہتی
ہے۔ اگر یہ چال پٹ پڑی تو بھانڈا صاف پھوٹ جائے گا۔ یہ چال پوری اُتری اور راجہ اس بات پر راضی
ہوگیا۔ جو جگہ ملاپ کے لئے ٹھہرائی گئی تھی رانی وہاں پہلے ہی پہنچ گئی۔ راجہ آیا اور رانی کو ساگریکا سمجھ کر پریم
بھاؤ کی باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تو رانی چُپ سنتی رہی آخر اُس نے گھونگٹ اٹھایا تو راجہ کی آنکھیں کھلیں۔
رانی بغیر منہ سے بولے چپکے چلی گئی۔ اور اس چپ کی داد یہ ملی کہ راجہ اُسے ڈھونڈنے لگا۔

ادھر ساگریکا راجہ کی تلاش میں باولی ہوئی پھرتی تھی اُس نے سمجھا کہ سب نے مِل کر اُسے بنایا ہے۔ وہ
کچھ ایسی کٹ گئی کہ جان پر کھیلنے پر اُتر آئی۔ اُس نے دوپٹے میں گرہ دے کر اُسے پیپل کے درخت سے لٹکا دیا۔
وہ گرہ میں گردن ڈال کر لٹکنے ہی کو تھی کہ راجہ رانی کو ڈھونڈتا ہؤا آنکلا۔ اور ساگریکا کو رانی سمجھ کر اُسے منانے لگا۔
" جب رانی کی تیوری پر بل آتا ہے تو میں بے کل ہو جاتا ہوں۔ جب وہ اداس ہوتی ہے تو سنسار میری آنکھوں
میں اندھیر ہو جاتا ہے۔ جب وہ بگڑتی ہے تو میں سر جھکا دیتا ہوں"۔ اتنا ہی کہا تھا کہ راجہ کو اپنی غلطی کا پتہ
لگ گیا۔ اور یہ کہہ کر بات کو الٹایا " پھر یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ رانی ہے مگر وہ موتی جو پریم کے ساگر سے
اُچھلتے ہیں، تمہارے پاؤں پر ڈالتا ہوں"۔

رانی ایک درخت کی آڑ سے یہ سب باتیں سُن کے سامنے آئی اور کہنے لگی " مہاراج جو کہتے ہیں دل سے
کہتے ہیں اس میں سندیہ کا سان گمان نہیں"۔ رانی چلی گئی۔ ساگریکا ہوا ہو گئی تو راجہ یہ سوچتا ہؤا اپنے شیش محل کو
گیا کہ ساگریکا کو رانی کے کرودھ کی آنچ سے بچائے۔

راجہ نے ساری رات اسی ادھیڑبن میں گذار دی۔ دن چڑھا تو وسنتک پوجا پاٹ کرکے یہ بڑا تلک
لگا کر آئے۔ راجہ نے چھوٹتے ہی پوچھا " کہو ساگریکا پر کیا گزری"؟ وسنتک نے منہ ڈھیلا کرکے اور رونی صورت

بنا کر کہا" بس کچھ پوچھئے نہیں۔ لٹیا ڈوب گئی۔ اب سنجوگ کی کوئی آس نہیں "۔ راجہ یہ سمجھا کہ ساگریکا چل بسی اور اُسے غش آگیا۔ وسنتک کی کوشش سے جب اُسے ہوش آیا تو وسنتک بولے" مہاراج آپ سنتے سناتے تو ہیں نہیں اور بے ہوش ہونے کو دوڑ پڑتے ہیں۔ اِن دنیا جاری کی باتوں کے بعد مجھے یہ کہنا تھا کہ رانی نے ساگریکا کو اوجین بھیج دیا ہے۔ اور پھر مجھے یہ مالا آپ کو دینا تھا جو ساگریکا آپ کے لئے چھوڑ گئی ہے" راجہ مالا دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔ اُسے چوما، دل سے لگایا، اور گلے میں ڈال لیا۔ اتنے میں اوجین کا ایک مداری آگیا جو بھان متی کے کھیلوں میں جگت گورو مانا جاتا تھا۔ اُس نے کہا مہاراج کیا دیکھیں گے چاند زمین پر اُتر آئے، پہاڑ ہوا میں تیرنے پھریں پانی میں آگ اُگے، چاند کی بغل میں سورج نظر آئے، جو مہاراج چاہیں وہی ہو جانے کہیئے تو وہی سامنے آکر پرنام کرے جو من میں بس رہی ہے "

راجہ نے رانی کو بھی بلا لیا اور تماشا شروع ہؤا۔ برہما کنول پر سوار ہو کر آئے۔ اندر اپنے کمنے ہاتھی پر بیٹھے اپنی ساری رونق سمیت دکھائی دیئے۔ مداری نے اس طرح کے کئی شعبدے دکھائے۔ چاروں طرف واہ واہ ہو رہی تھی۔ کہ یگندرائن کے نوکر داسو بھٹ کو لے کر آئے جو رتناولی کی طرح سمندر سے بچ نکلا تھا۔ تماشا بند ہو گیا تو داسو بھٹ نے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کی۔ ابھی اُس نے تھوڑا سا حال ہی بیان کیا تھا کہ شور مچ گیا۔ اور رنواس میں آگ لگ گئی۔ آگ لگ گئی کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ سن کر مہارانی واسودتا کے اوسان خطا ہو گئے۔ گھبرا کر بولی کہ مہاراج میں ساگریکا کو ایک کوٹھڑی میں بند کر آئی تھی۔ اُس کے بچاؤ کا اپاؤ کیجیئے۔ اگر اُس پر آنچ آئی تو میں کنبے میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ راجہ آگ کی لپٹوں کو پھاندتا ہؤا گیا اور ساگریکا کو نکال لایا۔ یہ آگ نری لاگ تھی جو یگندرائن کے کہنے پر مداری نے لگائی تھی۔ اب رانی نے ساگریکا کا حال بتایا۔ مالا اور داسو بھٹ کی تائید سے ثابت ہو گیا کہ ساگریکا اور رتناولی ایک ہی دیوی کے نام ہیں۔ اتنے میں یگندرائن آئے اور انہوں نے سب اونچ نیچ سمجھائی راجہ بگڑنے کو تھا کہ وسنتک کی باتوں پر سب کو ہنسی آگئی۔ واسودتا بھی مان گئی اور راجہ اوین اور راجکماری رتناولی کی شادی ہو گئی۔

نور الٰہی
محمد عمر

بزم یگانہ

(۱)

کیوں کھول دیئے راز ازل کس نے ناحق
بھٹکے ہیں اب اپنے عمل سے ناحق
ہاں کیوں نہ اٹھے شور انا الحق پیہم
بدنام اٹھے سیب سے بہکے ناحق

(۲)

یاران شباب رات کٹنے کی ہے رت
بجھتا ہے کنول ہوا پلٹنے کی ہے رت
محفل میں جو تھے ہوش سے آگے سب
آنکھیں جھپکنے کی دل اپنے سمٹنے کی ہے رت

(۳)

ہر گام پہ اپنی راہ کٹتے نہ بنی
تھی دل سے لگی کنارہ کرتے نہ بنی
دیوانہ بنا کے کیا کدھر جاتا ہے
منزل کی طرف اشارہ کرتے نہ بنی

(۴)

موجوں سے الجھ کے پار اترنے والے
طوفان بلا سے نہیں ڈرنے والے
جب بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے
کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

میرزا یگانہ لکھنوی

بیش بہا زمرّد

شیفرڈ اپنے پیر کھڑکی کی چوکھٹ پر پھیلائے ہوئے بید کی ایک بوسیدہ کُرسی پر بیٹھا کسی خیال میں محو تھا۔ سوادِ شام پورٹر سٹریٹ کو اپنی سیاہ نقاب میں آہستہ آہستہ چھپا رہا تھا لیکن شام کی تاریکی سے اس سڑک کی کوئی تحقیر نہیں ہوتی تھی۔ اِس لئے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پورٹر سٹریٹ میں کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو کسی راہ گیر کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتی ہو۔

شیفرڈ بیٹھا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ دنیا کے کسی گوشہ میں بیس ہزار روپے کی گراں قدر رقم پنہاں ہے جو میری جائز میراث ہے۔ کاش مجھے یہی معلوم ہو جاتا کہ یہ رقم کہاں پوشیدہ ہے۔ بہرکیف جہاں کہیں ہو، ہے ضرور، مگر میرے لئے تو یہ رقم ایسی ہی ہے جیسے خشک گھاس کے ڈھیر میں ایک سوئی۔

اُس کی اس اُدھیڑبُن کی وجہ یہ تھی کہ ایک سال قبل اڈمنڈ گرانڈن نامی ایک شخص لندن میں مرا۔ یہ شخص کسی وقت بہت دولت مند اور شیفرڈ کا گہرا دوست تھا لیکن نامساعدتِ روزگار کے ہاتھوں اُس کی تونگری کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس کے زوال کے اسباب میں ایک بیش بہا انگوٹھی کا پُراسرار طور پر غائب ہو جانا بھی ایک منحوس سبب تھا۔ اس انگوٹھی میں نہایت نایاب زمرد کا ایک ٹکڑا نصب تھا۔ زمرد کے آس پاس دو چھوٹے چھوٹے ہیرے بھی جڑے تھے۔ مرنے والے نے اپنے وصیّت نامہ میں لکھ دیا تھا کہ یہ گمشدہ انگوٹھی مِل جائے تو شیفرڈ اس کا جائز وارث ہوگا۔ انگوٹھی کے زمرد کی قیمت کم ازکم بیس ہزار روپیہ تھی، لیکن موجودہ حالت میں ایسی وراثت بیس پیسوں کے برابر بھی نہ تھی۔ شیفرڈ مغربی ممالک سے مفلسی اور تہی دستی کی حالت میں واپس آیا اور لندن پہنچتے ہی اس کو اُس وصیّت نامہ کی اطلاع ملی۔ ایسی مفلسی میں لندن کا قیام اُس کے لئے سوہانِ روح ہو رہا تھا۔ اگر ایسے وقت میں یہ بیس ہزار کی رقم اُس کے ہاتھ آ جاتی تو وہ مغربی ممالک میں جا کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا۔ انہی خیالات میں محو وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

"اگر میں اس وہم میں مبتلا رہا تو کیا عجب ہے کہ میرا دماغ خراب ہو جائے۔ میں کچھ احمق نہیں۔ اس لئے مجھے اس روح فرسا خیال سے باز آنا چاہئیے۔ وہ زمرد اس وسیع کرۂ ارض کے کسی گوشہ میں ضرور ہے۔ ممکن ہے کہ بحرِ عمیق کی تہ میں ہو۔ یا کسی شاہزادی کی نازک انگلی کو زیب دے رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شاطر چور کے صندوق میں ہو۔ یا خاک میں مل چکا ہو اور اُس کے ذرّے ہوا میں منتشر ہو چکے ہوں۔ بہرنوع میں متوفی گرانڈن کا بے وجہ ممنون ہوں۔ بغیر اپنے دل و دماغ

سے اس خیال کو نکالے دیتا ہوں"

اتنے میں پشت کے کمرہ سے کسی کے مسلسل کھانسنے اور کراہنے کی دردناک آواز آئی - اس آواز میں کچھ ایسا درد تھا کہ شیفرڈ بے چین ہوگیا - وہ طبعًا دوسروں کی تکلیف سے بہت متاثر ہو جاتا تھا - آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا:

"اُف یہ مقام کیسا گندہ ہے! اگر میں فورًا اس ناپاک جگہ کو خالی نہ کردوں تو کیا عجب ہے کہ میری صحت اور اُس کے ساتھ ساری امیدیں خاک میں مل جائیں - یہاں کی گندگی اور فلاکت میری رگ و پے میں پیوست اور میرے دل و دماغ میں سرایت کر جائے گی - آہ کاش میں اُس کا خیال ..."

اچانک اسکو یہ محسوس ہؤا کہ کوئی اُس کا نام لے کر پکار رہا ہے - وہ کان لگا کر سننے لگا - لیکن پھر کھانسی کی آواز نے اُسے کچھ نہ سننے دیا - وہ اُٹھ کھڑا ہؤا اور اُس طرف چل دیا - کھانسی کی آواز رکی اور اُس نے کسی کو صاف اپنا نام لے کر پکارتے سنا - وہ ساتھ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہؤا اور ہمدردانہ لہجہ میں بولا -

"کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟"

بیمار "کیا آپ کا نام مسٹر شیفرڈ ہے؟

شیفرڈ - "جی ہاں"

بیمار - (رُک رُک کر) "براہ ..... کرم ..... آگے ..... آئیے ..... میں ..... آپ ..... سے ..... کچھ کہنا ..... چاہتا ..... ہوں"

کمرے کی کثیف حالت دیکھ کر شیفرڈ کے سارے جسم میں لرزہ پیدا ہوگیا - در و دیوار کی حسرت زا صورت چھوٹی سی موم بتی کی ٹمٹماہٹ، اور ان سب سے دردناک نظارہ ایک مریض کے نحیف و نزار جسم کا تھا جو ایک گوشے میں پڑا ہؤا تھا - وہ مریض کی طرف بڑھا اور یوں مخاطب ہؤا -

"تمہاری یہ حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہؤا" مریض ایک جوان شخص تھا جس کے ماتھے پر پسینے میں بھیگے ہوئے اور اُلجھے ہوئے سیاہ بالوں کی لٹیں پڑی ہوئی تھیں اور رخسارے شدتِ بخار سے تمتما رہے تھے -

"درست ہے" موخرالذکر نے ہلکے تبسم کے ساتھ جواب دیا "میں اچھا ہو جاؤں گا - اور بالفرض نہ بھی ہؤا تو کیا؟ بیٹھ جائیے میں ڈر رہا ہوں کہ قوتِ گویائی اب جواب دے رہی ہے - مجھے آپ سے پیشتر ہی ملنا چاہیئے تھا، لیکن میں ہمیشہ اس کو ٹالتا رہا"

شیفرڈ نے کہا "تم آہستگی سے باتیں کرو - میں سن لوں گا - اشارہ سے صرف اتنا بتا دو کہ میں کس طرح تمہاری

مدد کرسکتا ہوں" تین چار منٹ کے وقفہ کے بعد مریض نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"آپ ایک ماہ سے لندن میں ہیں، لیکن مجھے دو تین روز ہوئے اطلاع ملی کہ آپ یہاں پورٹر سٹریٹ میں مقیم ہیں۔ اس لئے میں نے یہیں یہ کمرہ لے لیا۔ علاوہ ازیں مجھے پہلا مکان اس لئے چھوڑنا پڑا کہ وہاں والوں نے مجھے مدقوق سمجھ کر نکل جانے کو کہا تھا۔ حالانکہ یہ دق نہیں ہے، پھیپھڑے صرف متورم ہو گئے ہیں اور بہت جلد میں اس مرض پر قابو پا لوں گا"

شیفرڈ (تسلی کے لہجہ میں)۔ "ہاں! ہاں! اچھا تو تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

بیمار۔ میں آپ کو آپ کی گم شدہ چیز کا پتہ لگانے میں مدد دینا چاہتا ہوں۔ وہ انگوٹھی جو مسٹر گرانڈن نے تمہیں ورثہ میں دی تھی بہت قیمتی ہے۔ اور مجھے یہ معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے"

گفتگو کی جدوجہد سے مریض نڈھال ہو رہا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر شیفرڈ اپنی حیرت و استعجاب کو بھول گیا اور اُس کو دلاسا دینے لگا۔

"ذرا دیر دم لے لو۔ تاکہ تمہاری حالت سنبھل جائے"

مریض۔ "بجا فرمایا۔ مگر ڈر ہے کہ اگر میری حالت نہ سنبھلی۔ اور مجھے قبر کا منہ...... خیر...... میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ میں انگوٹھی کے راز سے واقف ہوں۔ یعنی وہ میں نے ہی اڑائی تھی"

یہ سُن کر شیفرڈ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور وہ کسی قدر سکوت کے بعد بولا۔

"تمہیں نے لی تھی؟"

مریض۔ "ہاں میں نے ہی چرائی تھی۔ میں اُس وقت مسٹر گرانڈن کا خدمت گار تھا۔ میرا نام بریڈلے ہے۔ جب یہ واقعہ پیش آیا اُس وقت وہ بڈفورڈ سکوئر کے مکان نمبر ۲۲ میں رہتے تھے جس کا مالک مسٹر ہیرنگ ہے۔ وہ انگوٹھی مجھ کو غسل خانہ میں ملی تھی۔ مسٹر گرانڈن نے غسل سے پہلے اتار کر رکھ دی اور غسل کے بعد وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ میری حالت اُس وقت ناداری کی تھی کیونکہ جو کچھ اپنے پاس اندوختہ تھا وہ ایک دن پیشتر ہی گھوڑدوڑ میں ہار چکا تھا۔ میری باتیں سُن رہے ہو؟"

شیفرڈ۔ "حرف بحرف"

بریڈلے۔ "اس مکان کے زیریں حصہ میں پشت پر ایک کمرہ کتب خانہ کا ہے۔ اس کمرہ میں آتشدان کے اوپر دو شمعدان رکھے رہتے ہیں۔ جو پہلے مسٹر گرانڈن کے تھے۔ لیکن چونکہ مسٹر ہیرنگ اُن کی اکثر تعریف کیا کرتا تھا اس

لئے اُس نے مذہتاً مسٹر پیرنگ کو دے دیئے۔ میں نے اُن کو بارہا خود صاف کیا تھا اور مجھے یہ معلوم تھا کہ اُن کے پینیسے کُھل جاتے ہیں۔ میں اِس کمرہ میں پہنچا اور انگوٹھی کو روئی میں لپیٹ کر شمعدان کے پیندے میں رکھ دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ موقع پاکر اُس کو وہاں سے نکال لاؤں گا۔ لیکن اس واقعے کے بعد ہی میرے آقا اور مسٹر پیرنگ آپس میں لڑپڑے اور مجھ کو پھر اس مکان میں جانے کا موقع نہیں ملا۔"

مسلسل باتیں کرنے کی جدوجہد سے تھک کر بیمار نے آنکھیں بند کرلیں اور خاموش ہوگیا۔

اِن باتوں کا علم ہوجانے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ شیفرڈ انگوٹھی کے حصول کی تمنا میں بے قرار نہ ہوجاتا۔

تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد اُس نے سوال کیا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ انگوٹھی اب تک اُسی مقام پر ہے؟"

ہیڈلے۔ یہ یقینی تو کیسے ہوسکتا ہے، البتہ قرینِ قیاس یہی ہے۔

شیفرڈ۔ "فرض کرو کہ تمہارے بعد کسی نے شمعدان کو صاف کرتے وقت کھولا ہو اور انگوٹھی اُس کے ہاتھ لگ گئی ہو۔"

بریڈلے۔ "ہاں ممکن ہے۔"

شیفرڈ۔ "اور اگر وہ شخص بددیانت ہو تو انگوٹھی پاکر خاموش ہوگیا ہو۔"

بریڈلے۔ "ہاں یہ بھی ممکن ہے۔"

شیفرڈ۔ "لیکن اس میں تو کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا کہ وہ انگوٹھی میری ہے۔"

بریڈلے۔ "یہ یقیناً آپ ہی کی ہے۔"

شیفرڈ۔ "تو پھر شاید تم یہ نہیں چاہتے کہ میں براہِ راست مسٹر پیرنگ کے پاس جاؤں اور ان سے سارے واقعات کا اظہار کردوں، کیونکہ اس حالت میں تم مشکلات میں پھنس جاؤگے۔ کیوں؟"

بریڈلے۔ "قطعی نہیں۔ آپ اگر چاہیں تو مجھ کو کسی نہ کسی طرح صاف بچاسکتے ہیں۔ اور پھر میں ایسا بیمار ہوں کہ مجھے کسی نتیجہ کی پروا نہیں۔ میری خواہش صرف اتنی ہے کہ میں انصاف پر رہوں۔ یقین ماننئے کہ اس واقعہ سے پہلے اور اس کے بعد آج تک میں نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔ خدا شاہد ہے کہ ہمیشہ میرا ضمیر مجھ کو اس حرکت پر ملامت کرتا رہا ہے اور اُس دن کے بعد آج تک مجھے راحت نصیب نہیں ہوئی۔"

شیفرڈ۔ "اگر تمہیں اتنی ہی ندامت ہے تو پھر مجھے کون سی شے وہاں جانے اور اپنی انگوٹھی کا مطالبہ کرنے سے باز رکھ سکتی ہے؟"

بریڈلے "یہ سچ ہے مگر مجھے اس میں شک ہے۔ میرے آقا اور پیرنگ کی عداوت لین دین سے متعلق تھی۔ اور نوبت عدالت تک پہنچی تھی۔ لیکن فیصلہ مسٹر پیرنگ کے خلاف ہوا۔ لہٰذا وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میرے ساتھ بے انصافی ہوئی۔ ہوا اس کے وہ خلقتاً نہایت کنجوس ممسک اور غاصب واقع ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمہیں کسی بہانہ سے ٹال دے۔ یا تم سے کہہ دے کہ کسی دوسرے وقت آؤ۔ یا کم از کم شمعدان کو دیکھتے وقت تمہاری موجودگی کو پسند نہ کرے لیکن مسٹر شیفرڈ خدا عالم الغیب ہے میں اُس کی برائی نہیں کرتا مجھے خوف ہے کہ صرف تمہارے مطالبہ پر وہ چپکے سے بیش بہا زمرد تمہارے حوالے نہیں کرے گا۔ اگر میں تندرست ہوتا تو میرا ارادہ تھا کہ چونکہ میں نے خود انگوٹھی وہاں رکھی تھی جو بہت ممکن ہے اب تک وہیں ہو۔ اس لئے میں خود ہی . . . . (کھانسی کی شدت سے جملہ پورا نہیں کرسکا)

شیفرڈ منتظر رہا۔ پھر پریشان کن خیالات میں محو ہوگیا۔ جب مریض کو سکون ہوا تو بولا۔

"تمہارا یہ ارادہ تھا کہ چھپ کر انگوٹھی نکال لاؤ؟"

بریڈلے۔ "ہاں تمہاری خاطر یہی کرتا!"

شیفرڈ۔ "اور تم مجھے کیا رائے دیتے ہو؟"

بریڈلے "میں کیسے کہوں۔ میری نیت تو یہی تھی کہ کسی طرح تمہاری چیز تم کو مل جائے۔ اگر میرے امکان میں ہوتا تو آج ہی رات کو یا زیادہ سے زیادہ کل رات تک متوقع تھا کیونکہ پیرنگ شہر سے کہیں باہر گیا ہوا ہے اور پرسوں واپس آجائے گا۔ باغ کے اندر سے گذر کر اس کمرہ میں داخل ہونا کچھ دشوار نہیں ہے۔ اگر تم جانا چاہو اور کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو تمہارے بچاؤ کے لئے یہ کافی ہے کہ میں چوری کا اقرار کرلوں لیکن تم کو ایسی رائے دینے کی مجھے جرات نہیں ہوتی۔ صرف بات آپڑی تو اپنا خیال ظاہر کردیا۔

ممکن ہے کہ اس موذی مرض کے پنجہ سے مجھے نجات مل جائے اور . . . . اور . . . " دوبارہ کھانسی کی وجہ سے جملہ ناتمام رہا۔ اور وہ اتنا نڈھال ہوگیا کہ شیفرڈ نے اس ملاقات کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا اور وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرہ میں آگیا۔

چند منٹ پیشتر جو خیالات اُس کے لئے بے معنی اور مہمل تھے۔ اب وہی معنی خیز ہوگئے۔ وہ پائپ سلگا کر پینے لگا اور سوچنے لگا۔

"اب یہ امر تو واضح ہے کہ اس بدنصیب شخص سے مجھے صرف اس بنا پر مخاصمت نہیں ہوسکتی کہ اُس نے انگوٹھی چرالی تھی۔ کیونکہ اگر وہ اِس زمرد کو نہ چراتا تو یقیناً مسٹر گرانڈن کی دوسری جائداد کے ساتھ بیش قیمت انگوٹھی

بھی تلف ہو جاتی - موجودہ صورت میں اس کے ملنے کی بہت کچھ امید پیدا ہو گئی ہے - اب سوال یہ ہے کہ آیا
میں مسٹر پیرنگ کی واپسی کا انتظار کروں؟ نہیں میں اپنی رگ و پے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سخت غلطی کا مترادف
ہوگا - پیرنگ کے نام سے مجھ کو نفرت سی ہو گئی ہے - میں نے کبھی اس نام کے کسی شخص کو ایماندار اور عالی حوصلہ
نہیں دیکھا - بالشافہ مل کر اُس سے انگوٹھی کا طلب کرنا محض نادانی ہے - وہ بآسانی مجھ کو یہ کہہ کر دھوکا دے سکتا
ہے کہ انگوٹھی وہاں ہے ہی نہیں - میں اُس نزدیک اجنبی ہوں - نہ میں زردار ہوں نہ میرا کوئی دوست ایسا ہے
جو اُس پر اپنا اثر ڈال سکے - اُس نے اگر موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہا تو میرے بنائے کچھ نہ بن پڑے گا - اگر وہ اتنا
ہی حریص ہے جیسا کہ برڈیے کے بیان سے ظاہر ہوا - تو بس اُس کا اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ گرانڈن کے مقدمہ
میں میرے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی اب خدائی فیصلہ ہو گیا - بجائے پیرنگ کے پاس جانے کے قانونی مشورہ لینا
زیادہ مناسب ہوتا لیکن اس کے لئے بھی روپیہ کی ضرورت ہے - اور یہاں ٹکا پاس نہیں - بفرضِ محال عدالت
میں چارہ جوئی بھی کروں تو پیرنگ کو باقاعدہ اطلاع ہونی ضروری ہے - اور اطلاع ملتے ہی وہ انگوٹھی کو ڈھونڈ لے گا
اور عدالت کے اندر اثبات یا نفی میں جو کچھ بیان کرے تسلیم کر لیا جائے گا -
لہٰذا یہ صاف ظاہر ہے کہ بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ میں خود اس مکان میں جاؤں - ممکن ہے کہ اس
راہ میں بھی کانٹے ہوں - تو کیا انسان اپنی مملوکہ شے کے چرانے کا استحقاق رکھتا ہے؟ جواب تو صریح نفی میں ہے
مگر ایسی صورت میں بھی میں اپنی رہائی کے لئے دلیل پیش کر سکتا ہوں ہر چہ بادا باد - دو ایک گھنٹے میں گرینڈے
سٹریٹ کے مکان نمبر ۲۲ کا ایک سرسری معائنہ ضرور کرنا پڑے گا؟

* * * * * * * * * * * * *

رات کے گیارہ بج چکے ہیں - شیفرڈ اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں گرینڈے سٹریٹ میں سے گزر رہا
ہے - جاتے جاتے وہ ایک مکان کے سامنے ٹھہر گیا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا - اب اُس کی
سمجھ میں آیا کہ مکان کے باہر کھڑے ہو کر دیکھ بھال کرنے اور اُس کے اندر چور کی طرح داخل ہونے میں بڑا فرق ہے
اُس کی زندگی مصائب کے تھپیڑوں سے محفوظ نہ تھی - لیکن نقب زنی کی ابتدائی مشق کے لرزہ انگیز احساس کا
یہ پہلا تجربہ تھا - وہ دل کو بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ حقیقی معنوں میں یہ چوری نہیں ہے لیکن دل پر ایسا
خوف طاری تھا کہ سر سے پیر تک بید کی طرح کانپ رہا تھا - تین بار ارادہ کر کے آگے بڑھا، مگر ہمت نہ ہوئی آخر
اس خیال سے تقویت ہوئی کہ مکان میں اندھیرا ہے اور پرسوں تک کے لئے خالی ہے - اگر اب فائدہ نہ اُٹھایا تو

پھر ایسا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ اس مکان کے پہلو میں ایک گلی مکان کے اندر جانے کے لئے تھی۔ شیفرڈ بے پاؤں اس گلی میں داخل ہوگیا اور دروازے پر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک جست میں وہ دیوار پھاند کر اندر اُتر گیا۔ اور پہلا کام یہ کیا کہ دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ تاکہ اگر فرار کی ضرورت پیش آئے تو جلد نکل بھاگے۔

آگے بڑھ کر اُس نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا پائیں باغ ہے جس کی پختہ دیواریں ہر چہار طرف ہری بیلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ مکان کا پچھلا حصہ بھی تاریک تھا۔ لیکن پڑوس کے ایک مکان کی کھڑکی سے اُس کے کچھ حصہ پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ شیفرڈ اس روشنی کے گل ہو جانے کا منتظر رہا۔

اس روشنی نے اتنا فائدہ اس کو ضرور پہنچایا۔ کہ اُس مخصوص کمرہ کا پتہ چل گیا جس میں بریڈلے کے بیان کے مطابق شمعدان رکھے ہوئے تھے۔ یہ کمرہ نصف بیضاوی شکل کا تھا اور اُس کے سامنے ایک چھوٹا سا چوبی بالاخانہ تھا جہاں سے پائیں باغ میں اترنے کے لئے زینہ بنا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ روشنی جس کی وجہ سے اُس کے دل پر خوف غالب تھا ناگہاں بجھ گئی۔ آن واحد میں زینہ کی راہ سے وہ بالاخانہ پر پہنچا۔ اور کمرے کی کھڑکیوں کے قدِ آدم دروازوں کو ٹٹول کر ایک دروازے کو دھکا دیا۔ دھکا دیتے ہی زور کی آواز ہوئی۔ اور دروازہ کھل گیا۔ آواز سے سہم کر شیفرڈ جھٹ بالاخانہ سے اتر کر پائیں باغ میں ہو رہا۔ لیکن ہر سمت خاموشی تھی۔ اس لئے پھر وہ زینہ سے بالاخانہ پہ اور وہاں سے کمرے میں جا پہنچا۔ کامیابی اور حصولِ آرزو کی امید سے اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر وہ شمعدان اسی کمرے میں ہے تو یقیناً گوہرِ مقصود ہاتھ آگیا۔ اُس نے جیب سے دیا سلائی نکال کر جلائی۔ اُس کی مختصر سی روشنی میں پہلے اُس کی نظر جس پر پڑی وہ ایک شخص تھا جو لمبا کوٹ اور فلٹ ٹوپی پہنے داہنے ہاتھ میں ایک پستول لئے اُس کے سامنے کمرے کے اندرونی دروازے پر کھڑا تھا۔ جیسے ہی اُس کی نظر اُس شخص پر پڑی دو باتیں اُس کے ذہن میں آئیں اول یہ کہ یہ رنگ خلافِ توقع اس وقت یہاں کیسے آگیا۔ دوسرے یہ کہ اگر اُس نے پستول چلا بھی دیا تو صرف میری ٹانگوں میں گولی مار سکتا ہے۔ موخرالذکر خیال کے آتے ہی اُس کے دل کو ڈھارس بندھی۔

اُس کے مقابل نے اطمینان کے لہجہ میں کہا۔ "دیکھنا دیا سلائی کو بجھنے نہ دینا!" یہ الفاظ ایسے ہی کما نہ لہجے میں ادا کئے گئے تھے جیسے کوئی مسلح آدمی کسی نہتے شخص کو مخاطب کرتا ہے۔

"اسی دیا سلائی سے اس شمع کو روشن کرو" یہ کہتے ہوئے شیفرڈ کو پستول کی زد میں رکھ کر اُس نے آتشدان پر سے ایک شمع اتار کر میز پر رکھ دی۔ شیفرڈ نے حکم کی تعمیل میں جھٹ جھک کر شمع جلا دی۔

مالک مکان نے اپنے ناخواندہ مہمان سے کہا "میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ تم نے دروازہ توڑ ڈالا۔ شاید تم سمجھے تھے کہ مکان خالی ہے۔"

شیفرڈ۔ (مایوسی کے لہجہ میں) "ہاں"

اُس وقت اُس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور دل ہی دل میں اپنی حرکت پر نفرین کہہ رہا تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ اُس کے پاس جواب تھا۔ لیکن اُس کا اثر کیا تھا؟

وہی شخص۔ "اور تمہاری قسمت نے تم کو دھوکا دیا۔ بالکل خاموش کھڑے رہو گے تو میں تم کو کوئی ضرر نہیں پہنچاؤں گا"

یہ کہہ کر متکلم نے آتشدان پر ٹیلیفون کا رسیور اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

شیفرڈ۔ (لجاجت کے ساتھ) "ذرا ٹھیریئے۔ کیا آپ مسٹر پیرنگ ہیں؟"

وہ شخص۔ "آخر تمہارا مقصد؟"

شیفرڈ۔ "کیونکہ آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ مگر میرے پاس یہاں اس مشتبہ حالت میں آنے کی وجہ ہے۔"

وہ شخص۔ "یہ وجہ پولیس کو بتا سکتے ہو۔"

شیفرڈ (گھبرا کر) "ٹھہریئے۔ خدا کے لئے جلدی نہ کیجئے۔ میں ایک ایسے شخص کا نام لوں گا جس سے ہم دونوں واقف ہیں یعنی اڈمنڈ گرانڈن۔"

ٹیلیفون کا رسیور ہاتھ میں لئے پیرنگ نے (کیونکہ یہ پیرنگ ہی تھا) چیں بجبیں ہو کر شیفرڈ کو گھور کر دیکھا۔

شیفرڈ (کلام جاری رکھتے ہوئے) "وہ کبھی تمہارا دوست تھا اور میرا بھی۔ اپنے وصیت نامہ میں وہ اپنی زمرد اور ہیرے کی انگوٹھی میرے نام لکھ گیا۔ مجھے اب اتفاقیہ طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ انگوٹھی آپ کی لاعلمی میں یہاں پوشیدہ ہے۔"

پیرنگ۔ "یہ کہو۔ تو تمہارا نام یقینی .... لیکن فرض کرو کہ تم اپنا نام خود بتاؤ"

پیرنگ کی پیشانی کی شکنیں مٹ گئیں۔ اور اُس نے رسیور کو آتش دان پر رکھ کر، موم بتی کی روشنی میں آنے والے کی طرف گھور کر کہا۔ "دیکھو جیب کے قریب ہاتھ نہ لے جاؤ۔ معلوم ہو گیا کہ تم افترا پردازی میں طاق ہو"

شیفرڈ۔ "اگر مجھے آپ اتنا وقت دیں کہ میں واقعات کا اظہار کروں۔ تو آپ پر یہ روشن ہو جائے گا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ حرف بحرف سچ ہے۔"

پیرنگ۔ "گھبراؤ نہیں۔ تمہیں وقت کافی مل جائے گا۔ کم از کم دو سال"

شیفرڈ۔ (لاپرواہی سے) مجھ کو اس میں کسی قدر شک ہے۔ میں اپنا نام اور یہاں اس مشتبہ حالت میں آنے کی وجہ بآسانی بیان کر دوں گا۔"

پیرنگ "یعنی اس کی وجہ کہ تم میرے مکان میں اس طرح رات کو کیوں گھسے؟"

شیفرڈ۔ "ہاں اتنی ضرور میری غلطی ہے۔"

پیرنگ۔ "خیر مجھ کو تم سے بحث کی ضرورت نہیں۔ تمہارے افسانہ کا اتنا حصّہ ضرور سچ ہے کہ شیفرڈ نامی ایک شخص کو اُس کے دوست مسٹی اڈمنڈ گرانڈن نے مرتے وقت اپنے وصیت نامہ میں ایک زمرد کی انگوٹھی لکھ دی تھی، جو اُس وقت غائب ہو چکی تھی۔ اب اگر تم وہی شیفرڈ ہو۔ تو تم کو کون سی شئے انگوٹھی کا علی الاعلان مطالبہ کرنے سے مانع تھی؟"

شیفرڈ۔ "یہ کہ انگوٹھی کھو چکی تھی۔ اور اب اس کے حصول کے لئے یہ ضروری تھا کہ میں پہلے اس کا پتہ لگا لوں۔ مسٹر پیرنگ اتنا تو آپ سمجھ سکتے ہیں؟"

پیرنگ "اچھا تو آپ یہ فرماتے ہیں کہ اس مکان میں آپ اُسی انگوٹھی کی جستجو میں تشریف لائے ہیں؟"

شیفرڈ۔ "ہاں میں نے یہی عرض کیا کیونکہ جس شخص نے وہ انگوٹھی چرائی تھی اُس نے اس کو اسی مکان میں چھپا دیا تھا۔"

پیرنگ۔ "اُسی مکان میں؟"

شیفرڈ۔ "ہاں مسٹر پیرنگ اسی مکان میں۔ بلکہ اسی کمرہ میں"

پیرنگ "اسی کمرہ میں؟"

شیفرڈ۔ "ہاں وہ۔۔۔۔ لیکن اس سے کیا فائدہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ میری باتوں کو باور نہیں کرتے"

پیرنگ "اب تک نہیں۔۔۔۔۔ اچھا ٹھہرو۔ یہ تم سے کس نے کہا کہ وہ بیش بہا انگوٹھی میرے مکان میں پوشیدہ ہے؟"

شیفرڈ۔ "جس نے اُس کو چُرا کر یہاں چھپایا تھا۔"

پیرنگ "دروغ گویم بر روئے تو۔ اچھا تو وہ کون شخص ہے؟"

شیفرڈ۔ "یہ شخص مسٹر گرانڈن کا ملازم تھا جب میں سفر سے وطن واپس آیا تو اُس نے مجھ کو ڈھونڈ نکالا اور مجھ سے اپنے اس ارتکاب جرم کا اقبال کیا۔ درحقیقت اس سے یہ فعل طمع کے عارضی اثر میں آکر سرزد ہوا تھا لیکن وہ ہمیشہ اپنی اس حرکت پر نادم رہا اور اُس کی تلافی کے لئے موقعہ کا منتظر۔ اس وقت وہ سخت بیمار اور

جاں بلب ہے"

پیرنگ "خوب! میں مسٹر گرانڈن کے ملازموں سے واقف ہوں۔ اُس شخص کا نام کیا ہے؟"

شیفرڈ "ابھی میں اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا"

پیرنگ "میں سمجھتا تھا۔ آئے اب گرفت میں! کہاں گئی آپ کی سچائی؟"

شیفرڈ "اگر آپ مجھ کو مجبور کریں گے۔ تو میں آپ کو یہاں سے سیدھا اُس آدمی کے پاس لے چلوں گا"

پیرنگ "یعنی تمہارے ہمراز چور کے پاس؟ بس اب زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اتنی دیر تک میں تم سے اس لئے سوالات کرتا رہا کہ تمہارے برجستہ سفید جھوٹ میں لُطف آرہا تھا۔ اچھا تو آپ اپنے دعوے پر اب بھی قائم ہیں کہ وہ زمرد کی انگوٹھی میرے مکان میں موجود ہے؟"

شیفرڈ "بہت ممکن ہے کہ اسی کمرہ میں ہو"

پیرنگ "بہت ممکن ہے؟ اچھا کس مقام پر"

شیفرڈ اب تذبذب کی حالت میں تھا۔ اس شخص کا لب ولہجہ، سنگدلی اور حریص نگاہیں بریڈلے کے بیان کی صاف تائید کررہی تھیں۔ لہذا کافی ہوشیاری اور احتیاط کی ضرورت تھی۔

پیرنگ "میں منتظر ہوں (ترش روئی کے ساتھ) وہ زمرد کی انگوٹھی کہاں ہے؟"

عجب کشمکش اور امید وبیم کا وقت تھا وہ کسی قدر مایوسانہ لہجہ میں بولا۔

"اگر وہ وہیں ہے جہاں مجھے بتایا گیا ہے تو اگر آپ اجازت دیں تو میں اُس کو ڈھونڈ نکالوں"

پیرنگ "میرے بھولے بھالے دوست خبردار! اگر تم نے اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ اس پستول کی گولی فی الفور تمہارے سینہ کے پار ہوگی۔ اگر تم محض جھوٹ نہیں بولتے، حالانکہ میرا تو یہی خیال ہے، تو اپنے بیان کے ایک جزو ہی کی تائید میں مجھ کو یہ بتادو کہ وہ انگوٹھی کس جگہ پر ہے۔ بتاؤ۔ جلد بتاؤ"

شیفرڈ (سخت مایوسی اور پیچ وتاب کے لہجے میں) "اس کو چھپائے ہوئے کچھ عرصہ ہوا۔ کیا عجب ہے کہ کسی نے اُس کو پہلی جگہ سے نکال کر کہیں اور رکھ دیا ہو۔ اُس کا اسی مقام میں ہونا یقینی نہیں ہے۔ بہرکیف اگر جہاں میں بتاؤں وہاں انگوٹھی نہ ہوئی تو آپ میرا بیان صریح جھوٹ سمجھیں گے"

پیرنگ "کچھ بھی سہی۔ تم کو اپنا بیان سچ ثابت کرنے کا ایک موقعہ تو ہے؟ کہاں ہے۔ بولو"

"ان دونوں شمعدانوں میں سے ایک میں" یہ الفاظ شیفرڈ کے لب تک آکر رہ گئے۔ اور وہ اس خیال پر

خاموش کھڑا رہا کہ ایسے وقت میں بھی کسی کو اس کا موقع نہ دینا چاہیئے کہ وہ میری چیز پر قابض ہو جائے۔ اگر میں نے
راز افشا کر دیا تو پھر کونسی شے پیرنگ کو اس سے باز رکھ سکتی ہے کہ وہ فوراً مجھ کو اپنے مکان سے یہ کہہ کر نکال دے کہ اسی
میں اپنی خوش قسمتی سمجھو کہ میں تم کو پولیس کے حوالہ نہیں کرتا۔ اور اس طرح میری انگوٹھی پر قابض ہو جائے۔ شیفرڈ کو
اس کا کامل یقین بھی تھا کہ اگر موقع ملا تو پیرنگ ضرور ایسا ہی کرے گا۔

شیفرڈ - (بآوازِ بلند) "اچھا پھر بلاؤ پولیس کو۔ میں پولیس کا خاموشی کے ساتھ منتظر رہوں گا۔ یہ یقینی امر ہے کہ میں
زیادہ دنوں تک حراست میں نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ مجھ کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہوگا۔ کہ میں وہی شیفرڈ ہوں جس کو
اڈمنڈ گرانڈن نے مرتے وقت اپنی زمرد کی انگوٹھی دی تھی۔ علاوہ ازیں پولیس میرے مخبر چور کی شہادت ضرور
لے گی۔ جو میرے موافق ہوگی۔ صرف تمہارے مکان میں گھسنے کے الزام میں سزا پاؤں گا۔ لیکن اس کے بعد قانون
میری جائز وراثت مجھ کو دلائے گا۔ جاؤ میں تیار ہوں۔ تمہاری ایسی تیسی!"

پیرنگ نے اب دیکھا کہ شیفرڈ کے چہرے سے اطمینان اور استقلال کی جھلک نمایاں ہے۔

پیرنگ - (شیفرڈ کو بغور دیکھتے ہوئے) "فرض کر لو کہ تم سچ کہتے ہو۔ یہ تو میں کہتا نہیں کہ تم سچ ہی کہتے ہو۔ مگر ممکن ہے
کہ تمہارے بیان میں صداقت ہو۔ تاہم اس سے تو انکار ہو نہیں سکتا کہ تم میرے مکان میں چور کی طرح داخل
ہوئے ہو۔ اگر میں اتفاقیہ طور پر ایک دن پیشتر واپس نہ آجاتا تو تم یہاں جو چاہتے کرتے۔ تمہارا یہ فعل سخت
قابلِ نفرین ہے۔"

شیفرڈ خاموش کھڑا رہا۔ بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو معافی مانگتے بھی شرم آتی ہے۔

پیرنگ - "پس اگر تم جھوٹ نہیں بولتے۔ تو بھی اگر میں تم کو پولیس کے حوالہ کر دوں تو اقدامِ سرقہ کی سزا سے بچ
نہیں سکتے"

شیفرڈ - "میں نے تو یہ اقرار کر لیا ہے۔ اس کا اعادہ فضول ہے۔۔۔"

پیرنگ - اور اگر انگوٹھی یہاں نہ ملی تو تمہاری مایوسی کی کوئی حد نہ ہوگی۔ اور قرینہ ہے بھی یہی۔ ایسی حالت میں تم کو
میری بات مان لینی چاہیئے۔ خواہ وہ انگوٹھی یہاں ہو یا نہ ہو۔ ہر حالت میں میں تم کو پانچ سو روپیہ دوں گا۔ اور
صورتِ حال کو مد نظر رکھتے ہوئے میرا یہ سلوک فیاضانہ ہے۔"

شیفرڈ اس کی یہ باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ اب اس کو صاف نظر آنے لگا کہ پیرنگ میرے بیان کو سچ تسلیم
کرتا ہے۔ مگر میری موجودہ حالت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہے۔ معاملہ کا رخ یوں پلٹ جانا بالکل خلافِ امید

تھا۔ اور طمانیت بخش۔ کیونکہ اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اب میں کشاں کشاں حوالات میں جانے سے محفوظ ہوں۔ اس اطمینان کے ساتھ ہی اس کو یہ محسوس ہوا کہ اپنے بیش بہا زمرد کے عوض میں پانچ سو کی رقم میرے لئے باعث توہین ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ ایک شخص کے مکان میں اس طرح داخل ہونا صریح غلطی تھی۔ اور اس کے صلہ میں نقصان کے ساتھ رہائی کا موقعہ ملے تو جائے شکر و امتنان ہے۔ اس نے کنکھیوں سے یہ دیکھ لیا تھا کہ دونوں شمعدانوں پر تازہ ملمع ہے اور یقیناً ان کو ملازمین ہر وقت صاف کرتے رہے ہونگے۔ ممکن ہے کہ انگوٹھی نکل گئی ہو۔ پس پانچ سو روپیہ لینے سے انکار کرنا سراسر حماقت ہوگی۔ اور اپنی گرفتاری بھی یقینی ہے۔ اب رہا یہ دعویٰ کہ اس کے بعد قانوناً میں اپنی انگوٹھی حاصل کر سکتا ہوں بیوقوفی ہے۔

پیرنگ:"دیکھو سمجھ لو۔ میں تمہارے ساتھ بہت نرمی اور نیکی کا سلوک کر رہا ہوں"

شیفرڈ۔"یہ ورثہ میرے لئے بہت گرانبہا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ اس کی خاطر میں نے اپنے آپ کو مصیبت میں گرفتار کر لیا ہے"

پیرنگ"صرف اتنا بتا دو کہ وہ انگوٹھی کس مقام پر ہے۔ اور پانچ سو روپیہ اسی وقت لے لو۔ ممکن ہے کہ تم غلط پتہ بتاؤ۔ پھر بھی یہ رقم تم کو دینے کو تیار ہوں پانچ سو روپیہ اس چیز کے لئے جو ممکن ہے پہلے ہی غائب ہو چکی ہو اور اس کو بھی مدنظر رکھو کہ ممکن ہے کہ تمہارے مخبر نے تم سے جھوٹ بولا ہو۔ تم اس کی باتوں پر ضرورت سے زیادہ بھروسا رکھتے ہو"

شیفرڈ۔ لیکن انگوٹھی تو بیس ہزار روپے سے کم کی نہیں ہے"

پیرنگ"لیکن اس کے ملنے کی امید موہوم ہے"

شیفرڈ۔ خیر اب تو میں تمہارے قبضے میں ہوں"

پیرنگ"اور باوجود اس کے میں تمہارے ساتھ رحمدلی اور فیاضی سے پیش آرہا ہوں۔ اپنے اختیارات کا استعمال کرنے کے بجائے تمہارے ساتھ سلوک کرنے کو تیار ہوں"

شیفرڈ:"غالباً تم یہ بھی چاہو گے کہ میں تمہیں ایک تحریر دے دوں۔ جس کی رو سے میں اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤں"

پیرنگ"ہاں۔ صرف ایک سطر اس مضمون کی کہ تم اپنا ورثہ یعنی انگوٹھی میرے ہاتھ بالعوض پانچ سو روپیہ نقد فروخت کر چکے ہو۔

شیفرڈ۔"خوفناک قربانی!"
پیرنگ۔"ہاں اس حالت میں جب کہ تمہیں کامل یقین ہو کہ انگوٹھی کا یہاں وجود بھی ہے!"
شیفرڈ۔(مایوسانہ لہجہ میں)"اچھا مجھے منظور ہے"۔

پیرنگ نے بکس میں سے کاغذ نکال کر شیفرڈ کو دے دیا۔ اور شیفرڈ نے بیٹھ کر لکھنا شروع کیا۔ چند الفاظ لکھ کر پیرنگ سے مخاطب ہوا۔"تو آپ مجھے روپیہ انگوٹھی کا پتہ بتانے سے پہلے دیں گے؟ اس وقت تو میں آپ کے قابو میں ہوں"

پیرنگ نے"ہاں مجھے منظور ہے" کہہ کر بکس کھولا اور اُس میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر شیفرڈ کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اور اُس نے شمار کر کے جیب میں رکھ لئے۔

"لکھنا ختم کرو اور یہ کاغذ مجھے دو۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنا راز بھی بتلاتے جاؤ۔ پھر تم جانے کے لئے آزاد ہو۔ راستہ میں شاید اپنی چالاکی پر مسکراؤ گے کہ میں نے خوب دھوکا دیا۔ انگوٹھی کہیں ہے اور بتایا کہیں"

شیفرڈ لکھنے کو پھر جھکا۔ اور دو تین الفاظ اور لکھ کر رک گیا۔ اُس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اُس نے مجھے روپیہ دینے سے قبل راز معلوم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ یہ ممکن تھا کہ وہ مجھے پہلے راز بتانے پر مجبور کرتا۔

دل میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہی اُس نے اُس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ اب تک وہ موم بتی کی طرف پشت کئے کھڑا تھا۔ لیکن اس وقت وہ کسی قدر مڑ گیا تھا۔ اور روشنی اُس کے چہرے کے کچھ حصہ پر پڑ رہی تھی نگاہ پڑنی تھی کہ شیفرڈ کے دماغ میں یک بیک بجلی کی سرعت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ پیرنگ اور بریڈلے ایک ہی شخص ہے۔ یہ خیال اتنا تیز اور موثر تھا کہ شیفرڈ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل پڑی۔ وہ چاہتا تھا کہ غور کرنے کا موقع ملے۔ لیکن وقت بہت تنگ تھا۔

ہوٹل کا اندھیرا کمرہ۔ جہاں ایک گوشے میں ایک بیمار پڑا دم توڑ رہا تھا جس کی صورت دھندلی روشنی میں صاف نظر نہیں آتی تھی، اُس کی خوفناک کھانسی اور سر کے اُلجھے ہوئے بال یہ سب کچھ دھوکا اور فریب تھا اور وہ یہی پیرنگ تھا۔ بریڈلے نام کا کوئی شخص نہ تھا۔ اسی شخص نے اُس کو اپنے مکان میں چلنے کی ترغیب دی اور اس کے پیچھے پیچھے خود آیا۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے ہی چلا آیا ہو۔ اب شیفرڈ کی سمجھ میں آیا کہ یہ سب دام اسی کے لئے پھیلایا گیا تھا۔ اب شیفرڈ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں پیرنگ پورٹر سٹریٹ میں ایک ہفتہ تک مقیم رہا اور کیوں اُس نے بریڈلے کا فرضی نام اختیار کر کے اُس کو مصنوعی قصہ سنایا۔ ہو نہ ہو وہ زمرد کی انگوٹھی

پیرنگ کے پاس ہے جس کو وہ اب تک چھپائے ہوئے تھا۔ تاکہ موقع پاکر اُس کے مالک کو دام میں لے آئے اور اس طرح بیس ہزار روپیہ کی انگوٹھی کا صرف پانچ سو روپیہ میں مالک بن بیٹھے۔

اِن خیالات سے اُس کے رگ و پے میں ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ترکیب اختیار کرنا چاہئے۔ صرف ایک صورت تھی۔ اور وہ اُس کی سمجھ میں آگئی۔ لیکن اگر وار خالی گیا تو کیا ہوگا؟ پہلے اپنی قوت عمل پر کافی بھروسا ہونا ضروری تھا۔

اُس نے لمبی سانس لی، اور قلم رکھ کر کاغذ اور اپنی مکمل تحریر پر نظر ڈالی۔ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہاتھ سے اُس کاغذ کو پیرنگ کی طرف بڑھایا اور اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ آنکھیں ملتے ہی پیرنگ جھجک کر پیچھے ہٹا۔ اس کا ہٹنا تھا کہ شیر غراں کی طرح شیفرڈ نے اس زور کے ساتھ جھپٹ کر پیرنگ کا گلا پکڑا کہ دونوں زمین پر آ رہے۔ پیرنگ نیچے تھا شیفرڈ کے دونوں گھٹنے اُس کے سینے پر تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے اُس کی شہ رگ کو دبا رہا تھا۔ پیرنگ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ شیفرڈ نے گھرک کر کہا "او جھوٹے بدمعاش۔ تیری ساری چالیں ظاہر ہو گئیں۔ جلد بتا میری زمرد کی انگوٹھی کہاں ہے ورنہ ...."

پیرنگ "خدا کے لئے رحم! رحم! میں نہیں جانتا۔ میں مر رہا ہوں"!

"اگر جان تجھے عزیز ہے تو فوراً بتا انگوٹھی کہاں ہے؟"

"اس صندوقچہ میں جس میں سے نوٹ ...."

شیفرڈ نے اپنی پوری طاقت سے پیرنگ کا کالر پکڑ کر اُس کو کھڑا کیا اور کھینچتا ہوا صندوقچہ کے قریب لے گیا۔ خالی ہاتھ سے صندوقچہ میں سے ایک سبز ریشمی ڈبیہ ملی جس میں وہی زمرد کی بیش بہا زمرد کی انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ڈبیہ کو جیب میں ڈالا اور ایک زور کا دھکا ایسا دیا کہ پیرنگ فرش پر چاروں شانے چت گر کر کچھ دیر کے لئے بے ہوش ہو گیا۔ اُس کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہ نہایت اطمینان کے ساتھ جس راہ آیا تھا اُسی راہ نکل گیا۔

گرینڈلے سٹریٹ میں پہنچ کر اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اس سگریٹ میں اس وقت کچھ عجیب ہی مزہ آ رہا تھا۔ اُس نے اپنی جیب کو تھپکی دی جس میں اُس وقت بیس ہزار روپیہ کی بیش بہا زمرد کی انگوٹھی تھی اور کہا "حق بحقدار رسید۔ دوست گرانڈن تمہارا شکریہ!"

شاہ عبدالرحمٰن سیوانی

آہ امیر علی مرحوم

شکوۂ بختِ نارسا کیجیے | گلۂ جورِ ناروا کیجیے
زندگی کا جب اعتبار نہ ہو | آرزوؤں کو لے کے کیا کیجیے
کیوں الجھیے فریبِ ہستی میں | کیوں نہ اب ترکِ مدعا کیجیے
زیست اور اُس کی کیفیت معلوم | دل کو کیوں وقفِ مدعا کیجیے
زندگی ایک دردِ پیہم ہے | کیوں نہ اس درد کی دوا کیجیے
ماجرائے حیات کیا کہیے | شرحِ آلام تا کجا کیجیے

مختصر یہ کہ داغ داغ ہے دل
سوزِ پنہاں سے اک چراغ ہے دل

اب کسے فکرِ بادۂ سرجوش | شمع افسردہ اور بزم خموش
اُٹھ گیا دہر سے وہ پیکرِ عقل | کیوں نہ ہو تار تار دامنِ ہوش
فخرِ طوسی و رشکِ دوانی | جس کی ہر بات تھی پیامِ سروش
اُس کی آنکھیں نشاطِ فردا پر | اور زباں اُس کی وقفِ لذتِ دوش
نہ رہا دہر میں امیر علی | کلکِ رنگیں تھا جس کا لالہ فروش

بزمِ نظارہ سوز تھی جس سے
یعنی عالم فروز تھی جس سے

کس لیے دل کو بے قرار کریں | گلۂ عمرِ مستعار کریں
موت کا بھی جب اعتبار نہیں | زندگی ہی کا اعتبار کریں
مرنے والے کی طرح کانٹوں سے | پہلے ہاتھوں کو ہم فگار کریں
پھر اسی خارزار سے پیدا | اک نیا باغِ پُر بہار کریں
زندہ کرنے کا اختیار نہیں | اُس کا مسلک ہی اختیار کریں
آؤ بحرِ جہاں کی موجوں سے | گرم میدانِ کارزار کریں

زندگی لالہ زار ہو جائے
یہ چمن پُر بہار ہو جائے

ابوالمکارم سلیم اللہ

آنسو

اے مرے آنسو کبھی بیکار ہو جاتا ہے تو | اور کبھی اُن پہ بن جاتا ہے اک نقشِ وفا
تیری قیمت کچھ نہیں رہتی نگاہوں میں کبھی | اور کبھی بنتا ہے تو گنجینۂ صدق و صفا

پرورش پاتا ہے تو قلبِ حزیں میں اس طرح | جس طرح چشمِ صدف میں گوہرِ یکتا
تیرے سینے میں ہیں پنہاں داستانِ رنج و غم | تو ہے پچھلی کیف پرور صحبتوں کی یادگار

کبھی پھولوں میں بن جاتا ہے قطرہ اوس کا | اور کبھی تاریک دل میں ستارے کی ضیا
جلوہ گر ہوتا ہے تو بجلی کے پہلو میں کبھی | اور کبھی تو خود ہی بن جاتا ہے شعلہ قہر کا

دیکھ کر تجھ کو کبھی ہوتا ہے کم غمِ عشق | اور کبھی آنکھوں میں بن جاتا ہے تو وجہِ نشاط
ترجمانِ حالِ دل ہے غم کی خاموشی میں تو | اک سمندر ہے اگر حاصل ہو تجھ کو انبساط

تو ہی مظلوموں کی فریادوں کا ہے فریاد رس | غم کے شعلوں کو بجھا دیتا ہے دل میں آ کے تو
ختم ہو جاتی ہے کلفت تیری طغیانی کے ساتھ | نغمۂ عشرت سنا دیتا ہے دل میں آ کے تو

مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری

ایجادِ عظیم

ایک اتوار کی صبح کا ذکر ہے، شیطان خدا کی تلاش میں نکلا اور اس نے اُسے پالیا۔ شیطان نے کہا" اے خدائے بزرگ و برتر! تُو انسانوں کی وجہ سے کیوں پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے؟ ...... کیا تو نہیں جانتا کہ یہ کیسی ناکارہ جنس ہیں؟ ..... انہیں میرے حوالے کر دے اور ان سے خود کوئی سروکار ہی نہ رکھ! یہ تو ایک ذکرِ عبث ہیں، بدکردار اور احمق!"

مگر خدا نے جس کی طبیعت اُس وقت کسی ہرزہ درائی کے سننے کے لئے تیار نہ تھی ذرا درشتی سے جواب دیا:

"نکل جا یہاں سے، پاجی اور ملعون، مَیں آج کے دن ایسی نابکار شکایات سننا نہیں چاہتا!"

"اے قدوس ...... "

"بس بس! وہ احمق کیسے ہو سکتے ہیں جب میں نے اُنہیں اپنے نمونے پر پیدا کیا؟ وہ کیوں کر احمق ہو سکتے ہیں؟"

"سچ ہے، تو نے اُنہیں اپنے نمونے پر پیدا کیا، لیکن تو نے ہی اُن کے دماغوں میں ایک کجی بھی رکھ دی۔ اگر تیری عظمت و جبروت مجھے اجازت دے تو میں کہوں کہ ...... "

خدا نے سختی سے کہا:" خاموش! دُور ہو جا یہاں سے ..... قنوطی! مجھے غصہ میں نہ لا! ..... کیوں تُو یہاں ایسی جھوٹی کہانیاں سنانے آتا ہے؟ میری مخلوق احمق کیوں ہو؟ ..... میں تو اُن کو احمق نہیں دیکھتا!"

ابلیس نے کہا:" اے ذاتِ پاک تجھے اِس لئے معلوم نہیں کہ اُس دن سے ـــــ لیکن پہلے اِس واقعہ کے اظہار کی جراءت کے لئے تجھ سے ہزار بار معافی مانگتا ہوں ـــ تجھے یاد ہے؟ .... جب انہوں نے تیرے برخ انور کی توہین کی تھی تو نے اُن کے ہاں نزول نہیں فرمایا؟"

"کیا! .... میری توہین؟ .... کب؟ خدا نے چیں بجبیں ہو کر پوچھا، اور ایک بناوٹی فراموشی کے آثار اُس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگے ـــــ یا، کون جانتا ہے کہ حقیقت کیا تھی؟ شاید وہ سچ مچ بھول گیا ہو، کیونکہ خدا سے ہر بات ممکن ہے اور وہ جامع صفات ہے۔

"کیا تجھے یاد نہیں؟ اُن دو چوروں کے ساتھ .... ایک پہاڑی پر جب ...... "

خدا نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:" ٹھیک! ٹھیک! تھوڑا ہی عرصہ گزرا۔ کیا اُن

لوگوں میں تو بھی تھا ؟"

"ہاں، اے قادرِ مطلق! میرا گزارا ہی اور کس بات پر ہے؟ میں دن رات اُن کے ساتھ ہوتا ہوں، حتیٰ کہ نیند میں بھی ...... میری ہی آغوش میں تو وہ پرورش پاتے ہیں اور میری ہی حفاظت میں وہ جیتے ہیں! میرے سوا اور کون اُن کو سیدھا راستہ دکھانے والا ہے؟ مگر وہ احمق ہیں! اُن کو پڑھاتے ہوئے مجھے صدیاں گزر گئیں مگر سب اکارت گیا، وہ بڑے ہی غبی ہیں!"

پطرس نے دیکھا کہ خدا کو اب غصہ آ رہا ہے اس لئے انہوں نے مداخلت کر کے کہا "ہاں، ہاں! ہم تجھے اچھی طرح جانتے ہیں! خدا ثبوت چاہتا ہے، صرف الفاظ یہاں کام نہیں آتے ...... ہٹ! اپنی مزخرفات سے ہمارے کانوں کو نہ بھر ...... اپنا راستہ لے ورنہ تیرے کانوں کو کھینچ کر گز بھر کا کر دوں گا!"

غریب شیطان کیا کرتا، وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ پطرس نے مذاق نہیں کیا، لیکن اُس نے دل ہی دل میں کہا: "تم ثبوت مانگتے ہو؟ اب تمہیں ثبوت ہی لا کر دوں گا ...... اور بہت سے!"

سو وہ چلتا رہا، چلتا رہا، یہاں تک کہ غروبِ آفتاب کے وقت وہ ایک جرمن شہر میں پہنچ گیا جو دو دریاؤں کے درمیان امن سے بستا تھا۔ جونہی وہ شہر کے دروازے میں سے گزرا اُس نے اینجیلوس کی آواز سنی۔ شیطان کا رُواں رُواں کانپ اُٹھا اور وہ ٹھہر گیا ...... اپنی حلقہ دار دم کو لپیٹے ہوئے اور اپنے تیز تیز ناخنوں کو ہتھیلیوں میں چھپوئے ہوئے وہ اُس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک اُس آواز کی گونج فضائے شام میں جذب ہو گئی۔ پھر وہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا اور فی الفور ایک ایسے شخص سے مخاطب ہوا جس کی داڑھی ناف تک پہنچی ہوئی تھی۔

"گٹن برگ صاحب تسلیم! مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟"

اور ...... وہ دوست بن گئے۔ ایک چیز سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں ہوتے ہوئے آخر وہ ایک لکڑی کے تابوت میں سما گئے۔ یہاں وہ بڑی دیر تک آپس میں گفتگو کرتے رہے لیکن جو کچھ شیطان نے اُس نیک آدمی سے کہا اُسے صرف شیطان جانتا ہے۔ اسی سے اندازہ کر لو کہ گٹن برگ کو اُس رات نیند نہ آئی اور خیالات نے اُس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا کئے رکھا۔ اس کے بعد راتیں اسی طرح گزر گئیں اور اُس کی پلک سے پلک نہ لگی۔ وہ ہزاروں منصوبوں اور ارادوں، تدبیروں اور تجویزوں کے ساتھ مصروفِ جنگ رہا، اچھے اچھے منصوبوں کو اُس نے توڑ موڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور بُرے بُروں کو انتخاب کر لیا۔ اسی طرح بہت سے دن اور بہت سی راتیں گزر گئیں، یہاں تک آخر

بڑی کاوش کے بعد اُس نے چھاپے کا پریس ایجاد کیا!

تو اب ...... کاغذ کو سنبھالی سے تھامے رہو! چھاپو...... اور چھاپو .... اور چھاپتے ہی چلے جاؤ!

پہلے پہل یہ کارخانہ کسی حد تک آہستہ آہستہ چلتا رہا مگر شیطان کا فکر بلند ہے۔ اُس نے دیکھا کہ پہیے اُس کی منشا کے مطابق تیز نہیں چلتے۔ سو اُس نے پہئے کو اپنی دُم کے پیچ میں لپیٹ لیا اور لو! ــــ سرعت رفتار پیدا ہو گئی...... اب وہ اُس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک فی گھنٹہ دس لاکھ صفحے چھپ کر، گتے جا کر، بند ہو کر، مہریں لگ کر اور ڈاک کے ساتھ شامل ہو کر ریل کی سڑک پر نہیں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں پھر وہ اپنی دُم کو گاڑی کے پہیوں میں پھنسا دیتا ہے اور اُسے نوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلاتا ہے۔ ذرا اپنے مطالب کی اشاعت کے لئے اُس کی عجلت پسندی ملاحظہ کیجیے۔

بہت عرصہ نہیں گزرتا کہ پطرس جنت کے دروازے پر ایک خطرناک شور سنتے ہیں، جیسے فتنہ تاتار بیدار ہو کر آگیا ہو۔ سیٹیوں، نعروں اور گالوں سے آسمان گونج اٹھتا ہے اور فضا غبار آلود ہو جاتی ہے!

"یہ کیا ہے!...... یہ کیا ہے؟"

یہ شیطان ہے، جو ایک دود گاڑی کو الہام، فلسفہ اور قانون کی کتابوں اور نئے پرانے اخباروں اور رسالوں سے لادکر لایا ہے۔ ملعون ان تمام کو پہلے نیچے اُتارتا ہے اور پھر اس انبار کو اٹھا کر بے تحاشا خدا کی طرف بھاگتا ہے۔

خدا کہتا ہے "ناکارہ، بدمعاش! تو پھر یہاں آگیا؟

"ہاں اے قادرِ مطلق!"

"تو کیا خبر لایا ہے؟"

"ایک معمولی سی اے علم و فضل کے مالک۔ یہ گڑگڑاتے کر حاضر ہوا ہوں۔ ثبوت تو نے مانگا تھا، ثبوت ہی لایا ہوں...... محترم پطرس! مجھے ممنون فرمایئے۔ اپنی عینک لگا لیجیے اور ذرا آپ بھی دیکھئے...... " شیطان نے تمام چیزیں خدا کو اور پطرس کو دکھا دیں۔

خدا اور پطرس حیران رہ گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"اے حی و قیوم، کیا میں سچا نہیں ہوں؟

خدا کچھ جواب نہیں دیتا۔

"جناب پطرس، کیا میں سچا نہیں ہوں؟"

پطرس بھی کچھ جواب نہیں دیتے۔

کچھ دیر کے بعد خدا پوچھتا ہے "اچھا، تو تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"یہی کہ انسانوں کو میرے حوالے کر دے، جیسا کہ معاہدہ ہُوا تھا۔"

خدا تنگ آ کر جواب دیتا ہے: "ہاں! لے جا اُن کو اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

شیطان خوشی سے اچھلتا کودتا چل پڑتا ہے۔

"ٹھہر!..... بے ہودہ کار..... کہاں جاتا ہے؟"

"اُن پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے۔"

"کیا؟..... اور یہ خباثت تو یہیں پھیلا جائے گا؟....... اٹھا اس سب کو!...... اور اگر مجھے پھر کبھی معلوم ہوا کہ تو ایسی بے ہودگی لے کر یہاں آیا ہے تو میں پطرس سے کہہ کر تیری دُم کٹوا دوں گا۔ سنا؟"

چنانچہ شیطان نے تمام انبار سمیٹ کر اپنے سر پر رکھ لیا اور دُم دبا کر وہاں سے بھاگا۔

اس طرح نوعِ انسان نے کتاب خانے اور دارالعلوم بنانے سیکھے تاکہ زمانہ اُن کی عقل و دانش کو تباہ نہ کر سکے۔

"سیڈو وینو"

منصور احمد

جس طرح رات اپنی تاریکی میں التجائے روشنی پنہاں رکھتی ہے اسی طرح میری بے خبری کے عمق میں یہ آواز گونجتی ہے کہ میں تجھے چاہتا ہوں اور صرف تجھی کو۔ جس طرح طوفان جب وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ امن شکن ہوتا ہے۔ اپنی نہایت بھی امن ہی میں تلاش کرتا ہے، اسی طرح میرا انحراف تیری محبت کو صدمہ پہنچاتا ہے، اور پھر بھی صدا یہی ہے کہ میں تجھے چاہتا ہوں اور صرف تجھی کو۔

ٹیگور

محبّت رُوحِ خاموشی بھی ہے

محبت رُوحِ خاموشی بھی ہے جانِ سخن بھی ہے
گلستانِ مسرت بھی ہے صحرائے محن بھی ہے

اِسی سے زیست تزئین ہے اِسی سے موت سیمیں ہے
محبت نُورِ ہستی بھی ہے تنویرِ کفن بھی ہے

جُدا دُنیا سے ہے لیکن ہے اِک دنیا تصوّر کی
محبت کا چمن خلوت بھی ہے اور انجمن بھی ہے

وہ نکہت ہے محبت جس میں دنیا بھر کی خوشبو ہے
محبت بوئے گل بھی عطر بھی مشکِ ختن بھی ہے

جھلکتی ہے ہمیشہ اِس کی یک رنگی میں رنگینی
بیابانِ محبت دشت بھی ہے اور چمن بھی ہے

مری تیری محبت بس کہ ہے تصویر عصمت کی
کہ اے دلبر مری، تُو میری دلبر بھی بہن بھی ہے

میں تیرے پاس رہتا ہوں تُو میرے پاس رہتی ہے
مرا مسکن تری فرقت میں غربت بھی وطن بھی ہے

جدا اُس سے نہ رہ دم بھر جدائی میں تری لے جا
بہارِ کم سخن بیدل بھی ہے اور خستہ تن بھی ہے

بہار

مفروضہ چینی ققنس کی تحقیق

(نوشتۂ آنریبل - ایم، یو، ہا چسوکا)

جو لوگ چینی آرٹ اور لٹریچر سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اُن دو پرندوں سے بھی آشنا ہوں گے جنہیں اہلِ چین "فینگ ہوانگ" اور "لُوآن" کہتے ہیں اور اہلِ جاپان "ہُواُو" اور "لُوآن" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ "فینگ ہوانگ" کو مغربی لغات اور فرہنگوں میں ققنس لکھا گیا ہے۔ مدت سے میرا خیال ہے کہ یہ دونوں پرندے خاکدانِ ارضی میں موجود تھے جس بات نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے وہ وہ فرق تھا، جو چھوٹے اور بڑے "ققنس" میں کیا گیا تھا۔

بڑے پرند کو "ہُوشو" کہتے تھے۔ عمر کے لحاظ سے اُس کی شکل وصورت کو پہچان لینا اور لانبی لانبی قامت کے شکاری پرندوں میں اُسے ڈھونڈ لینا ایک متبصر کے لئے کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ وہ بغیر کسی دقت کے اُس کی شناخت کر لیتا ہے۔ میں اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ "ققنس" اور "لُوآن" محض خیالی اور مفروضہ پرندے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی ہستی موجود ہے، لیکن وہ آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ خصائص اور مدارج کے لحاظ سے یہ دونوں پرندے آپس میں گہری مشابہت رکھتے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ تشریحاتِ قدیمہ میں "فینگ ہوانگ" کا سر مرغ کی مانند، گردن سانپ جیسی، ٹھوڑی ابابیل کی سی، پشت کچھوے کی طرح اور دُم مچھلی کی مانند بیان کی گئی ہے۔ پانچ رنگ اور لمبائی چھ فٹ بتائی گئی ہے۔

آؤ اِن تشریحات کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کریں۔

۱۔ **سر مرغ کا سا۔** "ققنس" کا سر بہت کچھ پالتو مرغ کے سر سے ملتا ملتا ہے۔

۲۔ **سانپ جیسی گردن۔** اُس کی پتلی گردن اس طرح سے گردش کرتی ہے جیسا کہ سانپ کا پھن عالمِ غیظ وغضب میں لہراتا ہے۔

۳۔ **ابابیل کی ٹھوڑی۔** البتہ یہ مشابہت اور مماثلت کسی قدر قرینِ قیاس نہیں ہے۔

۴۔ **کچھوے کی پشت۔** ققنس کی پیٹھ پر بے ترتیب نقطے اور دھاریاں ہوتی ہیں۔ پروں کے نیچے یہ نقطے شکلِ مسدس کے ضلعوں کی طرح اور بھی بے ترتیب ہو جاتے ہیں۔ پروں کے اوپر جو نقطے ہوتے ہیں وہ لکیروں اور دھاریوں سے مل جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ کچھوے کی کھال ہے۔ بعض قدیم کتابوں میں "ققنس"

کی پیٹھ کو چیتے کی کھال سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۵ - **مچھلی جیسی دُم** - "ققنس" کی دُم بالکل اُس مچھلی سے ملتی جلتی ہے جو بغیر کسی حرکت کے زمین پر چپٹی پڑی ہو۔

۶ - **پانچ رنگ** - اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ کئی رنگ رکھتا ہے۔

۷ - **چھ فٹ لمبائی** - یہ مسلمہ امر ہے کہ پچھلے زمانے میں چین میں جو فٹ رائج تھا وہ عہدِ حاضر کے فٹ سے بہت چھوٹا تھا۔ اور ملک کے اقطاع واکناف میں اُس کے مختلف اندازے تھے۔ اس لحاظ سے اُن کی پیمائش کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ خصوصیت کے ساتھ اِس پیمائش میں یہ تعیّن نہیں کیا گیا کہ یہ لمبائی سر سے پاؤں تک زمین پر بیٹھے ہوئے کی گئی ہے یا کسی درخت پر بیٹھے ہوئے سر سے دُم تک کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ چین اعداد و شمار میں بہت محتاط نہیں ہیں۔ وہ مبالغہ آرائی کے خوگر ہیں۔

یہ ہے "ققنس" کی ماہیتِ جسمی کا تذکرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی وضع وقطع بہت کچھ تیتر (آرگس) سے ملتی جلتی ہے۔ جیسا کہ ڈارون تیتر کے پروں کے متعلق لکھتا ہے کہ: "اُس کے پَروں پر نہایت ہی دلربا اور دلکش ٹیڑھی ترچھی کالی لکیریں ہوتی ہیں۔ اور نقاط سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی چیتے اور تیندوے کی کھال ہے۔" [۱]

اب ہمیں اُن کی آوازوں کے متعلق سوچنا چاہئے۔ بدقسمتی سے میں نے نہ تو تیتر کی آواز سُنی ہے اور نہ ہی "ققنس" کی۔ لیکن "ہیوم اور مارشل" کے صفحہ ایک سو ایک پر بعنوان "ہندوستان، برما، اور سیلون کے شکاری پرند" یہ عبارت درج ہے۔ "نر عموماً دس بارہ دفعہ "ہو ہو" کی آواز نکالتا ہے جب وہ گریز چھوڑتا ہے تو یہ آواز ٹھہر ٹھہر کر آتی ہے جس کا جواب فوراً ہی آس پاس سے مل جاتا ہے۔ بندوق کی آواز اور بندروں کے گزرنے کی چاپ اور آہٹ سے وہ اکثر مشتعل ہو کر بولنے لگتا ہے۔

مادہ کی آواز اچھی طرح سے سمجھ میں آتی ہے۔ وہ "ہاؤ - اُو - وو" کہتی ہے۔ آخری "وو" پر بہت زور دیتی ہے اور دس بارہ دفعہ سرعت کے ساتھ دہراتی ہے لیکن اُس کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ "اُو - وو" کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ نر اور مادہ دونوں کی آواز بہت دور سے سنائی دیتی ہے۔ خصوصاً نر کی آواز تو ایک میل سے بھی زیادہ فاصلے پر سنائی دیتی ہے۔"

یہ عبارت تیتر (آرگس) سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن "ققنس" کی آواز بھی اِس کی آواز سے ملتی جلتی ہے۔

---

[۱] Descent of man, vol. II, P. 141.

میرے خیال میں "فینگ" سے نر اور "ہوانگ" سے مادہ اس لئے مراد لی جاتی ہے کہ اُن کی آواز فینگ اور "ہوانگ" سے میل کھاتی ہے۔ امریکا کا مشہور عالم علم طیور لکھتا ہے کہ "ملایا میں تیتر کی آواز" کو آن" اور "کوانگ" سمجھی جاتی ہے۔ سکائی کے وحشی "لو اِک" "سیامی" "کی اِک" اور سماٹرا کے دیسی باشندے "کوئی ویو" یا "کوآؤ" ترجمہ کرتے ہیں۔ اس لئے اُن ممالک میں اس پرند کا یہی نام پڑگیا ہے۔" [له]

جب چین کے "ققنس" اور تیتر کی تحقیق ہوچکی تو "ققنس" کی ہستی سے انکار کرتے نہیں بنتی اور جو شبہات اُس کے وجود کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں وہ وہم باطل ہیں۔

تیتر کا شکار بندوق سے بڑی مشکل سے کھیلا جاتا ہے۔ پھر "ققنس" کا تو کیا کہنا۔ وہ ہمیشہ آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے اور اُسے دُور سے بھی ایک نظر دیکھ لینا محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں صرف چار ہی ایسے عجائب خانے ہیں جن میں اُس کے ڈھانچے ملتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر بیبی لکھتے ہیں۔ "اس قسم کے پرندے سب سے زیادہ پوشیدہ رہتے ہیں۔ ہم اُن کے آس پاس رہتے ہیں، اُن کی آوازیں سنتے ہیں اور اُن کی رقص گاہوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوتے ہیں لیکن انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ راتوں کو اکثر اُن کی آوازیں ہمارے کانوں میں آتی رہتی ہیں۔ جس سے اہلِ چین کے خیالی اور فرضی "ققنس" کی اصلیت و واقفیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔" [له]

اس پرند کی ظاہری شکل و صورت اور اُس کے خصائص کا اندازہ کرکے ایک محقق اُسے تلاش کرسکتا ہے۔

چینی ادبیات میں "سفید فینگ" اور "سفید لُواں" کا ذکر کئی بار ملتا ہے۔

چین میں تیتر کا نظر آجانا نیک شگون اور سعادت سمجھی جاتی ہے۔ اِس کے ظاہر ہونے کو امن و امان اور کسی بڑے پارسا کے پیدا ہونے کی نوید سمجھا جاتا ہے اور یہ عقیدہ اب تک اہلِ جاپان کے دلوں میں راسخ ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ سفید تیتر [له] شہنشاہِ "تنجی"۔ "تیمو" اور "شوٹو" کو ہدیۃً پیش کئے گئے تھے۔

مَیں نہیں جانتا کہ مشرقی مصنفین نے "ققنس" اور "لوآں" کے متعلق دادِ تحقیق دی ہے یا نہیں لیکن یورپ میں اُس کی باقاعدہ تحقیق و تدقیق شروع ہے۔ اے نیوٹن سابق پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی جو ممتاز عالمِ علمِ طیور تھے "جامع العلوم" "توشوچی چنگ" میں لکھتے ہیں کہ "فینگ" کی تصویر صرف وہی مصور بناسکے گا جس نے مور کو دیکھا ہو۔ فینگ کی وضع قطع بہت کچھ تیتر سے ملتی جلتی ہے۔ [له]

له A monograph of the Pheasants By William Beebe. (Vol. iii, P. 118)

له A monograph of The Pheasant (Vol, iV, P. lxxxi)

له Teri, Vol, II, No. 9, P. 844. له Giles, Adversaria Sinica, (Vol. I, P.P. 9, 10)

(آرگس) کے متعلق مجھے پروفیسر نیوٹن سے کلی اتفاق ہے۔ لیکن مجھے اس بات سے قطعًا اتفاق نہیں ہے کہ "ققنس" مور کو دیکھ کر پہچانا جا سکتا ہے۔ میرے دلائل حسب ذیل ہیں:-

"گینگ" کے لغوی معنی سوراخ کے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کی دُم پر آنکھوں جیسے نشان ہوتے ہیں۔ یہ خاصیت "ققنس" کے کسی قدیم نام کے ساتھ بیان نہیں کی گئی۔

چینی اور جاپانی زبان میں بعض ایسی اصطلاحیں بھی موجود ہیں۔ جن میں لفظ "فینگ" آتا ہے۔ مثلاً

(۱) "ققنس" کے سر کی سی بط (کلغی دار بط) - اُس کی کلغی پیچھے کی طرف مڑی رہتی ہے۔ لیکن مور سے بالکل نہیں ملتی۔ مور کا تاج عمومًا اوپر کو اُٹھتا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔

(۲) "ققنس" کی دم کی مانند کھجور کا درخت۔

(۳) "ققنس" کی دم کی سی سنہری مچھلی۔

ان میں "فینگ" کا استعمال مور کے لئے کہیں نہیں کیا گیا۔ جو دُم اور کلغی کے لحاظ سے اُن پرندوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

آخر میں میری تجویز ہے کہ چین کے اس خیالی پرند کو "ققنس" کہنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس بات کا کہیں ثبوت ملتا ہے کہ یہ مرغِ آتش نفس خود ہی جل بجھ کر ختم ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پرند کو اپنی آواز کی مناسبت سے "ہُو اُو" کہا جائے تو دوسرے ناموں سے کہیں زیادہ موزوں ہوگا۔

صادق ایوبی

خدایا از تو زاہد حُورِ طلبد قصورش بیں

بہ جنت می گریزد از سرِ کویت شعورش بیں

بہ این نہ ہر دو بہ این تقویٰ بر این سالوسِ خود، مارا

ز رحمت دور می داند خداوندا شعورش بیں

سرمد

غزل

دلِ حزیں سے خلش کاوشِ ستم نہ گئی!
ابھی تک، اُن کی نگاہوں کی خوئے رم نہ گئی!!

ملی، نہ سعیِ برہمن سے زاہدوں کی مراد
چراغِ دیر سے تاریکیٔ حرم نہ گئی!

ہنوز عشق سے اندازِ بے کسی نہ چھٹا!
ہنوز حسن سے رنگینیٔ ستم نہ گئی!

حرم میں حضرتِ زاہد نے لاکھ سر مارا
جبیں سے تیرگیٔ سجدۂ صنم نہ گئی!

بتوں کو نکلے ہوئے مدتیں ہوئیں لیکن
ہنوز فطرتِ بت سازیٔ حرم نہ گئی!

مزاجِ حسن سے، بے باکیٔ ستم نہ مٹی
داغِ عشق سے، افسردگیٔ غم نہ گئی

طلوعِ صبحِ حقیقت ہے، ذرہ ذرہ مگر
ابھی کشاکشِ بت خانہ و حرم نہ گئی!

وہ میری شوخ نگاری پہ لکھتے ہیں اختر
ابھی تک، آپ کی گستاخیٔ قلم نہ گئی!؟

اختر شیرانی

غزل

قصہ ہائے سوزشِ غم درجِ عنواں ہی رہے
دل میں جو تھے چند قطرے زیبِ مژگاں ہی رہے

شمع پر معصوم پروانوں کا گرنا ہائے ہائے
یہ گرفتارِ فریبِ عہد و پیماں ہی رہے

تو ہی بتلا دے کریں اب جستجو تیری کہاں
عمر بھر ہم ڈھونڈتے اپنی رگِ جاں ہی رہے

جیب و دامن کی نہ لی وحشت میں تم نے کچھ خبر
وائے ناکامی کہ مصروفِ گریباں ہی رہے

گھر میں مجبورِ سلاسل آبلہ پا دشت میں
ہم گرفتارِ جنونِ فتنہ ساماں ہی رہے

وائے حسرت جل گئے سب نونہالانِ امید
داغہائے سوزِ الفت دل میں پنہاں ہی رہے

ہو گیا اپنا چمن افسوس تاراجِ خزاں
دل کے ارماں لے رہا بس دل کے ارماں ہی رہے

وقت کے بیش قیمت لمحے

کاروباری لوگ اپنے مال کی ساخت پرداخت اور فروخت کو حتی الامکان موثر بنانے میں، تجارت کو مستحکم کرنے اور اس کو فروغ دینے کے لئے طرح طرح کے طریقے سوچتے ہیں، اور غیر ضروری محنت اور غیر ضروری تفصیلات کے قطع کرنے میں اپنی انتہائی کوشش صرف کر دیتے ہیں لیکن کتنے کم ہیں وہ لوگ جو اپنی خانگی زندگی میں وقت کو موثر بنانے کے لئے اپنی توجہ خرچ کرتے ہیں۔ اور بیش قیمت لمحے اور گراں بہا ساعتیں بچا لیتے ہیں۔

دنیا میں رہنے کے لئے جو فرصت تمہیں ملی ہے وہ اتنی زیادہ نہیں جتنی تم اسے سمجھ رہے ہو۔ اگر تم اپنی عمر کو ساٹھ سال بھی فرض کر لو تو اُن میں سے بیس سال تم بستر ہی پر صرف کر دیتے ہو۔ گویا تمہاری مختصر سی زندگی کے دو قرن سوتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

اُن بیس اور چار چوبیس گھنٹوں کو جو ہر روز تمہیں خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ گزر جاتے ہیں کسی نے تمہارے عرصۂ زندگی پر خوب پھیلایا ہے۔ اس ساٹھ برس کی مدت میں وہ سال بھی شامل ہیں جو بچپن اور لڑکپن میں گذر رہے۔

بیس سال نیند میں،

تین سال کھانے میں،

نو مہینے دسترخوان پر کھانے کے انتظار میں،

سترہ سال چھ مہینے کام میں،

سات سال چھ مہینے مسرت کے تعاقب میں۔

چھ سال تین مہینے سیر اور دوسری ورزشوں میں،

دو سال چھ مہینے بناؤ سنگار میں،

دو سال چھ مہینے بالکل کچھ نہ کرنے میں۔

ہر وقت گھڑی کی ٹِک ٹِک ہمیں یاد دلاتی رہتی ہے کہ وقت گزر رہا ہے اور ہم اپنی زندگی کا اس قدر حصّہ اپنے پیچھے اپنی دسترس سے باہر چھوڑ آئے ہیں۔ گھڑی کے ہر کھٹکے کے ساتھ عمر کا ایک لمحہ ٹوٹ کر گرتا ہے اور دوبارہ اُس میں پیوست نہیں ہو سکتا۔ ہم اُسے پھر کبھی استعمال نہیں کر سکتے۔ ہم ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو گئے۔ ہر لمحہ اور ہر

گھڑی اور ہر روز اور ہر ہفتہ جسے ہم بلا استفادہ گزر جانے دیتے ہیں یا اس سے کامل فائدہ حاصل نہیں کرتے، انجام کار ہمارے خلاف ایک شاہد بنے گا۔ یہ زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی چیز کے ضائع کرنے کا الزام ہم پر لگائے گا۔ وہ قیمتی چیز جو درحقیقت خود زندگی ہے، کیونکہ وقت زندگی اور زندگی وقت ہے۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو اپنی عملی زندگی کے اوقات کو از سرِ نو ترتیب دے کر کم از کم ایک گھنٹہ بچا سکتے ہیں۔ ہم میں سے بہت ایسے ہیں جو زیادہ سوتے ہیں۔

یہ لازم نہیں ہے کہ چونکہ بیداری کے وقت ہماری آنکھیں خواب آلود ہوتی ہیں اس لئے ہمیں زیادہ نیند کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نو یا آٹھ گھنٹے بستر میں گزارتے ہیں، بلکہ اگر ہم اس وقت کا اکثر حصہ سوتے ہوئے بھی صرف کرتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اگر ہم ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ اس میں سے وضع کرلیں گے تو ہم بیمار ہو جائیں گے۔ اس تھوڑے وقت میں قدرتی طور پر ہم پہلے سے اچھی طرح سوئیں گے، کیونکہ گہری نیند ہی قابلِ لحاظ ہے۔

بچوں کے سوائے سب کے لئے سات گھنٹے کی گہری نیند کافی ہے۔ اور مجھے اس میں شک ہے کہ نوجوانوں کو اس سے زیادہ نیند کی ضرورت ہے۔ اگر وہ لوگ جن کا جسم مضبوط ہے اور جن کی صحت اچھی ہے سات گھنٹے سوئیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی نیند پوری کرلی۔

سوچو کہ کسی شخص کے لئے اپنی عملی زندگی کے زمانے میں ایک گھنٹہ روزانہ بچا لینے کے کیا معنی ہونگے! اُن کی زندگی ان زریں ساعتوں کی دولت سے مالا مال ہو جائے گی!

میں نے لوگوں کو اکثر یہ شکایت کرتے سنا ہے کہ اُنہیں مطالعہ کے لئے فرصت نہیں ملتی اور اُن کا تمام وقت کام کاج اور میل ملاقات میں صرف ہو جاتا ہے۔ وہ اس معاملہ میں متاسف معلوم ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اس دماغی کاہلی آوری کو جو اُن پر مستولی ہو چکی ہے زیر کرنے کی جرات اور حوصلہ نہیں رکھتے۔ سچ یہ ہے کہ اگر اُن لوگوں کو موجودہ فرصت سے دہ چند فرصت بھی میسر آجائے تب بھی انہیں پڑھنے یا کسی اور قسم کی ترقی کرنے کے لئے وقت نہیں ملے گا۔ اگر ہمیں کسی بات سے حقیقی دلچسپی ہے تو یاد رکھو کہ اُس کے لئے ہمیں وقت بھی مل جائے گا۔ کیا ہمیں ہمیشہ اُس کام کے لئے وقت نہیں مل جاتا جس کو ہمارا دل چاہتا ہے؟ کیا تم مجھے کوئی ایسا نوجوان دکھا سکتے ہو جسے دن رات کسی چیز کی لگن لگی رہے اور پھر اُس کے لئے اُسے وقت نہ ملے؟

کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ پندرہ منٹ روزانہ میں جو چوبیس گھنٹوں کی ایک دنی سی کسر ہے تم کیا کیا کچھ کر سکتے ہو؟ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ ادبیات کا کتنا علم تم اپنے دماغ میں جمع کر سکتے تھے؟ تاریخ، سیاسیات اور ایسے کتنے ہی علوم کا عبور حاصل کر سکتے تھے اگر تم صرف اِن انقلاب پرور لمحات کو کام میں لاتے۔

ہارورڈ کے سابق صدر ایلیٹ کا قول ہے کہ اچھی قسم کے ادبیات کا ہر روز پندرہ منٹ تک بہ غور مطالعہ کیا جائے تو چار سال کے عرصہ میں ایک شخص عمدہ ادیب بن سکتا ہے اور اُس میں وسعتِ قلب اور وقتِ نظر پیدا ہو سکتی ہے۔ اب اگر پندرہ منٹ روزانہ سے انسان اتنی ترقی کر سکتا ہے تو خیال کرو کہ ساٹھ منٹ کے امکانات کیا ہوں گے؟ ایک گھنٹہ روزانہ کام کرکے تو وہ اپنی قابلیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گا، اور علم کے موتیوں سے اپنی زندگی کا دامن بھر کر مالا مال ہو جائے گا۔

کیا تمہیں علم ہے کہ ایک گھنٹہ روزانہ کام کرنے سے تھوڑے ہی عرصہ میں تم کئی ایک زبانوں کے ماہر بن سکتے ہو؟ کیا تم جانتے ہو کہ روزانہ ایک گھنٹہ صرف کرنے سے تم معمولی زندگی سے ایک بہت بلند زندگی حاصل کر سکتے ہو؟ تم سمجھتے ہو گے کہ تم غریب ہو اور تمہیں کوئی موقع حاصل نہیں لیکن اگر تم جانتے کہ تمہارے قلب کے اندر کتنے زر و جواہر جمع ہیں اور تمہارے فارغ اوقات میں کتنی دولت پوشیدہ ہے تو تم حیران رہ جاتے۔ آہ کاش کہ میں نوجوانوں کے دلوں پر نقش کر سکتا کہ غریب سے غریب لڑکے اور غریب سے غریب لڑکی کے لئے اُس کے فارغ اوقات میں عظیم سے عظیم امکانات موجود ہیں!

بہت کم لوگوں کو اندازہ ہے کہ ترقی کے لئے اُن کے پاس درحقیقت کتنا وقت موجود ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہمیں کتابیں اور رسالے پڑھنے کے لئے یا ترقی کے کسی اور طریقے کو اختیار کرنے کے لئے وقت نہیں ملتا۔ واقعی فارغ اوقات کی اصلیت سے ناواقف ہیں۔ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ کتنا وقت وہ بے مصرف باتوں بے حاصل کاموں اور بے فائدہ خیالوں میں گزار دیتے ہیں۔ میرے دوستو، خیال تو کرو کہ اگر تمہاری جگہ لنکن ہوتا تو وہ ان لمحات سے کتنا کام لیتا جنہیں تم اکارت کھو دیتے ہو۔ اور تمہاری یہ عادت ایک ایسی عادت ہے جو تمہاری تمام زندگی کو بداخلاق بنا دے گی۔

جب نوجوان میرے پاس اس معاملہ میں مشورہ لینے آتے ہیں کہ ہم کیونکر اپنی ذات سے بہتر سے بہتر کام لے سکتے ہیں تو میں ہمیشہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ اپنے وقت کی کس حد تک قدر کرتے ہیں۔ اگر میں دیکھتا ہوں کہ وہ گزرتے ہوئے وقت سے ہر موقع کو جذب کر لینے کے لئے بے قرار ہیں تو میں جان لیتا ہوں کہ ان میں کامیاب ہونے کی اور قابلیتیں بھی موجود ہیں، کیونکہ یہ صفت کسی شخص میں اکیلی نہیں پائی جاتی۔ کامیابی کی صفات ہمیشہ یکجا ملتی ہیں۔ وہ بے کاروں اور کاہلوں میں نہیں ملتیں، اُن میں جن کا کوئی مقصد اور کوئی مطمحِ نظر نہیں ہوتا۔

ماڑون — منصور احمد

محفلِ ادب

امید

۱

فضائے اثیر کی خاموش اور پُرسکون دنیا ہماری ہنگاموں سے معمور اور پُرشور دنیا سے بالکل ہی مختلف تھی۔ اِس عجیب و غریب دنیا میں صرف ایک عورت آباد تھی۔ اور ہماری دنیا کے کروڑہا دلوں پر اُس کی حکومت تھی۔ اُس کی عمر کا صحیح اندازہ کون لگا سکتا تھا۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی وہ اسی طرح موجود تھی۔

ہاں اس کا وجود ہمیشہ سے تھا۔ دنیا اُس کے بغیر قائم نہ رہ سکتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے نوجوان تھی۔ اور آخر تک ایسی ہی رہے گی۔ اُس کا نام "امید" تھا۔ اور "امید" کبھی بوڑھی نہیں ہو سکتی۔

اُس کے بال لمبے اور سنہرے تھے اور اُس کا نورپاش چہرہ حسین اور روشن تھا اگر اُسے کوئی چاند کے بالمقابل بیٹھے ہوئے دیکھ لیتا تو شاید وہ کہہ سکتا کہ چاند اُس کے چہرے سے کسبِ نور کرتا ہے۔ اُس کی زندگی میں لاکھوں قسم کے انقلاب رونما ہوئے لیکن ہمیشہ اُس کے چہرے سے ایک بچے کی سی بے لاگ معصومیت ہویدا رہی۔ کیونکہ وہ امید تھی اور "امید" کو دنیا کی کثافتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ہماری دنیا کے ایک ایک ذرہ میں دل موجود تھا۔ اور ان سب پر اُس کی حکومت تھی۔ وہ ہر دل میں دوسرے سے بڑھ کر مسرور نظر آتی تھی۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ خود اُس کا دل بھی ویسا ہی مسرور تھا؟ کیا اُسے وہ شے جسے حقیقی معنوں میں مسرت کہا جا سکتا ہے حاصل تھی؟

اُس کا مسکن نور کے بنے ہوئے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔ وہ اکثر اپنا چہرہ اپنے گھٹنوں میں چھپائے رکھتی تھی۔ اُس کے بال اُس کے شانوں پر بکھرے رہتے تھے اُس کے پاؤں کے قریب ایک چشمہ بہتا تھا جس کا پانی جلتے ہوئے آنسوؤں کی طرح گرم تھا۔

(۲)

شاید قیامت بہت ہی نزدیک تھی۔ کائنات کا آخری دن قریب آرہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ ایک ملکہ کے انداز میں آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے قدم اُٹھاتی ہوئی۔ آج اُس کا چہرہ مرجھا گیا۔

اور افسردہ تھا۔ اُس کے اعضا کسی ناتمام محنت سے تھکے ہوئے اور سست معلوم ہوتے تھے۔ اُس نے اپنا رباب ہاتھوں میں اٹھایا اور پھر اُسے قدرے پتھروں پر پھینک دیا جب سے دنیا پیدا ہوئی یہ رباب دنیا تک امید کے نغمے پہنچاتا تھا لیکن اب وہ اُسے بے کار چیز سمجھ کر چھوڑ رہی تھی۔ اپنی جائے قیام پر ایک وداعی نگاہ ڈال کر آہستہ آہستہ وہ ہماری دنیا کی طرف نیچے کو اتر آئی۔ اُس کا سفید لباس موتی کی طرح دمکتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اُس کی سیاہ پلکیں آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں۔

سمندر کے کنارے تک پہنچ کر وہ رُک گئی اُس نے کہا "میں دنیا میں امید بن کر آئی تھی لیکن اپنے ہر مقصد سے ہمیشہ کوسوں دور رہی۔ امید کبھی بر نہیں آئی۔ میں ناکام ہوں ہمیشہ سے ناکام۔ میرا وجود دنیا میں صرف ایک سراب کی مانند رہا۔ میں خود بھی نہیں جانتی کہ میں کیا ہوں اور کون میرے ہر مقصد کو ساتھ ساتھ مٹاتے جا رہا ہے۔ مجھے شک ہے کہ میں کچھ ہوں ہی نہیں۔ کیا میرا کام صرف لوگوں کو فریب میں مبتلا رکھنا ہی تھا۔ اب میں اس پر اسرار زندگی سے اکتا گئی ہوں۔ میں خود اپنی ہستی سے بھی بے خبر ہوں میں دنیا میں کسی سے اپنے دل کا راز نہیں کہہ سکتی۔ میں جو ہر دل کی مونس و ہم راز ہوں۔ میرا کوئی ہم راز نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ میری روح بھی میرے جسم سے بیگانہ ہے۔ اگر میں اپنے دل کی بات کسی ایک متنفس سے بھی کہہ دیتی تو یہ دنیا کبھی کی اجڑ کر رہ گئی ہوتی۔ اُف یہ تنہا زندگی، یہ فریب کی زندگی۔ میں اس سے اکتا گئی ہوں"

اُس نے اپنا سر اوپر کو اُٹھایا اور کائنات پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ اب بھی لوگ امید کے فریب میں مبتلا تھے۔ بہت دور ایک بوڑھا اپنے ننھے بچے پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اُس کے دل میں امید تھی "میرا بچہ بڑا ہوگا۔ اور میرا خدمت گذار ہوگا" یہ امید ہی تھی جو اُسے یہ سمجھنے کا موقع نہ دے سکتی تھی کہ بچے کے بڑا ہونے تک خود وہ دنیا میں موجود نہیں ہوگا کئی لوگ جن کی تقدیر میں عمر بھر کے لیے ناکامی لکھی جا چکی تھی امید کے فریب میں مطمئن نظر آتے تھے۔

سورج کل پھر اسی آب و تاب سے چمکنے کی امید پر اپنی آرام گاہ میں اطمینان کی نیند سو یا پڑا تھا۔ اور چودھویں رات کے جگمگاتے ہوئے چاند کے دل میں بھی ایک امید تھی۔ کل سے اُس کا زوال شروع ہوگا لیکن آخر ایک دن پھر وہ اسی طرح آسمان پر جلوہ گر ہوگا۔ ستارے اپنے دل کی کسی پر کیف امید سے خوش ہو کر جھلملا رہے تھے۔

ننھے ننھے پھول گھاس میں سے سر نکال نکال کر جھانک رہے تھے۔ شاید اپنے انجام سے بے خبر انہیں ایک دائمی زندگی کی امید تھی اور پانی کے کنارے اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے ایک دن بلند ہونے کی امید پر خوش ہو ہو کر جھومتے تھے خاک کے ایک ایک حقیر ذرہ کے دل میں بھی امید جلوہ گر تھی۔

اُس نے کہا "آج یہ فریب ختم ہوتا ہے" وہ پانی میں اتر پڑی اور اب اُس کے پاؤں پانی میں ڈوب چکے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ آگے کی طرف گہرے پانی میں جا رہی تھی۔ پانی اُس کی گردن کو چھو رہا تھا جب اُس نے مڑ کر دنیا کو الوداع کہی۔

اب تک دنیا نا امید نہ ہوئی تھی۔ آخری بار اُس نے تبسم کیا۔ وہ مسکرانے لگی سمندر کی تیز رو موجوں میں دفعۃً سوتی چمک اُٹھی ایک تند و تیز لہر اُٹھی اور امید نے اپنے خوبصورت چہرے کو ہمیشہ کے لئے پانی میں چھپا لیا۔ لیکن ابھی اُس کے بال پانی کی سطح پر چمک رہے تھے۔

موت آگے بڑھی اور اُس نے امید کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ سمندر کا پانی دفعۃً رک گیا۔ اب اُس کے دل کوئی امید نہ تھی

دنیا صرف امید سے قائم تھی۔

ارض و سما نا امید ہو ہو کر اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ چاند، سورج اور ستارے اب کس امید سے اپنی جگہ پر قائم رہتے۔

اور وہ لوگ جو خدا جانے کس امید پر قبروں میں گہری نیند پڑے سوتے تھے اب اُٹھ اُٹھ کر باہر آرہے تھے۔

امید مر چکی تھی اور صبحِ قیامت نمودار ہو رہی تھی

"نور جہاں"

اجنبی

صنمِ فرنگ، قمر جبیں، بتِ سیم رنگ، غضب حسیں

وہ عذار نازک و شرگیں کہ رقیب ساغرِ آتشیں

وہ ہوا میں کاکلِ عصفریں کہ شہابِ ثاقبِ شب رواں

ورقاتِ غنچہ گلاب گوں، دو لبِ گداز پُر از فسوں

مژہ درازِ کج و نگوں میں نہاں وہ دیدۂ نیلگوں

کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبدِ آسماں

تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ، نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا

ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلاسلِ الم و بلا

مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں، تجھے کیا خبر گئی کس کی جاں

(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم) (بحرِ سفید، جہاز شہر کلکتہ ۱۹۱۴ء)

"اردو"

پیغمبر

اُس دم سے جب کہ منصفِ ازلی نے میرے ضمیر کو روشن کیا اور اپنا پیغام پہنچانے کا حکم دیا مجھے ہر شخص کی پیشانی پر اُس کے گناہ اور اُس کے بُرے ارادے لکھے ہوئے نظر آنے لگے۔ (انسانیت پر سے یہ دھبہ مٹانے کے لئے ایک

نے محبت اور حق پرستی کی پاک تعلیم دینا شروع کی جس کے جواب میں میرے عزیزوں اور دوستوں نے سب سے پہلے مجھ پر پتھر مارے۔ میں نے اپنی قوم کے ماتم میں سر پر خاک ڈالی اور ننگے ہاتھ ننگے بدن شہر سے نکل بھاگا۔ اب میں ویرانوں میں بسر کرتا ہوں اور اس غربت میں میرا خدا کسی نہ کسی طرح مجھے روزی پہنچاتا رہتا ہے۔ میرے دل پر خدا کے احکام کا نقش ہے، چڑیاں اور جانور سب میری غزلیں بیداری کرتے ہیں، اور راتوں کو ستارے میری آواز بن کر جگمگاتے ہیں۔ لیکن جب کبھی شہر میں سر جھکائے قدم بڑھائے گذرتا ہوں تو بوڑھے تمام بچوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہیں اور خود ستائی سے مسکراتے ہوئے کہتے ہیں "دیکھو بچو تمہارے لئے یہ ایک مثال ہے: یہ آدمی مغرور تھا۔ ہماری زندگی اسے نہیں بھائی ہمارے ساتھ رہنا گوارا نہ ہوا۔ بیوقوف یہ ہمیں یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس کی زبان سے خدا خود بول رہا ہے۔ دیکھو بچو، اسے اچھی طرح دیکھو! دیکھو یہ کیسا غمگین دبلا پتلا، مایوسی سے پیلا پڑ گیا ہے، دیکھو کیسا پھٹے حال کا فقیر ہو کر رہ گیا ہے۔ کیسی حقارت سے سب اسے دیکھتے ہیں۔

"جامعہ" ——— لیرمنتوف

محاسبۂ نفس

بڈھا سونے سے پہلے دار المطالعہ کے ننگے فرش پر ٹہل رہا ہے۔ جب تک اپنی ذات پر آخری محاکمہ نہ کر لے اور جب تک گذشتہ چوبیس گھنٹوں میں سے ہر ایک گھنٹے کا سختی سے جائزہ نہ لے لے اُس وقت تک نیند کہاں۔ روزنامچہ میز پر کھلا پڑا ہے اور اس کا سفید صفحہ چشم ضمیر کی طرح اُسے گھور رہا ہے۔ وہ دن کے ایک ایک لمحے پر تنقیدی نگاہ ڈالتا اور ایک ایک گھڑی کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ اُسے غربت زدہ کسان عورت یاد آتی ہے۔ اور افسوس ہوتا ہے کہ میں ایک حقیر درہم دینے کے سوا اُس کی کچھ مدد نہ کر سکا۔ اُسے یاد آتا ہے کہ میں ایک فقیر کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اُسے اُن درشت خیالات کی یاد ستاتی ہے جو اس کے دل میں بیوی کے متعلق پیدا ہوئے وہ اپنی تمام لغزشیں اور فرو گذاشتیں بے کم و کاست روزنامچہ میں درج کرتا ہے اور اس دن کے اندراج کو یوں ختم کرتا ہے۔

"پھر بوڑھا نہ اُترا۔ روح پھر مفلوج ہی رہی۔ کافی نیکی نہ ہو سکی۔ پھر ثابت ہوا کہ عام عالم انسانیت کی بجائے گرد و پیش کے لوگوں کے ساتھ محبت کرنے کا مشکل کام مجھے ابھی آیا ہی نہیں۔

پھر وہ اگلے روز کی تاریخ اور اُس کے ساتھ تین پُر اسرار حروف "اگر زندہ رہا" درج کرتا ہے۔

کام ختم ہو گیا۔ دن کا خاتمہ ہوا۔ جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ سونے کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اپنے بھاری بُوٹ سے پاؤں نکال لیتا ہے۔ کپڑے اتار کر بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔ اب اُسے موت یاد آتی ہے۔ خیالات اُس کے دماغ کو

فضا میں گرمِ پرواز ہیں اور آہستہ آہستہ یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے جنگلوں کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں تیتریاں۔ نیند اُس کے دلِ غم کے دروازے پر منڈلا رہی ہے۔

"ہیں! یہ کیا؟" وہ یکلخت اُٹھ بیٹھتا ہے۔ کیا یہ پاؤں کی آواز نہ تھی؟

ہاں ساتھ والے کمرہ میں ایک قدم۔ ہلکا دزدیدہ۔ . . . . . وہ پھرتی سے مگر بے آہٹ بستر سے کودتا ہے اور اپنی شعلہ بار آنکھ روزنِ در سے لگا دیتا ہے۔

ہاں ایک روشنی سی . . . . . کوئی چراغ بکف کمرے میں گھسا ہوا ہے۔ اور میز کی تلاشی لے رہا ہے روزنامچہ کی ورق گردانی میں مصروف ہے اور اُسکی روح کے رازہائے سربستہ کو بے نقاب کر رہا ہے۔

یہ اُس کی بیوی صوفیا انڈریونا ہے۔ مشتاق و مضطرب و بے قرار . . . . . ہر طرف چشمِ تجسس اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر جانے اور اُس کے نہاں خانۂ دل کے حریمِ قدس تک پہنچنے کے لئے بیتاب ہے۔

وہ غصہ سے لرزہ براندام ہے۔ ایک حرکتِ اضطراری کے ساتھ وہ زنجیرِ در کو پکڑتا ہے۔ تاکہ یکلخت دروازہ کھولے اور بیوی کی گت بنائے۔ مگر آخری لمحہ میں سنبھل جاتا ہے کہ "شاید یہ بھی امتحان ہی ہو" اور چپ چاپ دبے پاؤں بستر کی طرف لوٹتا ہے مگر نیند کہاں!

ٹالسٹائی، اپنے زمانہ کا سب سے بڑا، سب سے قابل شخص یہاں لیٹا ہوا ہے۔ اُس کا گھر اُس کا پھندہ دار، اُس کا دل شکوک و شبہات کی روح فرسا کشمکش میں مبتلا، اور اُس کی روح ناقابلِ بیان تنہائی میں غرق ہے۔

"مخزن"

شاعری کا مستقبل

"شاعری کا مستقبل نہایت وسیع ہے اس لئے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائیگا۔ ہمیں اِس امر کا احساس ہوتا جائیگا کہ ہماری زندگی کے لئے صرف ایک سہارا باقی ہے اور وہ شاعری ہے۔ ایسی شاعری جو زندگی کے اعلیٰ اور برتر مقاصد کے لائق ہو۔ دنیا کے سبھی عقائد متزلزل ہوئے ہیں، کونسا اصول تھا جس پر اعتراض نہیں کیا گیا اور کونسی روایت ہے جو بالآخر بے بنیاد ثابت نہیں ہوئی؟ مذہب نے بھی نشو و نما حاصل کیا ہے تو چند حقائق کی بدولت۔ ہمارے تمام مذہبی جذبات انہیں حقائق سے وابستہ ہیں لیکن یہی حقائق ہیں جو اب ناپائیدار ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ صرف شاعری ہے جس کو سوائے خیال کے اور کسی چیز سے بحث نہیں"

میتھیو آرنلڈ

"صوفی"

تبصرہ

دنیا کا محسن - جناب میرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب قادیانی کی وہ طویل و بسیط تقریر ہے جو انہوں نے ۱۷ جون ۱۹۲۸ء کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت بے نظیر قربانیوں اور عدیم المثال احسانات پر ایک مجمع عام میں فرمائی۔ یہ جلسہ اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ ملک کے تمام مذاہب کے پیروؤں تک یہ پیغام پہنچایا جائے کہ وہ دنیا کے تمام ادیان کے بزرگوں اور ہادیوں کا ادب و احترام کریں۔ رسولِ کریم صلعم کی ذاتِ گرامی کے متعلق مخالفین نے جو طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کر رکھی ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے یکسر دور ہو جاتی ہیں۔ ہماری رائے میں اس کی بکثرت اشاعت ہونی چاہیئے۔ حجم ۱۱۱ صفحات اور قیمت چار آنے ہے۔ بک ڈپو دار الاشاعت قادیان سے طلب فرمائیے۔

جین دھرم - مصنفہ مہرشی شوبرت لال جی۔ جین مت دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ہے۔ اور بہ قول مصنف اخلاق، پاکیزگی، لطافت اور روحانیت کے نقطۂ خیال سے انسانی کمال کی مجسم تصویر بن جانا جینی ہونا ہے۔ خدا کی نسبت جینیوں کا خیال ہے کہ وہ آفریدگارِ عالم نہیں، بلکہ انسان ہی کمل ہو کر خدا کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کتاب میں جین دھرم کی تاریخ فلسفہ عقاید اور بزرگوں کے حالات درج ہیں۔ مذاہب کے ساتھ شغف رکھنے والوں کے لئے دلچسپ کتاب ہے۔ حجم ۷۰ صفحات اور قیمت چار آنے ہے۔ پتہ:- سکرٹری جین منڈل دھلی۔

طفلِ اشک - اس نام سے مولوی محمد محسن صاحب صدیقی، بی، اے علیگ نے ایک نہایت عمدہ انگریزی ناول کا ترجمہ کیا ہے۔ افسانہ میں یورپ کی شریفانہ اور کامیاب زندگی کا نمونہ پیش کیا گیا ہے اور جناب مترجم نے یہ مقصد پیش نظر رکھا ہے کہ وہ لوگ جو یورپ کی تقلید اندھا دھند کر رہے ہیں وہاں کی اچھی باتوں کی بھی تقلید کریں۔ اور اپنے عادات اور اخلاق کی اصلاح کریں۔ زبان صاف اور شستہ ہے اور اندازِ تحریر دلچسپ ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مطبع رہبر دکن، افضل گنج، حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

سوشیلا - مصنفہ خان قدرت اللہ خاں صاحب دیوانہ بریلوی محلہ کرنل گنج کانپور۔ ۴۸ صفحے کا ایک دلچسپ اور سبق آموز قصہ ہے جس میں اصول تحفظ زچہ و بچہ پر ضروری باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ تمام اصول، علمِ طب کی مسلم الثبوت کتابوں اور جدید ترین تحقیقات سے اخذ کئے گئے ہیں اور اُن کو ایسے سادہ پیرایہ میں لکھا ہے کہ عورتیں بڑی آسانی سے استفادہ کر سکیں گی اور شوق سے پڑھیں گی۔ ہمارے خیال میں حفظانِ صحت کی انجمنوں کو ایسی کتابیں خرید کر مفت تقسیم کرنی چاہئیں۔ قیمت پانچ آنے مقرر ہے۔ جناب مصنف سے ملتی ہے۔

THE RIYASAT DELHI
تارکا پتہ ریاست دہلی
ٹیلیفون نمبر
ہندوستان کا بہترین باتصویر ہفتہ وار
ریاست دہلی
ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتوں
جلد
ہر سنیچر کو ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی سے شائع ہوتا ہے
نمبر
The Best Illustrated Urdu Weekly
ہر ہفتہ
تقریباً چالیس ہاف ٹون
عکسی تصاویر
چونسٹھ صفحہ ضخامت ۔ اعلیٰ کاغذ
بہترین چھپائی
نمونہ کے لئے اس پتہ پر ایک کارڈ
لکھئے
منیجر ریاست دہلی
GATEWAY OF INDIAN TRADE
قیمت فی پرچہ
چھ آنے

شہنشاہ ہند غازی اورنگ زیب عالمگیر (رحمۃ اللہ علیہ)
کے ہاتھ کا لکھا ہوا
قرآن مجید
فوٹولیکر اور بلاک بنوا کر چھپوایا گیا ہے

اس کا ایک ورق بطور نمونہ ذیل میں درج ہے

اگرچہ اسے نمونہ کہنا صحیح نہیں۔ قرآن مجید بلاک کے ذریعہ چھپا ہے اور یہ بلاک کا چربہ ہے جو لیتھو کے ذریعہ چھپا ہے

(بلاک کی چھپائی اور لیتھو کی چھپائی میں بہت سا فرق ہوتا ہے)
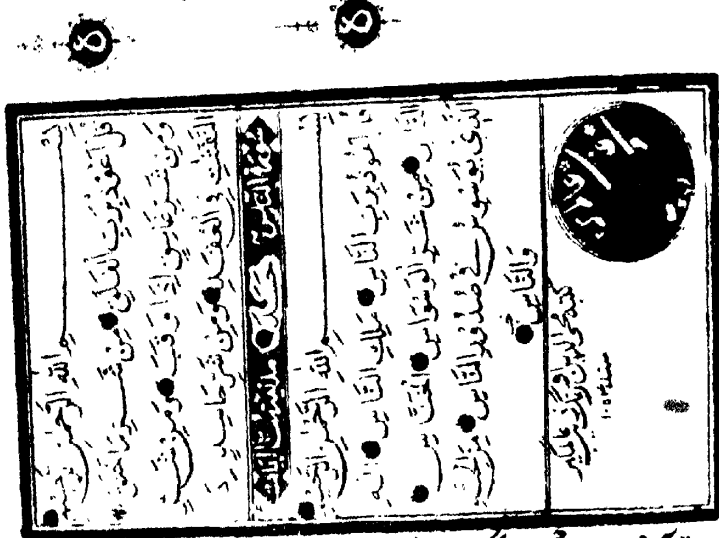
ہمارے قرآن مجید کا حجم قریباً نو سو صفحے ہیں نہایت خوبصورت سنہری جلد بندھی ہوئی

ہدیہ پانچ روپے۔ علاوہ محصول

شاہ غازی اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید نواب صاحب مانگرول کے کتب خانہ میں موجود ہے
وہاں سے حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے اسے مستعار لیکر اور بلاک بنوا کر چھپوایا
بہت بڑی اسلامی اور تاریخی یادگار ہے۔ ہر مسلمان کے گھر میں یہ قرآن شریف ضرور رہنا چاہیے
آخری صفحہ پر شہنشاہ اورنگ زیب کے دستخط اور مہر اور سنہ کتابت بھی موجود ہیں

ملنے کا پتہ: مینیجر رسالہ نظام المشائخ۔ کوچہ چیلان۔ دہلی

مؤلفہ

ادیب بے بہتا مولانا مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ لکھنوی مرحوم

اس کتاب میں مولانا نے شرعی پردہ کی نسبت مضامین نہایت مدلل قرآن و حدیث و فقہ کے احکام کے موافق لکھے ہیں اور جو عورتوں کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں اُن کو دلانیکی نہایت پُرزور کوشش کی ہے ۔ قیمت عہ

المشتہر

حافظ ابوالحسن سیادت بکڈپو چھتہ لال میاں دہلی

آیاتِ وجدانی

اب پہلا اردو زبان کی واجب الاحترام فلسفیانہ شاعری کا بہترین نمونہ غالب کا دیوان سمجھا جاتا تھا مگر اب میرزا یگانہ لکھنوی کی آیات وجدانی نے اس عقیدہ کو باطل کر دیا مصنف کی اس گراں قدر تصنیف میں جذبات لطیف انسانی کے گوناگوں مرقعے حکیمانہ ذوق نظر قوت ابداعی و اختراعی اور شاعرانہ آرٹ کے وہ مکمل نمونے پیش کئے ہیں جن کے سامنے متقدمین کا کمال لفظ بے اصل ثابت ہوتا ہے فلسفیانہ اور وجدانی شاعری کی ارتقا کا بہترین مظہر آیات وجدانی ہے قیمت عہ

میرزا صاحب کی ایک مشہور تصنیف ہے فن عروض و قوافی میں

چراغِ سخن ایسا جامع و مستند رسالہ اردو زبان میں اب تک موجود نہیں ہے جن لوگوں کو شعر و سخن کا ذوق ہے انہیں اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

قیمت عہ علاوہ محصول ملنے کا پتہ میرزا یگانہ لکھنوی عثمان آباد دکن

سالانہ رعایتی اعلان

کوئی چیز منگواؤ ایک روپیہ آٹھ میں گھر بیٹھے چیز کا پارسل مل جائیگا

۱۔ بجلی کا جیبی لیمپ ۔ یہ بجلی کا لیمپ معہ بیٹری اور بلب روانہ ہوگا۔ جس وقت جی چاہے روشنی کر لو یا بجھا دو بڑی کارآمد چیز ہے۔

۲۔ بغیر کنجی والے تالے ۔ یہ تالہ بغیر کنجی کے کھولا جاتا ہے یہ وہی کھول سکتا ہے جو اس کے متعلق پوشیدہ حالات جانتا ہے۔ دوسرا نہیں۔

۳۔ چار عدد طلسمی سانپ کی ڈبیہ ۔ اس ڈبیہ میں سے ذرا سا ٹکڑا الگ کر دیا سلائی لگا دیجئے۔ فوراً ہی کوڑیا سانپ کنڈلی مارے ہوئے

۴۔ لڑکا ہوگا یا لڑکی ۔ یہ آلہ حاملہ عورت کے پیٹ پر رکھنے سے فوراً بتا دے گا۔ کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ بڑی کارآمد چیز ہے۔

۵۔ آگ جلانے کی مشین ۔ جب اس مشین کو پتھر پر رگڑو گے تو آگ پیدا ہو کر روشنی ہو جائے گی۔

۶۔ سگرٹ بنانے کی مشین ۔ یہ جس قدر چھوٹی ہے۔ اتنی ہی حیرت انگیز اور مفید ہے۔ ہر شخص گھر بیٹھے بٹھائے آسانی سے سگرٹ بنا

سکتا ہے ترکیب استعمال ہمراہ ارسال ہوگی۔

۷۔ سیفٹی ریزر معہ ایک درجن بلیڈ ۔ حجام کی ضرورت نہیں۔ خود بخود چہرہ کی حجامت بنالو۔ یہ جلد کو ہرگز نہیں کاٹتا۔ ایک عدد ضرور منگوا لیجیے۔

۸۔ وزن کرنیوالا طلسمی کانٹا ۔ اب ترازو باٹوں کے رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ نو ایجاد کانٹا نمبروں کے ذریعہ ٹھیک وزن بتا دے گا۔

۹۔ ناخن کاٹنے کی مشین ۔ اس کے ذریعہ ہاتھوں، پاؤں کے ناخن بلا کسی تکلیف واندیشے کے خود بخود کاٹ سکتا ہے۔

۱۰۔ جیبی چھاپہ خانہ ۔ یہ چھاپہ خانہ قابل تعریف ہے اس سے لفافے اور ملاقاتی کارڈ اور مہریں وغیرہ جو دل چاہے چھاپ لیں۔ اس کا ہر گھر

میں ہونا ضروری ہے۔

۱۱۔ مہ جبین حسینوں کے دلفریب فوٹو ۔ جس میں حسن اور عشق اور محبت کے جانفزا نظارے نہایت خوش اسلوبی سے دکھائے گئے ہیں

مختلف اقسام کے ایک درجن روانہ ہونگے۔

۱۲۔ لوٹ کا سفری گلاس ۔ مسافری میں یہ سفری گلاس بڑی بھاری خدمت دیتا ہے۔ جب دل چاہے کھول کر پانی پی لیں اور بند

کر دیں کی شکل میں جیب میں رکھ لیں یہ بیٹھے والی چیز میں کام آسکتا ہے۔

۱۳۔ اشٹ دھات کی انگوٹھی ۔ مختلف امراض اور چھوت کی بیماریاں کافور ہو جاتی ہیں اگر اسے انگلی میں پہن لیا جائے تو کوئی بیماری پاس نہیں

۱۴۔ کشیدہ کاڑھنے کی مشین ۔ یہ مشین ہی ہے جسکے ذریعے کپڑوں پر بیل بوٹے۔ ٹوپیاں، تکیہ، آسن وغیرہ اور دیگر کارآمد چیزیں بنائی جاتی ہیں

قیمت پر معہ محصول ڈاک ہرگز کہیں سے نہ ملے گی۔

۱۵۔ دودھ ماپنے کا آلہ ۔ اگر آپ اصل دودھ کے بدلے پانی والا دودھ پیتے ہیں اور گوالا یا حلوائی آپ کو دھوکا دیتا ہے تو آپ اس کو

اپنے پاس رکھیں دودھ میں ڈالنے سے فوراً بتائے گا کہ اس میں کس قدر پانی ہے ایک عدد خود منگوا کر آزمائش کریں

نوٹ ۔ حضرات اوپر لکھی ہوئی چیزوں کی قیمت کسی حالت میں دو روپیہ تین روپیہ چار روپیہ سے کم نہیں ہے مگر ہم عہ معہ محصول ڈاک

میں دے رہے ہیں۔ آرڈر جلد دیں۔ ورنہ سٹاک ختم ہو جائے گا۔

نوٹ ۔ جو صاحب اوپر لکھی چیزوں کو ایک دم خرید فرما سکتے ہیں ان سے ۲۰ روپیہ معہ محصول ڈاک چارج کئے جاویں گے مگر آرڈر

میں پانچ روپیہ پیشگی ضرور آنے چاہئیں۔

دی امپیریل ناولٹی مارٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۷ لاہور (پنجاب)

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے +

۲۔ علمی و ادبی تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیار ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں +

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے +

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے +

۵۔ خلاف تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے +

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے +

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا +

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے +

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر +

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے +

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے +

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

منشی علم الدین مینیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بیادگارِ علامۂ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر
حامد علی خاں۔ بی۔ اے
منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۴ — بابت ماہِ نومبر ۱۹۲۸ء — نمبر ۵

تصویر:- پروازِ الفت

جہاں نما

جاپان میں تحریکِ خواتین

اب تک جہاں جہاں خواتین کی تحریکیں بارآور ہوئی ہیں اُن میں سے جاپان کی مثال ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ینگ ایسٹ میں ایم میٹا نے خواتین کی اُن کامیابیوں کو گنایا ہے جو انہوں نے مختلف شعبوں میں حاصل کی ہیں:-

قانونی ۔خواتین ضابطۂ سندِ مختاری اور قانونِ فوجداری میں اس قسم کی ترمیم کرالینے میں پورے طور پر کامیاب ہوگئی ہیں جس کی رو سے آئندہ مختارِ عدالت کا عہدہ اُنہیں مل سکے گا۔ اور حفاظتِ عفت و عصمت جو اس سے قبل صرف عورتوں کے لئے ضروری تھی اب مردوں کے فرائض میں بھی داخل سمجھی جائے گی۔ اس ملک میں اگر عدالت کے سامنے اس قسم کا کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو صرف عورتوں کو مجرم گردانا جاتا تھا لیکن ڈائٹ کے گزشتہ اجلاس میں حکومت نے جو قانون منظور کیا ہے اُس کی رو سے مرد اور عورت دونوں کو جرم کی ایک جیسی سزا ملا کرے گی۔

سیاسی ۔خواتین ڈائٹ کی معرفت حکومت سے اپنی اُس عرضداشت کو منظور کرانے میں کامیاب ہوگئی ہیں جس کی رو سے مستقبلِ قریب میں انہیں شہریتِ عامہ کے حقوق حاصل ہو جائیں گے اور اُن کو ہر ایک سیاسی عضویت میں حصہ لینے کا حق حاصل ہوگا۔

معاشری ۔ٹوکیو سلن کمپنی نے کارکن لڑکیوں کی اس آزادی کو تسلیم کرلیا ہے کہ وہ جس وقت چاہیں کارخانہ سے باہر جا سکتی ہیں۔ اب تک وہ شرائطِ ملازمت کی پابندی میں ایک قیدی کی سی زندگی گزارتی رہی ہیں۔ عنقریب دوسرے دوسرے کارخانوں میں بھی اس مثال کی تقلید کی جائے گی۔ بڑی بڑی جہاز ران کمپنیوں نے محسوس کرلیا ہے کہ عورتوں میں بھی کپتان بننے کی قابلیت موجود ہے۔ چنانچہ اس ملک میں پہلی خاتون کپتان مس سوشی کو کاٹا پاما مقرر ہوئی ہیں۔

تعلیمی ۔خواتین کی تحریک سے آخر کار حکومت کو ترغیب ہوئی ہے کہ وہ عورتوں کی اعلیٰ صنعتی تعلیم کے لئے پینتیس ہزار ین کے صرف سے ایک مدرسہ قائم کرے۔

ڈاکٹر پرشینو اور بعض دوسرے تعلیمِ نسواں کے حامیوں نے غیر سرکاری طور پر خواتین کے لئے ایک کالج کھول رکھا ہے جس میں لڑکیاں مدارسِ فوقانیہ سے سند لینے کے بعد تین سال تک معاشیات کی تعلیم حاصل کیا کریں گی۔ اسی طرح خواتین

کے لئے ایک بڑا تجارتی مدرسہ قائم ہے اور اب حکام کو آمادہ کیا گیا ہے کہ وہ خواتین کو بھی فضیلت کی سندیں حاصل کرنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ فاتون پروفیسر کوزکویوسوئی کو فضیلتِ طبیعیات کی سند مل بھی گئی ہے۔

سیاسیات اور پتلونیں

یہ عجیب بات ہے کہ جب لوگوں کے عقائد تبدیل ہوتے ہیں تو وہ اس کا اظہار لباس کی تبدیلی سے کرتے ہیں اور یہ تبدیلی عموماً ٹانگوں کے پہناوے میں ہوتی ہے۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات یہ تبدیلی سر کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً اصلاحات کے سلسلہ میں مصطفٰے کمال نے پہلا قدم یہی اٹھایا کہ فیض پہننے کے متعلق امتناعی احکام جاری کئے اور ہر شخص کو ہیٹ پہننے پر مجبور کیا۔

لیکن عقائد کی علامت کے طور پر پاجاموں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ جارج فاکس نے "انجمن الاخوان کی بنا ڈالی تو اُس نے اپنے لئے چمڑے کی برجیس بنوائی۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ اُس نے دنیا اور اُس کی نمود و نمائش سے قطعِ تعلق کر لیا ہے۔ اسی طرح جب نیومین نے ظاہر کرنا چاہا کہ اُس نے مقررہ مذہبِ انگلستان سے رشتہ توڑ کر کیتھولک مذہب سے جوڑ لیا ہے تو اُس نے پہلی دفعہ اس کا اظہار یوں کیا کہ دعوت میں ہلکے نیلے رنگ کی پتلون پہن کر آیا۔

انقلابِ فرانس بجائے خود ایک پتلونوں کا معاملہ تھا۔ اگر کوئی گھٹنوں والی برجیس پہنے نظر آتا تھا تو اُسے امرا میں سے سمجھ کر قتل کر دیتے تھے۔ اور اگر پیوست پاجامہ پہنے ہوتا تھا تو اُس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔

روس میں آج کل یہ تحریک زوروں پر ہے کہ کوئی قوم پرست سفید پتلون نہ پہنے ٹینس کھیلنے کے لئے عموماً سفید پتلون پہنی جاتی ہے، لیکن بالشویکوں کا خیال ہے کہ اس کے لئے صرف بنیان کافی ہے۔

موت و حیات کی جنگ

پروفیسر فیوڈور انڈریف جو ملکِ روس میں علم الحیات کے بڑے ماہر ہیں کہتے ہیں کہ صرف بڑھاپے کی موت طبعی کہی جا سکتی ہے اور کسی خاص مرض سے موت کا واقع ہو جانا غیر طبعی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ایسی صورتوں میں کلی موت واقع نہیں ہوتی۔ گو دل اور اعضائے تنفس اپنے وظائفِ حیات سے رک جاتے ہیں لیکن باقی جسم میں بعض مقامات ہفتوں زندگی موجود رہتی ہے۔

پروفیسر موصوف کا عقیدہ ہے کہ موت جسم پر آہستہ آہستہ وارد ہوتی ہے اور جب جان نکل جاتی ہے تو بہت دنوں تک جسم زندہ رہتا ہے۔ دل کی حرکت اس لئے رک جاتی ہے کہ وہ زہروں سے آلودہ یا محصور ہو جاتا ہے اور اگر اسے صاف کر دیا جائے تو دوبارہ اُس سے کام لیا جا سکتا ہے۔

انہوں نے انسانوں اور حیوانوں کی نعشوں پر تجربات کئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے کئی ایک کتوں کو جن کا تنفس بند ہو چکا تھا اور جن کا دل ٹھہر چکا تھا اپنی دواؤں کے استعمال سے زندہ کر دیا ہے اور پھر وہ سالہا سال تک زندہ رہے ہیں۔

یہ تجربات امید دلاتے ہیں کہ ہم کسی وقت موت کے ساتھ کامیاب جنگ کر سکیں گے۔

بیر کی بجائے دود

ریاست ہائے متحدہ کی حکومت کے شعبۂ زراعت نے اندازہ لگایا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں سالِ ماسبق کی نسبت چار ہزار ملین پونڈ زیادہ دودھ صرف ہؤا ہے جب سے امریکا میں شراب نوشی کو ناجائز قرار دیا گیا ہے دودھ کی کھپت بے انتہا بڑھ گئی ہے۔

گوالے اور شیر فروش شراب کی ممانعت سے بڑے خوش ہیں جو روپیہ پہلے بیر پر خرچ کیا جاتا تھا اب دودھ پر خرچ ہو رہا ہے۔ اور جو روپیہ پہلے شرابی والدین پیدا کرتا تھا اب صحت ور بچے پیدا کر رہا ہے۔

جمہوریہ کے وہ باشندے جو مدتِ دراز تک وطن سے باہر رہنے کے بعد واپس آتے ہیں امریکن زندگی کی یہ خصوصیت دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ گھروں، ہوٹلوں اور کلبوں کے اندر بہت بڑی مقدار میں دودھ صرف ہو رہا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے شاذونادر ہی کوئی نوجوان دودھ پیتا دیکھا جاتا تھا لیکن اب مرد و عورت کثرت سے دودھ استعمال کرتے ہیں۔

بربط نواز چیونٹیاں

اُن تمام جوہروں کے علاوہ جن کے لئے چیونٹی حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے مشہور رہی ہے اس میں موسیقی دانی کا بھی ایک جوہر موجود ہے جس کا انکشاف آج کل کے زمانے میں ہؤا ہے۔ چیونٹیوں کی بعض اقسام ایسی بھی ہیں جو ایک شور انگیز ساز رکھتی ہیں یہ شکم کے اوپر ایک ذرا سا ابھرا ہؤا بربط ہوتا ہے اور قریب ہی مضراب بھی واقع ہوتا ہے۔ جب یہ مضراب بربط سے رگڑ کھاتا ہے تو ایک نہایت ہلکا اور لطیف راگ اس میں سے پیدا ہوتا ہے

اس حقیقت کا انکشاف ڈاکٹر رابرٹ سٹیگر نے کیا ہے جنہوں نے ایک کوہستانی سفر کے دوران میں بڑی بڑی سرخ چیونٹیوں کا ایک گھونسلا دیکھا جس میں سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔

کوہِ نور کی سرگزشت

ایک انگریزی سینما کمپنی کوہِ نور ہیرے کی دلچسپ سرگزشت کی فلم بنا رہی ہے۔ کہانی تاریخی حقائق پر مبنی ہوگی، جسے سر ای ڈینیزن راس لکھیں گے۔ ملکہ معظمہ نے جو اس کی تیاری میں دلچسپی سے حصہ لے رہی ہیں اُن خاص کاغذات میں سے معلومات بہم پہنچائی ہیں جو اُن کے قبضہ میں تھے۔ کوہِ نور جو دنیا کا چھٹا بزرگ ترین ہیرا ہے سنہ ۱۸۵۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ کمپنی کے ہاتھ یہ راجہ رنجیت سنگھ کی وفات اور پنجاب کے الحاق کے وقت آیا۔ اُس وقت اس کا وزن ½۱۸۶ قراط تھا لیکن امسٹرڈم کے صناعوں نے اُسے ایسی بے شعوری سے تراشا کہ اب اُس کا وزن صرف ½۱۰۶ قراط رہ گیا ہے۔

روایت تو اس کی قدامت کے بہتیرے افسانے سناتی ہے لیکن اس کی معلومہ تاریخ بھی کچھ کم ہیجان آور نہیں ہے۔ سنہ ۱۳۰۴ء میں یہ شہنشاہِ دہلی علاء الدین کے قبضہ میں تھا اور اُس کے دو صدی بعد خاندانِ مغلیہ کے بانی ہمایوں کو ملا۔ وہ غالباً یہی ہیرا تھا جسے اورنگ زیب نے تختِ طاؤس میں آنکھ کے طور پر نصب کر رکھا تھا۔ گو بعض محققین کے نزدیک تختِ طاؤس والا ہیرا "مغلِ اعظم" تھا جو گولکنڈہ کی کانوں سے دستیاب ہوا اور کوہِ نور جس کا ایک ٹکڑا ہے۔ سنہ ۱۷۳۹ء میں کوہِ نور ایرانی فاتح نادر شاہ کے ہاتھوں میں آیا اور اُس کے ورثا سے راجہ رنجیت سنگھ کو ملا۔

سرمایۂ مشترک

مجھے افسوس ہے کہ ہمایوں کے آخری گذشتہ پرچے میں اس عنوان کے تحت میں اہلِ دہلی کے متعلق بعض ایسی پھبتیاں کی گئیں جن سے ہمارے چند دہلوی دوستوں کو بجا طور پر رنج ہوا۔ ہمایوں ہمیشہ ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہتا ہے جن سے ذاتیات کی بو آئے یا جن میں بے جا طعنہ آمیزی کا رنگ غالب ہو۔ اس مضمون کی بعض باتوں کو ایک اور ایسے طریقے میں ادا کیا جا سکتا تھا جن سے اوروں کی دل آزاری نہ ہوتی۔

بل

نواہائے راز

مَیں نغمہ سراسر بہ سراے یار ہوں تیرا
وارفتہ ہوں، دیوانہ ہوں، بیمار ہوں تیرا

جیسا بھی ہوں مَیں، خوش ہوں کہ نسبت تو ہے تجھ سے
اے دوست! جو تو گل ہے تو میں خار ہوں تیرا

سو پردہ میں تُو، اور میں ہر پردہ سے باہر
تُو سر بہ سر انکار، میں اقرار ہوں تیرا

"کُن" شرح سے بیگانہ تھا، مَیں شرح ہوں کُن کی
تُو معنیٔ مستور، میں اظہار ہوں تیرا

وارستہ پرستش سے کہیں حُسن نہ دیکھا
ڈھونڈا مجھے تُو نے کہ پرستار ہوں تیرا

گھبرا گیا تُو بھی تنِ تنہا دو سرا میں
دمساز ہوں، ہمراز ہوں، غمخوار ہوں تیرا

آتی ہے ترے دل کی صدا میرے لبوں سے
میں پردہ میں گویا لبِ گفتار ہوں تیرا

میرے لئے تُو سر بہ گریباں ہے ازل سے
جو حل نہ ہو، وہ عقدۂ دشوار ہوں تیرا

زندانِ دو عالم سے کہاں بھاگ کے جاؤں
دے مجھ کو رہائی کہ گرفتار ہوں تیرا

اس دل سے کبھی نقشِ وفا مٹ نہیں سکتا
سو بار مٹا مجھ کو، مَیں سو بار ہوں تیرا

حامد علی خاں

مبادیٔ سیاسیات

باب ۶

قانون - حقوق - آزادی

۱۔ قانون

پچھلے باب میں دکھایا جا چکا ہے کہ مملکت کا قیام و استحکام اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کوئی ایسی شخصیت موجود نہ ہو جو نہ صرف افراد کے باہمی منافشات کو طے کرنے اور اپنے احکام کا نفاذ بشرطِ ضرورت بالجبر کرانے کی اہل ہو بلکہ جو اُس تضاد و تخالف کو بھی دور کر سکتی ہو جو باشندگانِ ملک کے انفرادی احساسات و جذبات اور ملک کی اجتماعی ضروریات کے مابین پیدا ہو جائے۔ وہ شخصیت سیاسی اصطلاح میں مقتدرِ اعلیٰ کہلاتی ہے، اور جس آلۂ کار کے ذریعے سے وہ اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتی ہے اُسے "ہیئتِ حاکمیہ" کا لقب دیا جاتا ہے۔ اس ہیئتِ حاکمیہ سے کوئی ایک شخص مراد نہیں۔ بلکہ وہ جملہ ایسے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو از روئے دستور اس مملکت کے سیاسی امور میں تا حدِ اختیار مصروف ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مرکب جماعت میں کوئی نہ کوئی ایسا مرکز ضرور ہوگا جس کے احکام اٹل اور جس کی تجاویز ناقابلِ تردید ہونگی، اس لئے کہ اگر یہ جماعت مختلف المراکز ہوگی تو یقین ہے کہ بہت جلد اِس کا شیرازہ بکھر جائے گا اور مملکت منتشر ہو جائے گی۔ اسی مرکز کے احکام کو قانون کہیں گے۔ اور اگر غور کیا جائے تو اسی پر جماعتِ مملکت کا کلیتہً دار و مدار ہے۔

اثباتی قوانین کے امتیازات

سب سے پہلا مسئلہ جس پر غور کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آخر قانون کسے کہتے ہیں۔ آج کل دو تین اصول ایسے زبان زدِ خاص و عام ہیں جن سے قانون کا التباس نہ صرف ممکن ہے بلکہ اگر نظرِ غائر نہ ڈالی جائے تو اغلب ہے۔ ہم روزمرہ ایسے الفاظ جیسے "قانونِ فطرت" "قانونِ الٰہیہ"، "قانونِ بین الاقوامی" "فوجی قانون"، "قانونِ معاہدہ"، "قانونِ تعزیری" سنتے ہیں، اور جب ہم اُن پر ذرا بھی نظرِ غائر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان سب "قوانین" کے مابین اصولی فرق نظر آتا ہے، اور اصلی اور واقعی اثباتی "قانون" جس سے مملکت کی شیرازہ بندی ہوتی ہے اور دوسرے "قوانین" کے مابین امتیاز کرنے کی

ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے اگر اس اثباتی قانون کو پیشِ نظر رکھا جائے تو روزمرہ کی اصطلاح میں اس
میں اور انصاف میں بہت ہی کم فرق معلوم ہوگا، تاآنکہ اس محکمۂ مملکت کو بھی جس میں اس "قانون" کا نفاذ ہوتا
ہے "عدالت" کا لقب دیا جاتا ہے۔ بدیں سبب اس کی ضرورت ہے کہ قانون کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کر
لیا جائے۔

سب سے پہلے تو اثباتی قوانین کا اس قسم کے قوانین سے جیسے قوانینِ فطرت، قوانینِ الٰہیہ، قوانینِ بین
الاقوامی، وغیرہ سے امتیاز کرنا چاہئے۔ اثباتی قوانین دراصل اُن ملکی یا قومی قوانین کا نام ہے۔ جن کا مقتدرِ اعلیٰ
نے ہیئتِ حاکمیہ کے کسی جزوِ مجاز کے ذریعہ سے نفاذ کیا ہو، اور جس سے روگردانی کے بعد روگردان کو یا تو سزا کا
مستوجب سمجھا جائے ورنہ اُسے کسی قسم کی تکلیف یا دقت کا سامنا کرنا پڑے[۵]۔ اب یہ کیفیت "قوانینِ فطرت" کی نہیں
ہے۔ قوانینِ فطرت اُن مفروضہ قوانین کا نام ہے جنہیں تمام بنی نوعِ انسان پر حاوی سمجھا جاتا ہے۔ اور جن سے بنی آدم
کے باہمی تعلقات کا تعین ہوتا ہے۔ "قوانینِ الٰہیہ" قوانینِ فطرت سے زیادہ متعین ہوتے ہیں، چنانچہ بہت سے ممالک
میں یہ اثباتی قوانین کے منابع و ماخذ بھی بن جاتے ہیں۔ "قوانینِ بین الاقوامی" اُن اصول کا مجموعہ ہیں جن پر مختلف
ممالک کے باہمی تعلقات (عہدنامجات) مبنی سمجھے جاتے ہیں۔ جب تک یہ قوانین کسی ملک کے اثباتی قوانین کی شکل اختیار
نہ کریں اُس وقت تک انہیں صحیح معنے میں قوانین کہنا مناسب نہیں، اور ان کی خلاف ورزی پر ملزم کو عام طور پر
کوئی ایسی قانونی سزا نہیں دی جاتی جس سے اُسے کسی خاص قسم کی تکلیف پہنچے۔ اسی طرح اثباتی قوانین کو ماتحت قاعدہ
ساز ادارات مثلاً مجلسِ بلدیہ یا مجلس ریلوے کے قواعد سے بھی ممیز کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ موخر الذکر قواعد محض کسی نہ
کسی اثباتی قانون کے تحت عدم سے وجود میں آئے ہیں، اور ایک دوسرا اثباتی قانون انہیں یک قلم کالعدم
کر سکتا ہے۔

اسی طرح عام طور پر قانون اور انصاف کو ہم معنی قرار دیا جاتا ہے اور دونوں کو اخلاق پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ
لازمی نہیں کہ جو قانونِ مروجہ ہو وہ بالکلیہ تمام تر انصاف پر مبنی ہو۔ مثال کے طور پر اگر زید نے کچھ رقم عمر سے قرض
لی اور اُس کے دعوے میں تمادی عارض ہوگئی تو ایسی صورت میں انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ زید عمر کو وہ رقم واپس دے
دے، لیکن عمر کسی قانونی چارہ جوئی کا مستحق نہیں سمجھا جائیگا۔ دراصل انصاف کی بنا اخلاق پر ہے، اور جیسا انگلستان کا ایک
نامی آور عادل لارڈ کولرج اپنی ایک تجویز میں کہتا ہے۔ "گو قانون اور اخلاق ایک دوسرے کے مترادف نہ ہوں اور بہت سے

---

۵ لینڈلے: "اصولِ قانون" باب ۲

ایسے افعال بد سمجھے جائیں جو بالالتزام خلاف قانون نہیں ہوتے تاہم اگر اخلاق کو قانون سے کلیتہً علیحدہ سمجھا جائیگا تو اُس کے نتائج نہایت ہی برے نکلیں گے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص بحیثیت ایک شوہر یا باپ یا بھائی یا استاد کے مکمل اخلاقی معیار پر پورا نہ اُتر سکے لیکن ساتھ ہی اس سے کسی قسم کا خلاف قانون عمل سرزد نہ ہوا ہو اور وہ قانون کی زد میں نہ آتا ہو محض اخلاقی اصول کی ترویج میں یہ کمزوری رہ جاتی ہے کہ اُس کی خلاف ورزی سے کوئی لازمی نقصان مرتکب فعلِ شنیعہ کو نہیں پہنچتا، بلکہ بعض مرتبہ تو اسے بظاہر مادی فائدہ ہی حاصل ہوتا ہے درآنحالیکہ خلاف ورزیٔ قانون کی صورت میں جملہ وسائلِ مملکت اُس کے خلاف استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اگر اخلاقِ مروجہ اور قانونِ جاریہ کے اصول ایک دوسرے سے منطبق ہو سکیں تو یہ مملکت کے لئے بہترین صورتِ حال ہوگی۔

"**قانون ساز**"۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قانون مملکت کے اُن احکام کو کہتے ہیں جن کا ماننا ہر فردِ مملکت کا فرضِ عین ہے۔ اور اس سے روگردانی کی حالت میں مملکت اپنی قوت وجبروت روگرداں کی سزا اور بدامنی کے دفعیہ میں صرف کر دیتی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مملکت میں کوئی نہ کوئی ایسا شعبہ ضرور ہوگا جس کے سپرد قانون سازی کا فرض ہوگا۔ یعنی جسے یہ اختیار ہوگا کہ ملک کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر ایسے قواعد بنائے جن کے ذریعہ سے بدامنی نہ ہونے پائے اور افرادِ مملکت کے مابین تعلقاتِ دادوستد بے کھٹکے قائم رہ سکیں۔ ساتھ ہی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر مملکت میں، خواہ اس کی حکومت شخصی ہو یا جمہوری، پارلیمنٹری ہو یا صدارتی کوئی نہ کوئی قانون ساز شخصیت ضرور ہوتی ہے بعض مرتبہ یہ منصب شخصِ واحد، مثلاً آمرِ مطلق یا بادشاہ کے متعلق ہوتا ہے، جسے خاص طور پر قانون سازی کا اہم اختیار بوجہ اس کے علم یا ادراک یا موروثی اثر کے باعث دیا جاتا ہے۔ بعض مرتبہ اسے اہم ترین اختیار تصور کر کے ایک ایسی جماعتِ مقننہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے جس میں تقریباً ہر شعبۂ زندگی کے نمایندے ہوتے ہیں، تاکہ وہ موجودہ قوانین کی خامیوں کو سمجھ کر اور ملک کی، یا کسی خاص طبقے کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر قانون بنائے یا اس میں ترمیم کرے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قانون ساز شخص یا جماعت خواہ کتنی ہی فہیم ومدرک کیوں نہ ہو یہ ناممکن ہے کہ وہ تمام ایسے واقعات کے لئے قواعد بنا دے گی جو اس وقت تک پیش نہ آئے ہوں۔ مثلاً جس شخص یا جماعت کے سپرد قانون سازی ہو وہ چوری کی سزا مقرر کر سکتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ آیندہ جتنی طرح سے چوری کی جائے گی وہ سب اُن مقننوں کے پیشِ نظر ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون ساز شخص یا جماعت کسی جرم کی قطعی سزا مقرر نہیں کرتی بلکہ حاکم عدالت کو بہت بڑا اختیارِ تمیزی دے دیتی ہے کہ ایک حد کے اندر جتنی چاہے سزا دے۔ یہیں ایک اور امر ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ حقیقی قانون ساز یعنی ایسے احکام دینے والا جنہیں قانون کا رتبہ حاصل ہو، کوئی مافوق الفطرت ہستی ہو اور دنیوی حکام کے

سپرد اُن احکام کا نفاذ اور اُن کی تاویل کرنے سے زیادہ اختیار نہ ہو۔ لیکن یہ اختیارِ تاویل یا اُن اصول کو موجودہ صورتِ حال پر منطبق کرنے کا اختیار اس قدر عظیم الشان ہے کہ اس پر ایک بہت بڑے نظامِ قانونی کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ تمثیلاً جن ممالک میں شرعِ اسلامی کا رواج ہوا اُن کے قوانین کا دارومدار قرآن مجید اور احادیثِ نبوی پر تھا لیکن ساتھ ہی ضروریاتِ زمانہ کے اعتبار سے بڑے بڑے علما و ائمہ نے جو اُس کی تاویلیں کیں اور صورتِ حال کو مدنظر رکھ کر جو فتاوے شائع کئے اُن سے وہ عظیم الشان نظامِ قانونی نکلا جسے فی الجملہ شرعِ اسلامی کا لقب دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ممالک میں جہاں کسی قسم کا الوہی قانون رائج ہو اور جہاں کا حاکم اُس کا پابند ہو، وہاں دو طرح کے حکام ملیں گے۔ ایک وہ جو ضروریاتِ زمانہ کے اعتبار سے خود اُس کی توسیع کریں یا علما و ائمۂ وقت سے کرائیں، دوسرے حکامِ عدالت جو اِن توسیع شدہ قوانین کو واقعاتِ حالیہ پر منطبق کریں اور حسبِ حال وقتی احکام شائع کریں۔

قانون اور عادل ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون کو کونسی شکل کا تعلق حقیقتاً افرادِ مملکت سے ہے اور وہ کون سے احکام ہیں جو دراصل مملکت کو انتشار و افتراق سے روکتے ہیں۔ بلاشبہ وہ اصول جو احکامِ الٰہیہ میں منضبط ہوں یا وہ قواعد جو قانون ساز نے منظور کئے ہوں، بہت اہم ہوتے ہیں۔ اور انہیں پر ملکی قوانین کا دارومدار ہوتا ہے لیکن جیسا اوپر کہا جاچکا ہے، تاوقتیکہ مقدمہ کی واقعی نوعیت نہ معلوم ہو، فریقِ ثانی پر کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا جب جان آسٹن یہ کہتا ہے کہ قانون مقتدرِ اعلیٰ کے حکم کا نام ہے[1] تو وہ فوراً اپنی کمزوری محسوس کرلیتا ہے اور معاً یہ بھی کہتا ہے کہ جس امر کی مقتدرِ اعلیٰ اجازت دے وہی بمنزلہ اُس کے حکم کے ہے[2] اور ظاہر ہے کہ یہ اجازت ظاہری بھی ہوسکتی ہے اور معنوی بھی۔ اس سے یہ صاف پایا جاتا ہے کہ خود آسٹن کو اپنی تعریف کی کمزوری کا علم تھا، وہ جانتا تھا کہ جماعتِ مقننہ یا شخصِ قانون ساز کے بنائے ہوئے قواعد دراصل ملکی قوانین کا محض عشرِ عشیر ہیں اور بہت سے ایسے معاملات زیرِ بحث آسکتے ہیں (اور درحقیقت روزمرہ آتے ہیں) جن کا حل اُن قواعد و قوانین سے ہونا نہایت دشوار ہے چنانچہ اس کے لئے آزادانہ تاویل کے ذریعہ سے موجودہ قوانین میں ایک بڑی حد تک توسیع و اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اِس قسم کی تاویلات کو محض "اجازت" کا لقب دینا اِس لفظ کو محض خود ساختہ اور غلط معنے پہنانا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب مقدمہ عدالت کے سامنے جاتا ہے تو عادل پہلے یہ دیکھ لیتا ہے کہ آیا معاملہ زیرِ بحث پر موجودہ قوانین کا نفاذ ممکن ہے یا نہیں؛ اگر یہ ممکن ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کے مطابق اپنی تجویز دے دیتا ہے۔ اور (جیسا کہ بیشتر معاملات

---

[1] آسٹن: اسباقِ اصولِ قانون Austin; Lectures on Jurisprudence جلد ا درس ۶

[2] ایضاً

میں جزواً اور بعض میں کلاً پیش آتا ہے (موجودہ قوانین میں سے کسی کا کلیتہً انطباق ممکن نہیں تو وہ فی الفور اس معاملے کو طے کرنے کی غرض سے اپنے فہم و ادراک اور اپنی قوتِ تخیل کو کام میں لاکر اور جدید قواعد وضع کرکے اس کے مطابق تصفیہ کر دیتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جو جدید قواعد یہ عادل بنائے گا وہ اصولاً موجودہ قوانین کے منافی نہیں ہونگے۔ لیکن اُس کی دماغی کیفیات بجنسہٖ اسی قسم کی ہونگی جیسی کسی نام نہاد "قانون ساز" شخص یا جماعت کی جب وہ چند خاص ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر قواعد بنائے۔ دونوں صورتوں میں جملہ عناصر کم و بیش یکساں ہی ہیں! دونوں کے سامنے ایک یا چند مسائل ہوتے ہیں جن پر موجودہ قانون کا انطباق نہیں ہوتا، دونوں ان مسئلوں کا حل چاہتے ہیں۔ دونوں ضروریاتِ ملک اور معاملۂ زیرِ بحث کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اور دونوں ایسے قواعد وضع کرتے ہیں جنہیں وہ اُس کے حل کے لئے مناسب سمجھتے ہیں۔ عادل نام نہاد مقنن سے ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور خود ہی امرِ زیرِ بحث کا تصفیہ بھی کر دیتا ہے۔

اس اصول کی مزید تفہیم کے لئے ایک مثال دینا ضروری ہے۔ فرض کیجئے زید نے اپنی اراضی میں ایک بڑا تالاب بنا کر اُس میں پانی بھرا اور حتی الامکان اُس کی مضبوطی و حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن مشیتِ ایزدی میں کسی کو چارہ نہیں، چنانچہ آفتِ ارضی و سماوی کی وجہ سے اس تالاب کا پشتہ پھٹ گیا۔ اور پانی کے زور سے عمر کی اراضی کو، جو اُس کے دامن میں واقع تھی، سخت نقصان پہنچا۔ اب ایسے معاملے کے تصفیہ کے لئے عادل کیا کرے گا؟ زید نے حتی الامکان اپنے پشتے کی حفاظت کی اور کسی قسم کی غفلت نہیں برتی، ساتھ ہی یہ بھی مسلمہ ہے کہ زید کا پشتہ ٹوٹنے سے عمر کا بہت کچھ نقصان ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاملے کے تصفیہ کے واسطے کسی قانون ساز کا بنایا ہوا قانون ڈھونڈنا بالکل بے سود ہوگا، اور اس کے لئے عادل کو اپنا اختیارِ تمیزی کام میں لانا پڑے گا۔ گویا کہ ایک جدید قانون وضع کرنا پڑے گا جو معاملۂ زیرِ بحث پر منطبق ہو سکے، اور خود ہی اُس کے مطابق تصفیہ کرنا پڑے گا۔ بجنسہٖ اسی قسم کا مقدمہ ممالکِ متحدۂ امریکا کی دو ریاستوں کی عدالتوں میں پیش ہوا، اور جو امر بظاہر محیر العقل ہے وہ یہ ہے کہ دونوں میں ایک دوسرے کے مخالف تصفیہ ہوا۔ یعنی ایک ریاست کی عدالت العالیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ عمر زید سے ہرجہ وصول کر سکتا ہے۔ لیکن دوسری ریاست میں اس کے برعکس یہ طے ہوا کہ چونکہ زید کسی قسم کی غفلت کا مرتکب نہیں ہوا اس لئے اس سے ہرجہ وصول نہیں کیا جا سکتا[۵]

یہ تو ایسے معاملات تھے جن کا تصفیہ کسی مروجہ قانون کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا۔ اب ایسے معاملات کو لیجئے جن کے متعلق قوانینِ موجودہ میں اصول تو مدون کئے گئے ہیں لیکن چونکہ قانون سازی کے وقت ہر امرِ مستقبلہ کی بابت

---

[۵] مقدمہ جات رائی لینڈز بنام فلیچر Rylands v Fletcher ۳ دارالامرا صفحہ ۳۳۰ و لسن بنام نیو بیڈفرڈ (بقیہ بر صفحہ ۸۰۴)

پیش بینی کرنا ناممکن ہے اس وجہ سے قطعی فیصلے کے لئے حاکمِ عدالت کو اپنا اختیارِ تمیزی کام میں لانا پڑتا ہے۔ جہاں تک تعزیرات کا تعلق ہے عام طور پر قانون ساز محض زائد از زائد سزا کا تعین کرتا ہے، اور عدم سزا اور اس سزائے منفیہ کے مابین جو فرق ہے اُسے بالکلیہ اختیارِ عدالت پر چھوڑ دیتا ہے۔ فرض کیجیے کسی شخص نے چوری کے ارادے سے زید کے گھر کا قفل توڑا، اور بھرا ہوا پستول ہاتھ میں لے کر زید کے پلنگ کے سرے تک گیا اور اُس کو مارنے کی دھمکی دی تاآنکہ زید نے اپنے صندوق کی کنجیاں اُس کے حوالے کر دیں، اور وہ مالِ مسروقہ لے کر جا رہا تھا کہ راستے میں گرفتار ہو گیا۔ اسے عدالت شاید اس شخص سے زیادہ سزا کا مستحق سمجھے گی جس کے گھر میں سے مالِ مسروقہ تو برآمد ہوا ہے لیکن جس کے خلاف چوری کرنے کا کوئی قطعی ثبوت نہیں۔

حقیقی اثباتی قوانین پسِ پردہ ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں عدالت کے اختیاراتِ تمیزی کی نوعیت کیا ہو گی؟ یہ بالکل درست ہے کہ پچھلی مثال میں قانونی اصول پہلے سے موجود تھا، لیکن یہ عمل ناقابلِ انکار ہے کہ اس سے کم از کم ان لوگوں کو مطلق کوئی مدد نہیں ملی جن کے واسطے وہ وضع کیا گیا تھا۔ اس میں ذرا بھی کلام کی گنجائش نہیں کہ جس وقت چور چوری کرتا ہے یا کوئی فریقِ معاہدہ معاہدے کو فسخ کرتا ہے اُس وقت اُسے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ جب اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا جائے گا تو حاکمِ عدالت کیا حکم دے گا۔ کسی خاص معاملے کے متعلق یہ کسی حالت میں پیش بندی نہیں کی جا سکتی کہ دراصل کونسی قانونی تجویز اُس کی بابت صادر کی جائے گی۔ گویا کہ اس معاملے کی نسبت حقیقی قانون پردۂ خفا میں ہوتا ہے۔ یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ باوجودیکہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے نہایت بدیہی ہے تاہم کوئی عدالت یا کوئی نام نہاد جماعتِ مقننہ اُسے ماننے کے لئے بظاہر تیار نہیں ہے کہ واقعی قانون سازی دراصل محکمۂ عدلیہ کرتا ہے نہ کہ جماعتِ مقننہ، اور موخر الذکر جماعت محض اصول طے کرنے پر اکتفا کرتی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک قدیم قانونی اصول کے بموجب ناواقفیتِ قانون کوئی عذرِ معقول نہیں[۵۷]۔ چنانچہ جب قانون دان دیکھتے ہیں کہ فی الواقع جماعتِ عدلیہ ہی حقیقی قانون کا انکشاف کرتی ہے اور ہم تجویزِ عدالت کے اعلان کے کسی خاص مسئلے کے متعلق واقعی قانون سے بالکل ناواقف رہتے ہیں، تو وہ عدالت کے اس زبردست منصب کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک فاضل مصنف اسی اصول کے متعلق کہتا ہے کہ قانون اُن قواعد کا نام ہے جنہیں عدالتیں تسلیم کر کے اُن پر عمل درآمد کریں[۵۸]۔ اسی اصول

بقیہ صفحہ ۴۰۳: Wilson v New Bedford ۱۰۸ ماچوسٹس صفحہ ۲۶۱؛ مارشل بنام ویل وڈ Marshall v. Welwood ۳۸ نیوجرزی صفحہ ۳۳۹

ان تمام مقدمات کا بیان گرے، قانون کی ماہیت اور اُس کے ماخذ Gray: The nature and sources of the law باب ۴ میں موجود ہے

۵۷ اصولِ قانون: Ignorantia legis neminem excusat سالمنڈ Salmond: Jurisprudence

پر اس مسلمہ قاعدے کا دارو مدار ہے کہ جب عدالت العالیہ کسی خاص مسئلے پر کوئی تجویز صادر کر دے تو پھر اس تجویز کو قانون کا رتبہ حاصل ہو جائے گا۔ اور آیندہ عدالت ہائے ماتحت اس پر عمل کریں گی۔ یہ اصول اس درجہ مسلم ہے کہ سلطنت برطانیہ اور ممالکِ متحدہ امریکا میں تو ان تجاویز کو آیندہ کے لئے نظیر کا رتبہ دیا جاتا ہے اور کسی عدالتِ ماتحت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس کے خلاف عمل کرے، لیکن اکثر دیگر ممالکِ متمدنہ میں ان تجاویز کے الفاظ کی اتنی پابندی نہیں کی جاتی بلکہ اُن کے اساسی اصول کی پابندی کافی سمجھی جاتی ہے۔[۵۸]

قانون کے مآخذ۔ اب یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ تا وقتیکہ کسی قاعدے پر عدالت کی گویا مہر نہ لگ جائے اس وقت تک اُسے پورے طور پر (جہاں تک امرِ متنازعہ فیہ کا تعلق ہے) قانون کا رتبہ حاصل نہیں ہوتا۔[۵۹] اب غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ وہ کس قسم کے قواعد ہوتے ہیں جو قانون کا اعلان کرنے کے وقت عدالتِ مجاز کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو اُن کی تعداد محدود ہے۔ اِن تجاویز کے سب سے پہلے تو وہ مآخذ ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی عدالت ہائے عالیہٗ مجاز کی تجاویزِ ماقبل۔ دوسرے وہ قواعد ہیں جن کے قانون ہونے کا اعلان ملکی دستورِ سیاسی کے مطابق جماعتِ مقننہ یا دوسری قانون ساز شخصیت نے کر دیا ہے، لیکن (چونکہ قانون ساز کی نظر دُوررس نہیں ہوتی کہ وہ تمام واقعاتِ آئندہ پر حاوی ہو سکے اس لئے) اسے مجبوراً بہت بڑا اختیارِ تمیزی محکمۂ عدلیہ کو دینا پڑتا ہے۔ اور جیسا بیان کیا جا چکا ہے، حقیقی قانونِ متعلقہ کا اُس وقت تک انکشاف نہیں ہوتا جب تک عدالت اپنی تجویز نہ دے دے۔[۶۰] یہ دو مآخذ تو گویا وہ ہیں جنہیں زیرِ نظر رکھنا دستورِ مملکت کے مطابق ہر عادل کا فرضِ عین ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض ایسے قواعد بھی ہیں جن کا عام طور پر دستورِ مملکت میں کہیں ذکر نہیں، لیکن ہر عادل انہیں بھی ملحوظ رکھنا اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے جتنا موضوعی قوانین یا نظائر کو، اور یہ مذہبی احکام، رسم و رواج، مستند ائمہ قانون کی کتابیں اور نصفت ہیں۔[۶۱]

تقریباً ہر ملک پر ایک دور ایسا گذرتا ہے جب وہاں کے قانون کا دار و مدار کلیتہً قانونِ الٰہیہ پر ہوتا ہے۔ خود یورپ میں بھی، جو آج کل دنیوی معاملات میں مذہبی قواعد کی دست اندازی سے اس قدر روگرداں نظر آتا ہے اس قسم کا عہد گزر چکا ہے۔ رومن عہد میں سیاسیات میں مذہب کا بہت بڑا دخل تھا۔ اور تاریخ روما کے ہر طالب علم کو اُس عظیم الشان اثر کا علم ہے جو وہاں کے "آگرون" یعنی پجاریوں کو سیاسیات پر حاصل تھا۔ جب کبھی کسی آگر کو آسمان پر یا زمین پر یا کسی جانور

---

[۵۸] ہالینڈ: اصولِ قانون - باب ۵۔

[۵۹] نیز اس بحث کے لئے دیکھو ولوبی "قانونِ عامہ" Willoughby: Public Law باب ۱۰

[۶۰] گرے، باب ۴

[۶۱] ہالینڈ۔ باب ۵

کے جسم میں یا کسی اور جگہ کوئی بدشگونی معلوم ہوتی تو وہ اپنے حکم سے تمام موجودہ سیاسی کارروائیوں کو یک قلم موقوف یا ملتوی کر سکتا تھا اور اُس کا حکم ناطق سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس اہم منصب نے بالکل سیاسی پہلو اختیار کر لیا، اور یہ روزمرہ کی بات ہوگئی کہ جب کوئی آگر کسی خاص سیاسی فریق کا ہمنوا ہوتا اور فریقِ مخالف کسی جمعیت یا مجلس پر حاوی ہوتا تو وہ کسی فرضی بدشگونی کا انکشاف کر کے کارروائی کو فی الفور روک دینے میں دریغ نہ کرتا[۱۱۲]۔ قانون پر مذہبِ عیسوی کا اثر بھی کچھ کم نہیں پڑا۔ چنانچہ ہنری چہارم شاہِ انگلستان کے زمانے کی ایک نظیر میں صریحًا یہ حکم لگا دیا گیا ہے کہ "انجیلِ مقدس ایک ایسا قانونِ عامہ ہے جس پر جملہ اثباتی قوانین کا دارومدار ہے"[۱۱۳] یہی کیفیت منوسمرتی جیسی کتبِ ہنود اور بعض صحائفِ سماوی کی ہے۔ قرآن مجید میں بھی بعض اصولی اور بعض تفصیلی قوانین مندرج ہیں اور انہی پر تمام فقہ اسلامی مبنی و منحصر سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہاں بھی یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ کسی ملک میں صرف انہیں احکامِ الٰہیہ کو قانون کا رتبہ حاصل ہوتا ہے جنہیں عدالت ملئے مجاز تسلیم کر لیں۔ سب سے بدیہی مثال شرعِ اسلامی کی ہے۔ شرعِ اسلامی کے عروج کے زمانے میں یہ شرع جملہ معاملاتِ مملکت پر حاوی تھی، لیکن امتدادِ زمانہ سے (خصوصًا جب غیر اسلامی قوانین کا عروج ہُوا اور اُن کا دنیا پر رواج ہوگیا تو) رفتہ رفتہ اِس کے بعض حصوں کو نظرانداز کر دیا گیا، اور آج شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں اُس کا تمام و کمال رواج ہو۔ ہندوستان میں ۱۸۸۵ء کے ایک قانون کے مطابق شرع شریف اور دھرم شاستر کا نفاذ صرف معاملاتِ وراثت اور مناکحت و ازدواج تک محدود رہ گیا ہے۔ اور تعزیرات و نقصان رسانی کے معاملات پر اس کا مطلق کوئی اثر باقی نہیں رہا[۱۱۴]۔ بعض اسلامی ممالک اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں، اور انہوں نے ضروریاتِ زمانہ کو ملحوظ رکھ کر اپنے قوانین بالکل نئے سانچے میں ڈھال دئیے ہیں۔ یہ اثر در اصل مذہبی قوانین سے اُس عظیم الشان گریز کا ہے جو اِس وقت یورپ و امریکہ میں جاری و ساری ہے۔ بہرنہج خواہ ہندوستان کی طرح مذہبی قوانین کی جزوی پابندی کی جائے یا ترکی و مصر کی طرح اکثر معاملات میں مطلق پابندی نہ کی جائے اس میں شبہ نہیں کہ مذہبی قوانین کی ترویج کا دارومدار محض اس امر پر ہے کہ آیا عدالتیں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں، اگر قانون ساز نے اُس کے کسی جزو کو صراحتًا رد کر دیا ہے تو لامحالہ عدالتیں اُسے مسترد سمجھیں گی، اگر رد نہیں کیا ہے تو

---

[۱۱۲] ٹیلر، "رومائی دستوری اور سیاسی تاریخ" T. M. Taylor: Constitutional and Political History of Rome باب ۵

[۱۱۳] سالیانہ ۴ ہنری چہارم ص۳۱ جس کا اقتباس ہالینڈ باب ۵ میں دیا گیا ہے۔

[۱۱۴] قانونِ پارلیمنٹ ۲۱ جارج ۳، باب ۷۰ دفعہ ۱۷۔

پھر اُس کا تسلیم کرنا نظائر اور خود اُس کے اختیارِ تمیزی پر منحصر ہوگا۔[11]

مذہبی قوانین سے گذر کر ہم رسم و رواج تک پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسم و رواج کو اتنا ہی، بلکہ بعضوں کی نگاہ میں تو اس سے زیادہ تقدس حاصل ہے جتنا مذہبی قوانین کو۔ قدیم یونانیوں کا خیال تھا کہ جب کوئی حاکم کسی معاملے کا تصفیہ کرنے بیٹھتا ہے تو ایک دیوتا تھے مس نامی (جسے انصاف کا معبود سمجھا جاتا تھا) اس پر اپنا خیال القا کرتا ہے، اور وہی اس حاکم کی تجویز ہوتی ہے، چنانچہ ان تجاویز کو تھے مس تیس کا لقب دیا جاتا تھا۔ اور لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بادشاہوں کے پاس ان تجاویز کا گویا کہ انبار لگا ہوتا ہے جس میں سے وہ چن چن کر اُن کے مطابق مختلف معاملات کا تصفیہ کرتے ہیں۔[12] اگر ہم غور کریں اور ان معانی کے بین السطور دیکھیں تو ہم پائیں گے کہ دراصل تھے مس تیس کا ماخذ وہی رسم و رواج کا ذخیرہ تھا جس کے مطابق بادشاہ یا حکمران تجویزیں صادر کرتا تھا اور خود ہومری اشعار میں بھی تھے مس رسم و رواج کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہندوستان میں رسم و رواج ایک مسلّمہ ماخذِ قانون ہے، اور پنجاب تو اس قسم کے رواجی قوانین سے بھرا پڑا ہے۔ ساتھ ہی مختلف دیہات کے واجب العرضوں کو تسلیم کرکے مملکت نے اس اصول پر اپنی مہرِ ثبت کر دی ہے۔

مستند ائمۂ قانون اور فقہا کی کتابیں بھی تجاویزِ عدالت کا ماخذ ہوتی ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی زبردست اور اہم کتابوں سے، جیسے یوس تی نیان اور گایوس، فتاوائے عالمگیری اور ہدایہ۔ متاکشرا اور دیا بھاگ، بلیکسٹن اور کک ہیں عادل اپنی تجاویز کے اصول اخذ کرسکتا ہے اور اُن کی سند پر اپنے خیالات کو مبنی کرسکتا ہے۔ لیکن تاوقتیکہ کوئی اعلیٰ عدالتِ مجاز ان کتابوں کے کسی اصول کے مطابق کسی معاملے کا تصفیہ نہ کرلے انہیں یا اُن کے کسی جزو کو اثباتی

---

[11] شرعِ محمدی، محکمۂ عدلیہ اور جماعتِ مقننہ کے حدود دمسئلہ وقفِ اسلامی کے حوالے سے ظاہر ہو جائیں گے۔ جملہ ائمہ اہلِ سنت و اثنا عشری اس اصول پر متفق ہیں کہ کوئی شخص اپنی جائداد وقف علی الاولاد کرسکتا ہے یعنی اس طرح پر وقف کرسکتا ہے کہ جائداد کا منافع اسکی اولاد اور اولاد کی اولاد کو ملے تاآنکہ اُس کی نسل میں سے کوئی باقی نہ رہے، اگر کوئی زمانہ ایسا آئے کہ اُس کی نسل بالکلیہ منقطع ہو جائے تو یہ روپیہ کسی کارِ خیر میں لگا دیا جائے باوجود مکمل اتفاق جملہ ائمہ رحمہ کے پریوی کونسل نے ۱۹۱۳ء سے پہلے بارہا یہ طے کیا کہ اگر وقف کا مقصد فوراً کسی خیرات میں منافع کا صرف نہ ہوگا تو وقف کالعدم سمجھا جائے گا (محمد احسان اسد چودھری بنام امر چند، ۱۷ کلکتہ صفحہ ۴۹۸ پریوی کونسل، ابو الفتح محمد اسحاق بنام راس میا دھر چودھری ۲۲ کلکتہ صفحہ ۶۱۹ پریوی کونسل) اور قانون کی یہ شکل جو تھی اس وقت تک جاری رہی جب تک قانون ۶ ۱۹۱۳ء (قانون جوازِ وقفِ اسلامی) ہندوستان کی مجلسِ مقننہ نے منظور نہ کرلیا جس کی رو سے اصل شرعی اصول از سرِ نو مروج ہوگیا۔ دیکھو عبدالرحیم "اصولِ قانونِ اسلامی" Abdur Rahim, Muhammadan Jurisprudence باب ۲ حصہ ۲ (ب)

[12] مین "قانونِ قدیم" Maine : Ancient Law باب ۱ و ۵۔

قوانین کا رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

قانون کا آخری ماخذ نصفت ہے۔ پروفیسر ہالینڈ اس کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ "نصفت اُن قواعد کا نام ہے جو موجودہ اثباتی قوانین کے دوش بدوش کسی اعلیٰ حاکمِ عدالت کے حکم سے جاری کئے جائیں۔ اگر اثباتی قوانین اور قواعدِ نصفت میں باہمی تخالف نظر آئے تو موخرالذکر کا ہی بول بالا سمجھا جائے"[۳۱]۔ اگر دوسرے اعضائے حکومت پر حکامِ عدالت کی فوقیت اس وقت تک مشتبہ تھی تو اصولِ نصفت اور اُس کی ترویج و توسیع کے بعد تو اس میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا۔ اثباتی قوانین موجود ہیں، اِن قوانین پر عملاً عمل ہو رہا ہے، لیکن عدالت اُن پر لفظاً یا معناً عمل کرنے کی بجائے از خود جدید قواعد وضع کرتی ہے اور اُن کے مطابق معاملہ کا تصفیہ کرتی ہے۔ اِس اصول کی ابتدا اور ترویج بجائے خود ایک نہایت ہی اہم شاخ مطالعۂ قانونی کی ہے۔ اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن ممالک میں ان قواعد کی ابتدا ہوئی اُن میں حکامِ بالادست نے کس طرح سے موضوعہ اثباتی قوانین کو نظر انداز کر کے جدید قواعد کی بنیاد ڈالی اور ان قواعد کے مطابق مقدمات کا تصفیہ کیا۔ قواعدِ نصفت کی بدیہی مثال قاعدۂ حکمِ امتناعی ہے جس کی رو سے قبلِ تصفیۂ مقدمہ محض ایک فریق کی درخواست پر عدالت فریقِ ثانی کو امرِ متنازعہ فیہ سے دست کشی کا حکم دیتی ہے اور عدولِ حکمی کی صورت میں اُسے مرتکب سزا گردانتی ہے[۳۲]

اثباتی قانون کے اقسام۔ قبل اس کے کہ ہم حقوق کی اہم بحث کی طرف متوجہ ہوں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً قانون کے اقسام بیان کر دیئے جائیں۔ یوں تو قانون کی تقسیم مختلف اصول کی بنا پر کی جاتی ہے، لیکن ہمارے مقاصد کے اعتبار سے اسے دو اصول کی بنا پر تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک تو اس کے مقصد کی بنا پر اور دوسرے فریقِ متعلق کی نوعیت کی بنا پر۔ اگر غور کیا جائے تو قانون کے دو بدیہی مقاصد نکلیں گے۔ ایک تو افرادِ مملکت کے حقوق

---

[۳۱] ہالینڈ، باب ۵

[۳۲] یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام قوانین کے ماخذوں کو شمار کرنے کے ساتھ ہی فقہ اسلامی کے ماخذ بھی شمار کر دیئے جائیں۔ فقہ اسلامی کی تدوین (جسے شرعِ محمدی کا لقب بھی دیا جاتا ہے) تقریباً تیسری صدی ہجری میں ہوئی۔ اس کے ماخذ مفصلہ ذیل ہیں، قرآن مجید، حدیث رسول اکرم صلعم، مجتہدین یعنی علماء ائمۂ قانون کا اتفاق رائے۔ قیاس یعنی اصولِ ماقبل کو پیش نظر رکھ کر کسی ایک عالمِ فقہ کی ذاتی رائے، استحسان یعنی بغیر اصولِ ماقبل کے پیش نظر رکھے ہوئے محض عالمِ فقہ کی رائے کا واقعات متنازعہ فیہ پر انطباق۔ اس کے علاوہ عرف یعنی رسم و رواج کو بھی ماخذِ شرع اسلامی قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ اُس کے خلاف کوئی نصِ صریح نہ ہو۔ اس پر سر عبدالرحیم نے اپنی کتاب "اصولِ قانونِ اسلامی" باب ۳ میں مفصل بحث کی ہے، علاوہ ازیں الخضری کی تاریخ فقہ اسلامی (مترجمہ عبدالسلام

بقیہ بر صفحۂ آئندہ

و فرائض کا تعین اور دوسرے اگر دو شخصوں میں تنازعہ ہو تو اُسے رفع کرنے یا اُس کے طے کرنے کے طریقہ کا تعین۔ پہلی قسم کے قوانین کو "قوانینِ اصلی" اور دوسری قسم کے قوانین کو "قوانینِ اضافی" کہتے ہیں۔ قوانینِ موجہ میں اس قسم کے قوانین جیسے قانونِ معاہدہ قانونِ ازالۂ حیثیتِ عُرفی، قانونِ ملوکات قانونِ مالگذاری اور ایسے ہی دوسرے قوانین ہیں جن میں ہر ایک شخصِ متعلق کے حقوق و فرائض کی نوعیت دکھائی گئی ہو! اِس کے برعکس قوانینِ اضافی میں ایسے قوانین جن کا تعلق اقسامِ عدالت، مدارجِ مقدمہ، نفاذِ تجویزِ عدالت، حدِ اختیار اور وہ قواعد ہوتے ہیں جن کی پابندی ضروری اور لازمی ہے۔ دوسرا اصول جس کی بنا پر قانون کو تقسیم کیا جاتا ہے افرادِ متعلقہ کی شخصیت پر مبنی ہے۔ اگر دونوں فریق کی نوعیت محض خانگی ہو تو اُن کا تعلق "خانگی قانون" سے ہوگا؛ اگر اُن میں سے ایک خود مملکت اور دوسرا محض ایک فرد ہے تو اُس کی نوعیت "قانونِ عامہ" کی ہوگی اور اگر دونوں فریق دو یا دو سے زائد مملکتیں ہوں تو اُن کا تعلق "بین الاقوامی قانون" سے ہوگا۔ خانگی قانون ایسے قانون کو کہتے ہیں جیسے قانونِ معاہدہ، قانونِ ملوکات، جب اُن میں دونوں فریق محض خانگی افراد ہوں؛ قانونِ عامہ میں قانونِ تعزیرات (یعنی وہ قانون جس کے ذریعے سے مملکت ملک میں بدامنی کا انسداد کرتی ہے)، قانونِ دستوری (یعنی وہ قانون جس سے گویا مملکت کا سیاسی مرکزِ ثقل معلوم ہوتا ہے اور یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مملکت کی ہیئتِ حاکمیہ میں کون کون سے عناصر شامل ہیں) اور قانونِ انتظامی (یعنی وہ قانون جس کے ذریعے سے مملکت اور افراد کے باہمی تنازعات طے ہوں) شامل ہیں۔ قانونِ بین الاقوامی اُن قواعد کا مجموعہ ہے جن پر امن اور جنگ کے وقت مختلف ممالک حتی الامکان کاربند رہتے ہیں، لیکن جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے، قانون

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۰۸) ندوی) ہیں اصولِ اجتہاد کی تاریخ اور جستہ جستہ اُس کی تشکیل کے مدارج واضح کئے گئے ہیں۔ اگر ہم بنظرِ غائر دیکھیں تو آج کل کے مسلمہ مآخذِ قوانین کو پیشِ نظر رکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زمانۂ حال کے اصولِ قانون کے مآخذ اور شرعِ محمدی کے مآخذ کا مقابلہ مفصلہ ذیل طرز پر کیا جا سکتا ہے:-

مآخذِ فقہ اسلامی	ماخذِ قانونِ حالیہ
(۱) قرآنِ مجید و حدیثِ رسولِ اکرم صلعم	(۱) قانونِ الٰہیہ و قوانینِ منظور کردۂ قانون ساز
(۲) اجماعِ مجتہدین	(۲) بڑے بڑے مفسرینِ قانون کی کتابیں۔
(۳) قیاس	(۳) نظائر
(۴) استحسان	(۴) نصفت
(۵) عرف	(۵) رسم و رواج

کے لیئے مقتدرِ اعلیٰ کا ہونا لازمی ہے، اور چونکہ کوئی ایسی قوت یا ارادہ موجود نہیں ہے جسے "بین الاقوامی مقتدرِ اعلیٰ" کہا جاسکے اس وجہ سے اکثر سیاس ان قواعد کو قانون کا لقب دینا پسند نہیں کرتے[۱۹]

ہارون خاں شروانی

اصطلاحات باب ۶ حصہ (۱)

اثباتی قوانین	Positive Law	قانونِ الٰہیہ	Divine Law
اصولی قانون	Jurisprudence	قانونِ انتظامی	Administrative Law
اخلاق	Morality	قانونِ تعزیری	Criminal Law
ازالۂ حیثیتِ عرفی	Defamation	قانون ساز، مقنن	Law-maker
پارلیمنٹی حکومت	Parliamentary Government	قانونِ عامہ	Public Law
تاویلِ قانون	Interpretation of Law	قانونِ لگان	Law of Rent
جمہوریہ	Republic	قانونِ معاہدہ	Law of Contract
حدِ اختیار	Jurisdiction	قانونِ مملوکات	Law of Property
حکمِ امتناعی	Injunction	قوانینِ اضافی	Adjective Laws
خانگی قانون	Private Law	قوانینِ اصلی	Substantive Laws
شخصی حکومت	Autocracy	ماٰخذِ قانون	Sources of Law
شرعِ اسلامی	Islamic Law	مافوق الفطرت ہستی	Supernatural Being
صدارتی حکومت	Presidential Government	مجلسِ بلدیہ	Municipal Council
عادل	Judge	مجلسِ ریلوے	Railway Board
عدالت العالیہ	High Court	نصفت	Equity
فوجی قانون	Martial Law	نقصان رسانی	Tort

[۱۹] پروفیسر آموس اپنی کتاب "علمِ قانون" Amos: The Science of Law باب ۵ میں اُن قوانین کا جو اُن کی دانست میں کسی متمدن مملکت کے لیئے ضروری ہیں، شمار کرتے ہیں۔ ہم نے اس فہرست میں تھوڑی بہت ضروری ترمیم حسبِ حال کر دی ہے:-

قوانین

- قوانین جن کے اصول منضبط ہو سکتے ہیں
  - قانونِ تعزیری
  - قانونِ ملک
  - قانونِ معاہدہ
  - قوانینِ خصوصی
  - قوانینِ مزید یا
  - قانونِ تعزیری
  - ضابطۂ دیوانی و فوجداری
    - قوانین متعلقہ مدارجِ مقدمہ
    - قوانین متعلقہ عدالتہائے مملکت
- قوانین جن کے اصول منضبط نہیں ہو سکتے
  - وقتی قوانین
  - مقامی قوانین
  - وقتی و جزوی رسم و رواج جس کی حیثیت قانون کی سی ہے
  - ضابطوں کے مابین مناقضہ قوانین

غزل

شکر ہے کہ دل دے کر یارِ دلربا پایا
یعنی جس قدر کھویا اُس سے کچھ سوا پایا

خنجرِ فنا کھا کر ثمرۂ بقا پایا
زیست کی بنا ڈھا کر زیست کا مزا پایا

جبر کرنے والوں نے جبر کر کے کیا پایا
صبر کرنے والوں نے صبر کا صلہ پایا

جس نے ہر دو عالم کو چشمِ غور سے دیکھا
اُس نے ہر دو عالم سے تم کو ماورے پایا

ہم نے بے نشاں ہو کر آپ کا نشاں ڈھونڈا
ہم نے آپ کو کھو کر آپ کا پتا پایا

شاد رہ کے بھی شاکر، رنج سہ کے بھی شاکر
بندۂ محبت کو بندۂ رضا پایا

ہم کو بتکدے میں بھی شانِ حق نظر آئی
ہم نے بتکدے کو بھی خانۂ خدا پایا

صرف اک غمِ الفت وجہِ صد خوشی دیکھا
ورنہ ہر تعلق کو رنج و غم فزا پایا

ہاں متاعِ راحت بھی قیمتی سہی لیکن
جنسِ دردِ الفت کو جنسِ بے بہا پایا

سچ تو یہ ہے رندوں کا حال پھر غنیمت ہے
اِتّقا پسندوں کو صرفِ اِتّقا پایا

اے ندیمِ دُور اندیش میں نے عشقِ جاناں میں
یہ نہ پوچھ کیا کھویا، اِس کو دیکھ کیا پایا

اِس میں شک نہیں آزادؔ شوخ بھی ہے منہ پھٹ بھی
کچھ سہی، مگر اُس کو آدمی کھرا پایا

حکیم آزاد انصاری

سرمایۂ مشترک

(بہ سلسلۂ اشاعت گزشتہ)

ہندو اور اردو - ہندوؤں کے ساتھ جو زیادتی کی گئی اُس کا ذکر مجملاً ضمن گذشتہ میں ہو چکا - اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کا زبانِ اردو پر کیا استحقاق ہے اور انہوں نے زبانِ اردو کی کیا خدمت کی ہم ایک دفعہ پھر کہے دیتے ہیں کہ جب تک ہندو مسلمان متحدہ کوشش اور یک جہتی سے کام نہ لیں گے اردو زبان کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی - اہلِ ہند کو مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شروانی کے یہ الفاظ گوشِ ہوش سے سننے چاہئیں "ریختہ کہو اردو کہو - ہندی کہو - جو نام چاہو رکھو - مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی عام رائج زبان ہندو اور مسلمان اہلِ ادب کی محنتِ مشترکہ کا ثمر ہے - ابتدائے شاعری سے انتہا تک یہ اشتراکِ محنت عیاں ہے (دیباچہ تذکرۂ میر حسن صفحہ ۱۲) ایسے جید مفتی کی شہادت کے سامنے کسی کم سواد مسلمان کا وراثتِ بلا شرکتِ غیرے کا دعوے دار ہونا بے معنی ہے - اب اردو زبان کے کہنہ مشق ادیب - دیرانہ مجمعن اور اقلیم سخن کے جہاں نورد سیاح ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کی زجر بھی ملاحظہ فرمائیے "متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو ہنوز اُس ذمہ داری کا احساس نہیں ہوا جو اُن پر اپنی زبان کی تکمیل اور اپنی ادبیات کی خدمت کے سلسلہ میں عائد ہوتی ہے - نہایت رنج و کرب سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کی ادبیات نے وطنیت کے اُس غلط مفہوم سے بے حد صدمات اُٹھائے ہیں جسے فرقہ وارانہ جذبات سے الگ کرنا مشکل ہے - صوبہ جاتِ متحدہ کے بعض مقامات پر ایسے تعلیم یافتہ ہندو دیکھنے میں آتے ہیں اور انہیں دیکھ کر طبیعت منغص ہو جاتی ہے جن کے دماغ میں یہ بات سمائی ہے کہ ہندی اُن سے متوقع ہے کہ وہ اُس اردو زبان اور اردو ادب سے کلیتًا خالی الذہن ہو جائیں جس میں ایک دو پشت پہلے اُن کے بزرگ دادِ سخن دیا کرتے تھے - اُن مسلمان نوجوانوں سے ملنا بھی کچھ کم انقباضِ خاطر کا موجب نہیں ہوتا جن کے لب پر ہمیشہ یہ شکایت ہوتی ہے کہ ہندو اردو کی طرف ملتفت نہیں ہوتے - اگر ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ حضرت پہلے یہ تو فرمائیے کہ آنجناب نے زبانِ اردو کی کیا خدمت کی ہے تو بغلیں جھانکنے لگیں - اِس پر یہ ادعا کہ آپ ہی زبانِ اردو کے واحد محافظ اور تنہا اجارہ دار ہیں" (تقریب تاریخِ ادبیاتِ اردو مولفہ رام بابو سکسینہ بزبان انگریزی) لالہ سری رام اپنی بے نظیر فانی تصنیف خمخانۂ جاوید جلد (۱) صفحہ ۱۶ میں لالہ ٹیک چند بہار کے متعلق فرماتے ہیں "اور نادر شاہی دار و گیر کے وقت

بھی قزلباش سپاہیوں سے فارسی لغات و محاورات کی تحقیق کرتے پھرتے تھے۔ اللہ اللہ ایک وہ سچے قوم اور ملک کی خدمت کرنے والے تھے اور ایک اس زمانہ کے اہلِ علم ہیں کہ اپنی مادری زبان (اردو) کی درستی اور تکمیل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے" اس بارے میں گارساں دتاسی کہتا ہے کہ بے شمار ہندو ایسے ہیں جن کی تصانیف اردو میں موجود ہیں اور پہلے تو وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اُس کے اندازہ میں ۸۰۰ خالص اردو کے ہندو شعرا اس وقت موجود ہیں۔ گویا ذی فہم مسلم و ہندو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اردو زبان کو سرمایۂ مشترک سمجھو اس کے حصے بخرے کرنے کا خیال تنگ دل میں نہ لاؤ۔ ورنہ یہ بزرگوں کے وقت کا اندوختہ خورد برد ہو جائے گا۔ مسلمان کا فرض ہے ہیں اگر زبان کے سلسلہ میں ہندو ادبا کی خدمات کا اعتراف نہ کریں۔ ہندو اپنے بزرگوں کے سچے جانشین نہیں اگر وہ بزرگوں کی اس امانت کو سینہ سے نہ لگائیں۔ منشی دیبی پرشاد نے "تذکرۂ شعرائے ہنود" ایک ضخیم جلد میں مرتب کر کے شائع کیا ہے جس میں سینکڑوں ہندو شعرا کا ذکر ہے۔ لیکن ہم ذیل میں ایسے ہندو ادبا کے اسمائے گرامی درج کرتے ہیں جو یا تو مسلّمت استاد تسلیم کئے گئے ہیں یا صاحبِ دیوان ہیں۔ یا بنوعِ دیگر ناموری کے مستحق ہیں درجۂ اوسط و ادنیٰ کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔

(۱) دلّی اورنگ آبادی کی غزلوں میں گوبند لال امرت لال اور کھیم داس کے نام جابجا آتے ہیں۔ بلکہ ایک آدھ غزل میں تو بعض ناموں کو ردیف قرار دیئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اصحاب اگر سخن گو نہ تھے تو بھی ان کی سخن فہمی میں کلام نہیں۔ ورنہ ولی کیوں ذکر کرتا۔ (دیباچہ کلیات ولی مرتبہ احسن مارہروی صفحہ ۶۳)

(۲) رائے آنند رام مخلص فارسی کے زبردست شاعر بیدل کے شاگرد ریختہ بھی کہتے تھے (تذکرہ میر تقی صفحہ ۴)

(۳) ٹیک چند بہار فارسی میں مسلّمت استاد کا رتبہ رکھتے ہیں فارسی کا ضخیم لغات موسومہ بہار عجم محمد شاہ کے زمانہ میں مرتب کیا۔ ریختہ میں کافی ذخیرہ چھوڑا۔ تذکرہ میر تقی صفحہ ۱۴)

(۴) بندرابن راقم شاگرد میر تقی و میرزا سودا۔ جتنا قد چھوٹا تھا اتنا ہی فکر بلند تھا (تذکرہ میر تقی صفحہ ۱۵۲)

(۵) رائے پریم ناتھ موزوں۔ موزوں طبع شاعر۔ فارسی و ریختہ میں کامل۔ خطاطی اور کمانداری میں ماہر تھا۔ (تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۵)

(۶) سنتوکھ رائے بیتاب بہت خلوت دوست تھے اُس زمانہ میں یہ رباعی کہہ گئے ؎

ہاں آکے ہم اپنے مدعا کو بھولے ۔۔۔۔ مِل مِل کے غیروں سے آشنا کو بھولے

دنیا کی تلاش میں گنوائی سب عمر ۔۔۔۔ اس مس کی طلب میں کیمیا کو بھولے

(تذکرہ میر حسن صفحہ ۹۵)

(۷) آفتاب رائے رسوا- آپ کے کلام میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے- فارسی و ریختہ ہر دو میں دادِ سخن دیتے تھے- دائم الخمر تھے- میت کو اُن کی وصیت کے مطابق شراب سے غسل دیا گیا (تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۰۳)

(۸) الماس رائے رنگین- ریختہ اور فارسی دونوں کے شاعر تھے- (" " صفحہ ۱۰۵)

(۹) لالہ خوشوقت رائے شاداب- میرحسن کہتے ہیں، منشی است، نثر خوب مے نویسد- یہ شعر

دیکھ اُس کے منہ پہ زلفِ سیہ فام کے تئیں
کیا زیب دی ہے کفر نے اسلام کے تئیں

یہ داد پاتا ہے مضمونِ خوب یافتہ است (تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۲۶)

(۱۰) رائے بھکاری داس عزیز- میرحسن کہتے ہیں- شاعرِ زباندان سیلِ طبعش روان و توسنِ خامہ اش دوان- (تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۲۶)

(۱۱) رائے لکھ رام عاقل- شاعر تو خوب تھے مگر پنجابی (تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۲۶)

(۱۲) بدھ سنگھ قلندر- میرحسن کے معصر دولت مند تھے عشق کے ہاتھوں قلندری اختیار کی- کیا مزے کا شعر کہا ہے-

چھپا ہے مانگ میں دل جا کے اب میں ڈھونڈوں کدھر — کہ آدھی رات ادھر ہے اور آدھی رات اُدھر

(تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۵۴)

(۱۳) لالہ کاشی ناتھ- آپ بھی پنجابی ہیں- (تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۶۴)

(۱۴) راجہ رام نرائن موزون- حزین کا شاگرد اور فارسی میں صاحبِ دیوان ہے- سراج الدولہ کی طرف سے عظیم آباد کا صوبہ دار تھا- جب اِس کی شہادت کی خبر پہنچی تو دیوانہ وار روتا تھا اور اپنا فی البدیہہ شعر پڑھتا تھا-

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی — دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

(تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۷۳)

(۱۵) عجائب رام منشی مرشد آبادی- (" " ۱۸۶)

(۱۶) لالہ نول رائے وفا- زیورِ علم و عمل سے آراستہ ہے (" " ۲۰۷)

(۱۷) لالہ سورج نرائن صاحب خاطر- ظہیر کے ارشدِ تلامذہ سے ہیں-

(۱۸) پنڈت سورج پرشاد خورشید- وکیل فرخ آباد- دیوان طبع ہو چکا ہے-

(۱۹) منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی - واجد علی شاہ کے منصدی تھے - رامائن اور گیتا کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے۔
(خمخانہ صفحہ ۸۳)

(۲۰) منشی جیکہ رائے خیال - شاہ نصیر کے ہمعصر تھے۔

(۲۱) پنڈت رتن ناتھ دریا لکھنوی - شاگرد حضرت رشک، فارسی میں عالم بے بدل اور زبردست نقاد تھے

(۲۲) منشی چندن لال دلگیر - مذہب آبائی کو ترک کر کے مسلمان ہوگئے - ناسخ کے شاگرد تھے مرثیہ کہنا شروع کیا - نواب سعادت علی خاں کے زمانہ کے مرثیہ گو شعرا کے سرتاج تھے - مراثی کا ضخیم مجموعہ طبع ہوچکا ہے - امانت آپ کے شاگرد تھے۔

(۲۳) رائے سرب سنگھ دیوانہ بعہدِ شاہِ عالم ثانی چار دیوانِ فارسی اور ایک دیوان اردو ان سے یادگار ہے حسرت استاد جرات آپ کے شاگرد تھے۔

(۲۴) منشی خوب چند ولی - شاگرد نصیر صاحب دیوان و تذکرہ معیار الشعرا کے مصنف۔

(۲۵) راجہ رام کشن راجہ - صاحب دیوان۔

(۲۶) مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ - صاحب دیوان - موسومہ گل ریاض

(۲۷) سروگ بجے سنگھ والیٔ ریاست بلرام پور - شاگرد جواہر سنگھ جوہر صاحب دیوان ۳۰۴

(۲۸) لالہ بھگونت رائے راحت کاکوری امانت سے تلمذ تھا مثنویات زہرہ، بہرام، ندمن، سوزِ عاشقانہ آپ سے یادگار ہیں۔

(۲۹) دیوان جان بہاری لال راضی - صاحب دیوان - گلستاں، بوستاں - اور انوار سہیلی کا اردو نظم میں ترجمہ کیا۔

(۳۰) حکیم سکھانند رقم دہلوی نصیر کے شاگرد صاحب دیوان۔

(۳۱) منشی جگت موہن لال رواں دورِ حاضر کے مشہور شعرا میں شمار ہے۔

(۳۲) منشی رام سہائے رونق لکھنوی شاگرد ناسخ

(۳۳) منشی پیارے لال رونق دہلوی شاگرد داغ و راسخ - رونقِ سخن کے علاوہ ایک دیوان اور مرتب کیا۔ دہلی کے مشہور رسالہ کمال کے آپ ہی ایڈیٹر تھے۔

(۳۴) دیوان دیا کرشن ریحان لکھنوی - شاگرد موجی رام موجی و مصحفی و جواہر سنگھ جوہر ان کا دیوانِ اردو "ریحانِ سخن" چھپ گیا ہے۔

(۳۵) لالہ بیٹھو لال زار بلگرامی شاگرد منشی طوطا رام عاصی اردو و فارسی میں صاحب دیوان۔ انشائے گلزارِ فصاحت فارسی کے مصنف۔

(۳۶) راجہ چھنو لال زیب۔ آپ کا دیوان طبع ہو چکا ہے۔

(۳۷) راجہ جسونت سنگھ پروانہ شاگرد مصحفی صاحب دیوان تھے۔

(۳۸) پنڈت منولال پریشان شاگرد شاہ نصیر۔

(۳۹) رائے ٹیکا رام تسلی۔ ریختہ میں مصحفی اور فارسی میں میرزا ناصر کے شاگرد تھے۔ دواوین کا نایاب کتب خانہ ہزارہا روپیہ کے صرف سے مہیا کیا تھا۔

(۴۰) منشی رام سہائے تسلی۔ حاتم علی مہر کے شاگرد غنچۂ مراد و نغمۂ آرزو دو دیوان مرتب کئے۔

(۴۱) منشی رام سہائے تمنا لکھنوی۔ فارسی اردو اور بھاشا میں عالمانہ تبحر رکھتے ہیں۔ دوارکا پرشاد افق اور ماتا پرشاد نیسان کے بھائی ہیں اور افضل التاریخ کے مصنف ہیں۔

(۴۲) لالہ مادھو رام جوہری فرخ آبادی شاگرد منیر دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اِن کے فرزند شبھو پرشاد جوہری بھی بلند پایہ شاعر تھے۔

(۴۳) منشی جواہر سنگھ جوہر خلف منشی بختاور سنگھ راقم فارسی میں ناطق اور اردو میں خواجہ وزیر سے تلمذ تھا۔ پانچ دیوان تصنیف کئے جو چھپ چکے ہیں۔

(۴۴) سردار کیسرا سنگھ جہانگیر امرتسری شاگرد بیان ویزدانی مخزن کے دور اول میں بہت نام پیدا کیا۔ پنجاب میں آج تک کوئی غزل گو اس پایہ کا نہیں ہوا۔

(۴۵) جیون ناتھ جیون دہلوی بہار دانش کا نظم اردو میں ترجمہ کیا۔

(۴۶) پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی دورِ حاضر کے اُن جوانمرگ مستند شعراء سے ہیں جن کی ذات سے اردو کو بہت کچھ امیدیں تھیں۔

(۴۷) منشی رتی رام حسرت دہلوی۔ فارسی میں صاحب دیوان اور اردو کے مشہور شاعر۔

(۴۸) پنڈت اجودھیا پرشاد حیرت لکھنوی شاگرد جرأت صاحب دیوان و مثنویات۔

(۴۹) رائے پریم ناتھ دہلوی دو ہزار شعر کا دیوان یادگارِ زمانہ ہے۔

(۵۰) رائے بہادر منشی شیو نرائن شاگرد غالب۔

(۵۱) منشی رام سنگھ آزاد دہلوی۔ بعد تحصیل علم نابینا ہوگئے افسوس دیوان تلف ہوگیا۔

(۵۲) پنڈت امرناتھ آشفتہ دہلوی شاگرد تنویر دہلوی صاحب دیوان۔

(۵۳) ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی۔ پنجاب میں جدید اردو کو آپ کی سعی سے رواج ہوا۔

(۵۴) پنڈت بشن نرائن آبر لکھنوی۔ دفتر گلزار کشمیر کے مصنف۔

(۵۵) پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی۔

(۵۶) راجہ پرمانند افسر والیٔ راج۔

(۵۷) منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی۔ شاگرد منشی شنکر دیال فرحت ٹاڈ راجستان مہابھارت اور رامائن کے مترجم

(۵۸) دیوان پنڈت امرناتھ مدن اکبری۔ دیوان فارسی مع غزلیات اردو شائع ہوچکا ہے۔

(۵۹) راجہ پیارے لال الفتی دہلوی۔ مثنوی نیرنگ تقدیر کے مصنف ہیں۔

(۶۰) راجہ گردھاری پرشاد باقی حیدرآبادی۔ دیوان بقائے باقی، بھاگوت گیتا فارسی، کیشونامہ، کلیات یادگار باقی اور قصائد باقی آپ سے یادگار ہیں۔

(۶۱) منشی مہاراج بہادر برق شاگرد آغا شاعر نئے طرز کے اچھے کہنے والوں میں ہیں۔

(۶۲) پنڈت چندر بھان برہمن۔ ایک دیوان فارسی اور منشیات اُن سے یادگار ہیں۔ ریختہ میں بھی کچھ کہا کرتے تھے۔ شاہجہان کا زمانہ دیکھا ہے

(۶۳) پنڈت سندر لال بسمل لکھنوی شاگرد ناسخ صاحب دیوان۔

(۶۴) پنڈت موتی لال بسمل دہلوی ۔ دو کتابیں فن مسمریزم پر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں۔

(۶۵) منشی دیبی پرشاد بشاش۔ افسانہ خرد افروز۔ گلدستہ ادب۔ وقائع راجپوتانہ۔ احکام نوشیرواں ۔ تاریخ ترکان ہند۔ تذکرہ شعرائے ہنود آپ سے یادگار ہیں۔

(۶۶) لالہ کشن نرائن بیتاب بنارسی صاحب دیوان۔

(۶۷) پنڈت نرائن پرشاد بیتاب مشہور ڈرامانگار۔

(۶۸) راجہ سرکشن سنگھ بیدار۔ امرت سر میں دیوان شائع ہوچکا ہے۔

(۶۹) لالہ بالمکند بے صبر بلند شہری شاگرد غالب و تفتہ۔ فارسی اور اردو دونوں میں صاحب دیوان۔

(۷۰) سالگ رام سالک ۔ دیوان ریختہ اور کلام نعت شائع ہوچکا ہے۔

(۷۱) منشی دیبی پرشاد سحر سندیلوی۔ آپ کی تصانیف:۔ خلاصۃ المنطق۔ معیار الانشا، محیط المساحت، مراۃ الکلام اور دو دیوان جن میں سے ایک کا نام سحر سامری ہے۔

(۷۲) منشی اقبال ورما سحر۔ زمانۂ حال کے نامور شاعر ہیں۔ شکنتلا کا ترجمہ نظم اردو میں کیا ہے۔

(۷۳) منشی ادہم سنگھ سردار امرت سری شاگرد جلال لکھنوی۔

(۷۴) پنڈت رتن ناتھ سرشار اردو میں ناول کے ایجاد کا سہرا آپ کے سر ہے۔

(۷۵) منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی۔ ایک ازبس بلند پایہ طبیعت تھی۔ آپ شباب ہی میں اردو کو داغِ مفارقت دے گئے۔

(۷۶) منشی للتا پرشاد۔ شاد۔ میرٹھی ایڈیٹر اخبار ناظم الہند۔

(۷۷) مہاراجہ سرکشن پرشاد۔ شاد

(۷۸) لالہ بالمکند۔ شاد رہتکی۔ مقالہ نگار۔

(۷۹) منشی ٹھاکر پرشاد شاداں لکھنوی۔ صاحب دیوان گذرے ہیں۔

(۸۰) مسٹر پیارے لال۔ شاکر۔ مذہباً عیسائی۔ شاگرد شوکت اڈیٹر اخبار ادیب مرحوم الہ آباد۔ و العصر لکھنو۔

(۸۱) پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی شاگرد آتش صاحب مثنوی گلزار نسیم۔

(۸۲) جوالا پرشاد برق۔ شیکسپیر کے متعدد ناٹکوں کو اردو میں منتقل کیا۔

(۸۳) رامجی بائی سکنہ نارنول ۱۸۴۸ء تک زندہ تھی۔

(۸۴) پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دورِ حاضر کے مسلم الثبوت نقاد۔ شاعر۔ مورخ۔ ڈرامانگار۔ اور کثیر التصنیف ادیب جن کو لکھنؤ بھی تسلیم کرتا ہے۔

(۸۵) لالہ تلوک چند محروم۔

(۸۶) لالہ بالک رام شاد

(۸۷) منشی نوبت رائے نظر مرحوم۔

(۸۸) منشی دلو رام کوثری نعت میں خوب نام پیدا کیا ہے۔

(۸۹) پنڈت تربھون ناتھ ہجر لکھنوی۔ اودھ پنچ کے نامی نامہ نگار۔

(۹۰) لالہ پریم چند افسانہ مختصر کے طرح انداز

(۹۱) لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی تلمیذ غالب۔

(۹۲) لالہ سری رام جامع تذکرۂ خم خانۂ جاوید۔

(۹۳) لالہ چرنجی لال صاحب مخزن محاوراتِ اردو

(۹۴) بال مکند گپتا المعروف شیسو شنو۔

(۹۵) پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی۔ جن کے دم سے دہلی میں باضابطہ مشاعروں کا نام نمود قائم ہے۔

مزید تلاش سے یہ فہرست اور بھی طویل ہوسکتی ہے۔ مگر مسلمانوں پر جتانے کے لئے کہ ہندو بھی اردو میں معراجِ کمال حاصل کرنے سے عاری نہیں اور ہندوؤں کو یہ بتانے کے لئے کہ اردو سے تغافل انہیں بزرگوں کی کس قدر وراثت سے محروم کردے گا اتنا ہی بس ہے۔

اردو اور فارسی - یہ ہم کئی بار بتا چکے ہیں کہ اردو اُس زبان کا نام ہے جو فارسی اور بھاشا کے ملاپ سے پیدا ہوئی، اس لئے لازم تو یہ تھا کہ اُردو میں فارسی اور بھاشا کا توازن قائم رہتا۔ اور ان سے استعمال میں دامنِ عدل ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا۔ لیکن ہوا اِس کے برعکس۔ بھاشا کے اثر کو کم کرنے میں سعی بلیغ سے کام لیا گیا اور اردو کو فارسی کی باندی بنا دیا گیا۔ اُن تلمیحات سے جو خاص ہندوستان سے متعلق تھیں ارادتاً اعراض کیا گیا اور بھاشا کے الفاظ بے سود و بلاوجہ مجلسِ اردو سے نکال باہر کئے گئے۔ ایسی زبان بازاری قرار پائی جس میں ہندی تلمیحات اور الفاظ نمایاں ہوں۔ ایران اور عرب سے تلمیحات و تشبیہات لائی گئیں۔ عربی بحور اور اوزان میں شعر کہنے لگے۔ فارسی کی صرف و نحو کی بنا پر اردو کی صرف و نحو مرتب ہوئی اردو زبان ایران سے سند لینے لگی اور ایسی زنجیروں میں جکڑی گئی کہ فارسی کے اشارہ کے بغیر ہلنے تک کی سکت نہ رہی۔ اس پر اب یہ شرطیں زیادہ کی جاتی ہیں کہ عربی اور فارسی کے الفاظ اُس صورت میں بولے جائیں جو اُن کی عربی اور فارسی یا ترکی میں ہے۔ صرف عربی اور فارسی کے الفاظ مضاف و مضاف الیہ ہوں۔ واو عاطفہ صرف عربی و فارسی کے الفاظ میں آئے۔ کوئی ترکیب استعمال نہ کی جائے جب تک کہ فارسی سے اُس کی سند نہ ملے۔ فارسی میں تو جھروکا درشن، ڈالی انبہ، کھچڑی بریانی' جائز بلکہ ملوک الکلام لیکن اردو میں ناجائز۔ بہت اچھا اگر آپ فارسی کی واو عاطفہ کو ہندی کے مس سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس میں آپ کی فارسی کا کیا ہرج ہے اگر ہندی کے الفاظ میں وہ واوؔ استعمال کی جائے جو اور کی تخفیف ہے اور ہندی میں استعمال ہوتی ہے۔ ہندی کی دیاکرن (صرف و نحو) میں فقرہ آتا ہے؛ "ناگری میں ماترا و ورن کی گنتی کا کوئی بندھن نہیں رہتا۔ ماترا اور ورن کے درمیان جو "و" ہے اس کے

استعمال میں آپ کیا اعتراض کر سکتے ہیں۔ وہ ستم شعار جو تحصیلِ زبان کو دہلی یا لکھنؤ کے قیام پر موقوف رکھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ارشاد فرمائیں گے کہ فارسی سیکھنے کے لئے ایران جاؤ اور عربی کے لئے حجاز کی زیارت کرو۔ گویا زبان سیکھنے کے لئے پاؤں میں چکر ہونا شرط ہے۔ جو قوم" زبان کی خاطر معانی کی پروا نہ کرے اُس سے زبان کو دولتِ علوم سے مالا مال کرنے کی توقع عبث ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زبان میں ایسی غرابت پیدا ہو گئی ہے کہ اُس کا سیکھنا عربی، سنسکرت اور عبرانی سے کم مشکل نہیں۔ اِس ایک زبان کے سیکھنے کے لئے عربی و فارسی کی مزاولت لازم اور ایران و عرب کی تاریخ میں دستگاہ کامل درکار ہے، اور یہ بھی کم ضروری نہیں کہ ہندی تہذیب کو فراموش کرنے کا ڈھنگ آتا ہو۔ بچوں کے سامنے جو صرف و نحو آتی ہے اُس کی اصطلاحات عربی کے سراسر غیر مانوس الفاظ میں وضع کی گئی ہیں۔ جن کے معنی بچے تو کیا اُستاد بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اِن اصطلاحات کو بچے رٹ لیتے ہیں اور مارے باندھے ازبر کر لیتے ہیں لیکن اُن کے معنی انہیں اُس وقت تک نہیں آتے جب انہیں یاد رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ علم بیان و معانی کا جاننا بھی عربی و فارسی کی تحصیل چاہتا ہے۔ عروض کی تو پوچھئے ہی نہیں کلیتہً عربی میں ہے کیا مزے کی بات ہے کہ اردو کے موتی عربی کی میزان میں تولے جاتے ہیں۔ اور ڈھاکہ کی ململ "تازی گز" سے ناپی جاتی ہے۔ یہ لچھن تو ملک کی عام زبان بننے کے نہیں۔ وہ زبان جو دنیا و مافیہا کو خیرباد کہنے کے بغیر نہ آئے اُسے آج کل کے زمانہ میں کون سیکھنے کی زحمت گوارا کرے گا۔ رسم الخط کی بے عنوانی اور تذکیر و تانیث کے اختلافات دوسرے اسباب ہیں جو زبان کو گورکھ دھندا بنا رہے ہیں۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان عقدوں کا حل کس طرح کیا جائے؟ ہم فارسی کی تقلید میں اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ ایک قدم بھی پیچھے ہٹ نہیں سکتے۔ اور اس لئے اردو کو فارسی کے تاثرات سے پاک کرنا خیالِ خام ہے۔ مگر ان قیود کی گرفت ڈھیلی ہو سکتی ہے اور بھاشا کے عنصر کو شوخ کرنے سے بہت سی آسانیاں پیدا کرنے کے علاوہ مغائرت کی بڑھتی ہوئی رو رک سکتی ہے۔

رسم الخط کی اصلاح کے بعد سب سے ضروری کام یہ ہے کہ صرف و نحو کو انگریزی گریمر کے سانچے میں ڈھالا جائے جیسا کہ ہندی میں کیا گیا ہے۔ اصطلاحات کے لئے ایسے الفاظ منتخب کئے جائیں جو مانوس ہوں یا آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔ مروجہ عربی اصطلاحات کو یک قلم ترک کر دینا اگر قرینِ مصلحت نہ ہو تو ان کے بجائے جدید آسان اصطلاحات لکھ دی جائیں اور اس نئے انتخاب میں ہندی مترادفات کو مدِنظر رکھا جائے۔ عربی بحور و اوزان قائم رہیں مگر بھاشا کے "ماترا وزن" کا استعمال بھی ناجائز نہ رہے۔ اضافت اور واو عطف کے متعلق تمام قیود اٹھا دیئے جائیں اور اُن کے استعمال کو ذوقِ سلیم پر چھوڑا جائے۔ وضعِ اصطلاحات کے قواعد ہندی کی طرح صرف و نحو کا جزو بنائے

ہیں اور ان قواعد کے مطابق الفاظ بنانے کا اذنِ عام دیا جائے (پروفیسر وحید الدین سلیم مرحوم اس بارے میں بہت کچھ کام کر چکے ہیں۔ اور اب تھوڑی سی محنت سے قواعد مرتب ہو سکتے ہیں) بھاشا کے وہ الفاظ اور ہندوؤں کے وہ محاورات جنہیں فالن اور سید احمد لغات میں داخل کر چکے ہیں یکساں تسلیم کئے جائیں۔ تذکیر و تانیث کی فرد پر نظرِ ثانی کی جائے۔ اور لاہور حیدر آباد لکھنؤ اور دہلی کے کثرت سے رواج کی بنا پر فیصلہ قرار دیا جائے مثلاً

لفظ	دہلی	لکھنؤ	لاہور	قابلِ قبول
ناک	مؤنث	مؤنث	مذکر	مؤنث
التماس	مذکر	مؤنث	مؤنث	مؤنث
رسم	مؤنث	مذکر	مؤنث	مؤنث
دسترس	مؤنث	مذکر	مؤنث	مؤنث

اس طرح جب اس اصول کو زیرِ نظر رکھ کر فیصلے طے ہو جائے تو اُس کے مطابق تذکیر و تانیث کا ایک قطعی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ زبان میں یگانگت پیدا نہ ہوگی۔ مروجہ اصول کو جانے دیجیے ہر قاعدہ کے اس قدر مستثنیات ہیں کہ سنسکرت میں بھی نہ ہونگی۔ اِس کے آسان اور جامع قاعدے نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ہر چہار مقاماتِ مذکور پر حاوی ہوں۔ اس طرح متروکات پر غور کیا جائے اور جو الفاظ ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور محض کسی ضد کے باعث گردن زدنی قرار دیئے گئے ہوں اُنہیں پھر زبان میں داخل کیا جائے۔ عربی و فارسی کے غیر مانوس و ثقیل الفاظ رخصت کئے جائیں سوائے اُن الفاظ کے جو زبان پر چڑھ گئے ہوں۔ الحاق کے لیے عربی "ال" کے بجائے اضافت سے کام لیا جائے۔

اِن خیالات کو اربابِ ذوق کے سامنے پیش کرنے میں محض خدمتِ زبان منظور ہے۔ حاشا کسی صاحب شان کی دل آزاری یا کسرِ شان مدنظر نہیں۔ ہمارے خیال میں ان تجاویز پر عمل پیرا ہونے سے زبان کا حلقہ وسیع ہو جائے گا، اس میں ہندوستان کی ملکی و قومی زبان بننے کی اہلیت زیادہ ہوگی اور تحصیلِ زبان آسان ہو جائے گی ہندو مسلم کا تفرقہ کم کرنے کا ایک زبردست آلہ ہاتھ آ جائے گا، تعصب کا عیب دُور ہو گا۔ زبان ایک سرمایۂ مشترک بن جائے گی جس کی ملکیت میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پنجابی، یوپی والے، دہلوی، لکھنوی، بنگالی، بہاری

اور دکنی وغیرہ کی تخصیص نہ رہے گی۔ اور

قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

پھر ناموری اور تفوق کا مدار قابلیت پر ہوگا اس سے آگے تفصیلات ہیں مگر کیوں اور کہاں۔ اور کیونکر کا فیصلہ کرنے کے لئے انجمن ترقیٔ اردو اور آپ کا آرگن موجود ہیں۔ "پنجاب اور اردو" کے علاوہ اور بہت سے مباحث بخوفِ طوالت رہے جاتے ہیں۔ خیر۔ لیکن اگر ان سطور کوئی فائدہ مند نتیجہ پیدا کریں تو شاید اتنا بھی ناکافی نہ ہو۔ ممکن ہے کہ جو علاج ہم نے بتایا ہے تیر بہدف نہ ہو لیکن اگر نباضان زبان اس طرف توجہ کریں تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری سعی مشکور ہوئی

"ڈرامی"

تصنیف

مصنف کا انتخاب کرو جیسے تم اپنے دوستوں کا کرتے ہو۔

اپنے دل میں دیکھ اور لکھ

مصنف کی دو زبردست قوتیں نئی چیزوں کو ہر دلعزیز اور ہر دلعزیز چیزوں کو نت نئی چیزیں بناتے رہنا ہے۔

جو مصنف بنے اس لئے کہ مشہور ہو اُس بیوقوف کی مانند ہے جو بازار میں جائے تاکہ لوگ اُسے دیکھیں

مصنف بننا چاہتے ہو تو پہلے طالب علم بنو

گلچیں

چشم

اے چشم تُو دُرِّ بے بہا ہے — تو جلوۂ قدرتِ خدا ہے
انسان کی آبرو ہے تجھ سے — دیدار کی آرزو ہے تجھ سے
بجلی کی طرح چمک رہی ہے — ہیرے کی طرح دمک رہی ہے
ہے پھول کنول کا ماند تجھ سے — شرماتا ہے دیکھ چاند تجھ سے
دو ابروئے کماں کھڑے ہیں — گویا کہ دو پاسباں کھڑے ہیں
جب تک کہ ہیں تیز تیرِ مژگاں — محفوظ ہے تیرا گنج پنہاں
آتے جو نظر ہیں چاند تارے — تیری ہی نظر کے ہیں اشارے
تُو نورِ خدا کا ایک پارہ — تُو صبحِ امید کا ستارہ
گر تُو ہے تو جینے کا مزا ہے — گر تُو نہیں، زندگی بلا ہے
کیا سیرِ جہاں دکھا رہی ہے — ہستی کا مزا چکھا رہی ہے
ہے رنگ کبھی وفا کا تجھ میں — ہے قہر کبھی جفا کا تجھ میں
کیا شے ترے جام میں بھری ہے — جادو ہے کہ سحرِ سامری ہے
مستی سے بھرا ہے جام تیرا — ہے مستِ سیاہ نام تیرا
گردش سے تری جہان پلٹا — تُو پلٹی تو آسمان پلٹا
کچھ سوز ہے کچھ گداز تجھ میں — کچھ ناز ہے کچھ نیاز تجھ میں
کتنے ترے حسن پر ہیں مائل — کتنے ہیں جہاں میں تیرے گھائل
کُشتے ہیں کئی تری حیا کے — غمزے ترے تیر ہیں قضا کے
دل چھین لیا تری ادا نے — وارفتہ کیا تری رضا نے

ناوک فگنی کہاں سے سیکھی
یہ دل شکنی کہاں سے سیکھی

مستانہ مجھے تو پھر بنا دے
پھر جلوۂ بے خودی دکھا دے

پھر پیش نظر وہی سماں ہو
پھر عیش کی رات کا گماں ہو

بچپن کی وہ مستیاں کہاں ہیں
وہ بادہ پرستیاں کہاں ہیں

کیا بھول گئیں وہ پہلی باتیں
دن عیش کے بہشتی کی راتیں

دل رنج سے جب نہ آشنا تھا
جانب سے نہ غیر کی گِلا تھا

جب دِل کو نہ تھی یہ بے قراری
تھی لب پہ کبھی نہ آہ وزاری

تاریکیٔ شب کو دُور کر دے
دامن میں سحر کا نُور بھر دے

رام پرشاد کھوسلہ ناشاد

غزل

اب وہ رنگینیٔ بہار کہاں!
آہ! وہ بزم زرنگار کہاں!

ذرے تھے تابِ حسن سے پُرنور
ہائے وہ دشتِ زرنگار کہاں!

آرزو سے رہی نہ دلچسپی
اب فریبِ وصالِ یار کہاں!

کر چکے نذر آپ دل اپنا
اب ہمیں اس پہ اختیار کہاں!

عہد و پیماں تو باندھتے ہیں وہ
بات کا اُن کی اعتبار کہاں!

کیفیت انتظار کی مت پوچھ؟
دل کو تنہائی میں قرار کہاں!

جوش لیے خیالِ خام کو چھوڑ
تو کہاں؟ اور وہ نو بہار کہاں؟

جوش

کھویا ہُوا احترام
کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

دو بھائیوں کے متعلق ایک کہانی بیان کی جاتی ہے کہ انہیں بکریاں چُرانے کے الزام میں گرفتار کر کے ایک قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ جرم ثابت ہو جانے کے بعد قاضی نے حکم دیا کہ وہ چار سال تک اُس نہر پر کام کریں جو رفاہِ عام کے لئے شہر کے باہر کھودی جارہی تھی۔ چونکہ اُس زمانہ میں جرائم کو روکنے کے لئے عبرتناک سزائیں دی جاتی تھیں تاکہ پھر کسی دوسرے آدمی کو امن عامہ میں خلل انداز ہونے کا حوصلہ نہ ہو سکے اس لئے سزا کی میعاد مجرموں کی پیشانیوں پر داغ دی جاتی تھی۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں کی پیشانیوں پر ۴ (چار)[1] کا ہندسہ داغ دیا گیا۔

سزا کی میعاد گزرنے کے بعد دونوں بھائی رہا کر دیئے گئے۔ ایک بھائی اُس ذلت کو جو اُس کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے ثبت کر دی گئی تھی برداشت نہ کر سکا اور شرم کے مارے کسی دور دراز ملک کو بھاگ گیا جہاں کے باشندے اُس کے جرم سے قطعاً ناواقف تھے لیکن افسوس وہاں بھی اُسے اطمینانِ قلب نصیب نہ ہو سکا کیونکہ اُس کی پیشانی پر چار کا عدد دیکھ کر لوگ حیران ہو جاتے پھر اُس سے اس کا سبب دریافت کرتے اور اپنی حیرانی رفع کرنے کے لئے اُس سے مختلف قسم کے سوالات کر کے اُسے پریشان کر دیتے۔ یہ سوالات اُس کے دل کو پارہ پارہ کر دینے کے لئے کافی سے زیادہ تھے۔ چنانچہ عرصۂ دراز تک وہ مختلف ملکوں میں اپنی اِس دوامی ذلت کو چھپانے کے لئے گھومتا رہا اور عنفوانِ شباب ہی میں مرکر ایک گمنام قبر میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

دوسرے بھائی کو بھی اپنی اس بے عزتی کا احساس ہُوا لیکن وہ اپنے بھائی کی طرح کمزور دل و دماغ کا انسان نہ تھا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا "میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ میں نے بکریاں چُرائی تھیں لیکن مَیں اسی جگہ رہ کر اپنا کھویا ہُوا احترام حاصل کروں گا۔"

زندگی کے دن گزرتے گئے، اُسی خاموشی اور تیزی کے ساتھ جس طرح کہ وہ گزرجانے کے عادی ہیں، اور

---

[1] عربی زبان میں ۴ کا عدد یوں ع بھی لکھا جاتا ہے۔

یہ اپنے ... ... انسان ایک شریف اور دیانتدار آدمی کی طرح اپنے دن بسر کرتا رہا - وہ نیک نیتی سے اپنے کام سرانجام دیتا اور ہر فرد بشر کے ساتھ نہایت خلوص و محبت سے پیش آتا - وہ ہر بیمار پڑوسی کی تیمارداری کرتا اور ابنائے وطن کی خدمت گذاری کو اپنا نصب العین سمجھتا - ایک دن کوئی اجنبی اُس شہر میں آیا اور بوڑھے آدمی کی پیشانی پر م کا نشان دیکھ کر اُس نے شہر کے ایک باشندہ سے دریافت کیا "کیوں جناب آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اس سفید ریش بزرگ کی پیشانی کا نشان کیا معنی رکھتا ہے؟"

یہ سنتے ہی شہری ایک گہری سوچ میں پڑ گیا پھر چند لمحوں تک سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ "یہ بہت عرصہ کی بات ہے اس لئے اس کی تفصیل تو میرے حافظہ کی پناہ میں نہیں رہی لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ حرف "علیہ السلام" کا مخفف ہے۔"

کتنا رحم آتا ہے دوسرے بھائی کی حالت پر جو تمام دنیا کی تلخی، ذلت اور رنج و غم کا احساس لئے دربدر پھرتا رہا لیکن پھر بھی اپنے جرم کو لوگوں کی آنکھوں سے پنہاں نہ رکھ سکا - جہاں کہیں وہ جاتا لوگوں کی حیرت طلب نگاہیں اس کی طرف اُٹھتیں کیونکہ انسانوں کی آنکھیں ہر نئی اور عجیب شے دیکھنے کی آرزومند ہوتی ہیں اور وہ خود ایک عجیب چیز اپنی پیشانی پر نمایاں کئے ہوئے تھا۔

دنیا میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے انسان بھاگ کر اپنی عزت و حرمت بحال رکھ سکتا ہے - مثلاً کسی شخص کے پڑوسی یا ابنائے وطن غیر منصفانہ طور پر اُس کے خلاف ہوں اور یہ مخالفت نتیجہ ہو ناواقفیت یا عقل سوز تجارتی، مذہبی یا معاشرتی تعصب کا تو وہ دیگر محلہ یا ملک میں نقل مکان یا ہجرت کر سکتا ہے اور وہاں اپنی قسم کے لوگوں میں اتنی ہی مسرت یا خوشی حاصل کر سکتا ہے جس کا کہ وہ اپنی خصلت یا عادت کے سبب حقدار ہو - اس حالت میں اس نے اپنی شہرت کے سوا کچھ نہیں کھویا، اُس کی حرمت اور عزت نفس اُس کے ساتھ ہے۔

اگر اُس نے ذاتی اغراض یا نفس پرستی کے جذبات سے مجبور ہو کر کوئی ایسا فعل کیا ہے جس سے اُس کی شہرت اور ذاتی احترام بھی کھو گیا ہو تو اُس حالت میں بھاگ جانا بُرے حالات کو بدترین صورت میں تبدیل کر دیگا —— کون نہیں جانتا کہ اس محدود دنیا میں ضمیر کے کچوکوں سے بچنا ازبس محال و ناممکن ہے۔

اگر ایسا شخص کسی ہمسایہ ملک میں بھاگ کر چلا جائے اور وہاں اپنی عزت اور وقار قائم کر لینے میں کامیاب بھی ہو جائے تو دو خدشے ہر وقت اُس کی جان کھاتے رہیں گے۔ اول، یہ خوف کہ اُس کا کوئی واقف حال دنیا اُس کے گذشتہ حالات سے لوگوں کو واقف نہ کر دے - دوم، اس بات کا احساس کہ وہ بزدل اور کمزور ہے اور وہ لوگ

ابھی تک اُسے نفرت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن سے بھاگ کر آیا تھا۔

کیا کوئی شکست خوردہ پہلوان اُس وقت تک اپنا کھویا ہؤا احترام حاصل کرسکتا ہے تاوقتیکہ وہ اسی جگہ اُسی آدمی کو پچھاڑ نہ دے جس نے اُسے ذلت آمیز زک دی تھی؟ محمد غوری کی سپاہ نے ۱۱۹۱ء میں جب تراوڑی کے میدان میں شکست کھائی اور اُن سپاہیوں کے ساتھ جو میدان جنگ سے فرار ہوگئے تھے، جو سلوک ہؤا اُس کا حال تاریخ دان طبقہ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ جَو کے توبرے اُن کے منہ کے ساتھ بندھوا کر غور کے بازاروں میں انہیں پھرایا گیا۔ گویا وہ انسان نہ تھے گدھے تھے لیکن دو سال بعد جب انہیں ہزیمت خوردہ سپاہیوں اور سرداروں نے ۱۱۹۳ء میں پانی پت کے میدان میں پرتھی راج اور اُس کے تمام مددگاروں کی افواج کو شکست دے کر اسلامی حکومت ہندوستان میں قائم کردی تو وہی ذلیل گدھے بادشاہ کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے تھے ــــ گم شدہ چیز اسی جگہ تلاش کی جاسکتی ہے جہاں دکھوئی گئی ہو۔ تراوڑی میں اپنی سپاہیانہ حرمت کھو کر غور میں تلاش کرنا نہ صرف غیر ممکن ہے بلکہ جنون کا اظہار ہے۔

اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور یاد رکھو کہ جمہور کا حافظہ نہایت کمزور ہے، اس لئے نہیں کہ اُن کے دماغ کمزور ہوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ غیروں کی شہرت و احترام کے متعلق وہ زیادہ دیر تک اپنے دل و دماغ کو پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ اس زمانہ میں جب ہر شخص قوت لایموت کی الجھنوں میں الجھا ہؤا ہے۔ ٹھنڈی راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریاں تلاش کرنے کے لئے کسی کے پاس بھی وقت نہیں اس لئے کھویا ہؤا وقار حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں آج کی رائیں آج کے تاثرات پر قائم کی جاتی ہیں کل کے تاثرات پر پھر نئی آرا قائم ہونگی۔

اگر ایک بدنام کھلاڑی مقابلہ کی دوڑ میں جیت جائے تو بہت کم لوگ ہونگے جو اُس کی گذشتہ ناکامیوں کا تذکرہ کریں گے اور اُن میں بھی زیادہ تعداد اُن حاسدوں اور دشمنوں کی ہوگی جو بلا وجہ اُس کے ساتھ حسد اور دشمنی رکھتے ہیں اور ایسے کم عقل لوگوں کی کسی زمانہ میں بھی کمی نہیں رہی۔ جب بغداد کا مشہور چور ابن ساباط بغداد ہی میں رہ کر ایک عالم باعمل اور متقی و پرہیزگار انسان بن سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اور ہم اپنے وطن میں رہ کر اپنے قصور کی تلافی نہ کرسکیں۔

(ماخوذ)

محمد ضیاء الدین شمسی

تجلّیات

(۱)

سما گیا ہے کچھ ایسا مری نگاہ میں حسن
کہ جیسے نالوں میں ہے حسن تیری آہ میں حسن
مثالِ حسن کی دنیا میں ہے آپ اپنی
ترے عتاب میں ہے حسن تیری چاہ میں حسن

(۲)

تری نگاہ سے سرشتۂ فنا بنتے ہیں
میں مرد [illegible] سے نقشِ قضا بنتے ہیں
چمن کے خون سے رنگین ہیں انکھڑیاں تری
وہ کارگاہِ محبت حنا جو بنتے ہیں

(۳)

ترے جمال کی رنگینیوں کا شیدا ہوں
ترے کمال کی خود بینیوں کا شیدا ہوں
یہ واہ واہ جو کرتا ہوں لطف لے لے کر
ترے ہی حسن کی نمکینیوں کا شیدا ہوں

(۴)

کمالِ حسنِ ازل کا ظہور ہے عالم
ضیائے یار کی آغوشِ نور ہے عالم
بس ایک نور ہے جو شش جہت میں پھیلا
رہا سمٹ کے جو ہم میں تو طور ہے عالم

امین حزیں

تجربات

(۱) دنیا میں صرف ایک ہی چیز یقینی ہے ۔ موت

(۲) ایک فقیر سے کسی نے پوچھا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔ اُس نے جواب دیا "مرنا سچ اور جینا جھوٹ"

(۳) ہر شخص کی زندگی میں ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ موت کی خواہش کرتا ہے بعض بن چلے تو اس گھڑی جان پر کھیل جاتے ہیں اور بعض نامعلوم عواقب کے خوف سے زندہ درگور زندگی بسر کرنے پر ہی قناعت کرتے ہیں۔

(۴) خودکشی پر دو مختلف پہلوؤں سے نگاہ ڈالی جا سکتی ہے :۔

الف ۔ یہ سراسر بزدلی ہے کہ تکالیف سے گھبرا کر موت کی پناہ ڈھونڈی جائے۔ ہمت و مردانگی کا تقاضا ہے کہ مصائب و حوادث کا مقابلہ کرکے مخالف قوتوں کو زیر کیا جائے ۔

ب ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دلیری ہو سکتی ہے کہ انسان اپنی جانِ شیریں کا خاتمہ خود اپنے ہاتھ سے کردے ۔ بے وقار زندگی سے مرجانا بہتر ہے۔

(۵) موت مرنے والے کے لئے پیغامِ راحت ہے اور پس ماندگان کے واسطے نزولِ بلا۔ ہم اس لئے نہیں روتے کہ مرنے والا جہان سے گذر گیا۔ ہم تو ان نقصانات پر روتے ہیں جو اُس کی موت سے ہمیں برداشت کرنے پڑیں گے۔

آہ خود غرض و ظاہر دار انسان!!!

(۶) اگر ہماری زندگی دنیا ہی میں ختم ہو جاتی اور مصائب کا کلی خاتمہ موت کے ہاتھوں ہو سکتا تو نوے فیصدی لوگ موت کی ہم آغوشی پر آمادہ ہو جاتے۔ مگر پہلی بات یقینی نہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے ــــ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(۷) فلسفیوں میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ جہانِ آب و گل سراسر دھوکا اور فریب ہے۔ اس کے دام میں آجانا جہالت ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے یہی سب کچھ ہے۔ لذائذ حیات سے خوب جی بھر کر متمتع ہو لو کیسی حماقت ہے کہ موہوم چیز کی امید پر جس کا سرے سے وجود ہی نہیں، ہم دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اُس شخص سے زیادہ بیوقوف کون ہوگا جو دریا سے پیاسا واپس آجائے؟

بعض نے میانہ روی اختیار کی ہے۔ وہ کہتے ہیں نہ یہ دھوکا ہے نہ وہ جھوٹ۔ یہ چند روزہ زندگی تیاری ہے

اُس حیاتِ جاوداں کے لئے جہاں نہ موت ہے نہ اختتام۔ زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک سمندر ہے جس کا کنارہ نہ ہو
ایک تسلسل ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ تکمیلِ حیات کے لئے موت کے دروازہ سے گذرنا ضروری ہے

موت اِک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یا

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

(۸) انسان دنیا میں آتا ہے تو سینکڑوں کو ہنساتا ہے۔ جاتا ہے تو سینکڑوں کو رلاتا ہے۔

(۹) ہم دنیا میں آتے ہوئے بھی روتے ہیں اور جاتے ہوئے بھی۔

(۱۰) جس چیز سے مفر نہ ہو اُس سے ڈرنا حماقت ہے۔ موت سب کے لئے یقینی ہے۔

(۱۱) موت کے سامنے شاہ و گدا برابر ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ جس کی آخری گھڑیاں اطمینان سے گزریں۔

(۱۲) تم قبر کے عذاب سے ڈرتے ہو اور وہ جنہیں زندگی میں عذابِ قبر سے واسطہ پڑ گیا کہاں جائیں؟

(۱۳) موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کب آ جائے۔

(۱۴) ہر شے کی ابتدا و انتہا ہے۔ کل من علیہا فان

(۱۵) لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

عاشق بٹالوی

مسرت ۔ آہ میں تجھے کن لفظوں میں یاد کروں تیرا نام بھی میرے لئے اجنبی ہو چکا ہے۔ افسوس میں نے تیری بہت ناقدری کی مجھے تیری موجودگی میں تیرا کچھ احساس نہ ہوا۔ میری مثال اُس اندھے کی طرح تھی جو شب کی سیاہی اور صبح کی سفیدی میں کچھ تمیز نہیں کر سکتا۔ لیکن آہ جب تو مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی اور غم کا تاریک بادل میرے دل پر چھا گیا۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تیری موجودگی میں مجھے کس قدر راحت اور اطمینان نصیب تھا۔ تیرے پرتو سے ہر ایک چیز مجھے کس قدر مسرور و شاداں نظر آتی تھی۔ ایک ایک ذرہ مجھے خوشی سے رقص کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ دنیا اب بھی وہی ہے۔ وہی چاند وہی سورج وہی گلشن، ساری کائنات وہی ہے لیکن تو نہیں اس لئے یہ سب چیزیں مجھے بے جان اور افسردہ نظر آتی ہیں۔ میں نے تجھے چھوڑ کر اپنا سب کچھ کھو دیا وہ پہلا سا سکون نہ اطمینان اب مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا میری آنکھیں تیرے لئے خون کے آنسو روتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
لیکن اب وہ تجھے دیکھنے کی آرزو مند نہیں کیونکہ میرا دل اب تجھ سے ناآشنا ہو چکا ہے

گمنام

To Mother

اپنی ماں سے

ذیل کی نظم میری نوعمر عزیزہ ممتاز جہاں صاحبہ کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے + عزیزہ موصوفہ جو میاں محمد شاہ نواز صاحب بیرسٹر ایٹ لا ممبر لیجسلیٹو اسمبلی کی بیٹی اور جناب میاں سر محمد شفیع صاحب بیرسٹر ایٹ لا کی نواسی ہیں چند ماہ ہوئے پنجاب کے میٹریکیولیشن کے امتحان میں درجہ اول میں کامیاب ہوئیں + ددھیال اور ننھیال کی جودت و ذکاوت کا جو حصہ اس شانزدہ سالہ خاتون نے پایا ہے اور جس طرح ان کی خداداد طبیعت اور ان کے دل و دماغ نے اُسے جلا دی ہے اُس کا اندازہ ہمارے ناظرین ایک حد تک اس نظم سے کر سکتے ہیں جس میں یہ اپنی والدہ کو خطاب کرتی ہیں + ہر چند کہ وہ تعارفِ عام سے گریز کرتی ہیں تاہم مجھے امید ہے کہ اپنی مفروضہ نام نہاد "بزرگی" کا فائدہ اٹھا کر میں اُن کی بعض بلند تر نظموں کو آئندہ ناظرین ہمایوں کے سامنے پیش کر سکوں گا۔

Kind Sweet, unselfish as thou art,	نرم و نازک پُر محبت نیک دل جانِ وفا
	اے مادرِ شیریں ادا!
Accept the tribute of my heart,	آ دے لے تحفۂ ناچیز میرے پیار کا
Mother!	اے مادرِ شیریں ادا!

With thy silver soul divine,	اپنے اُس دل سے حقیقت کی ہے جس کو جستجو
And those God-filled eyes of thine,	حق آشنا آنکھوں سے تُو
Light this darkened life of mine,	کر منور زندگی کا جادۂ ظلمت مرا

English	Urdu
Mother!	اے مادرِ شیریں ادا!
With might of dewy, silent tears,	ان خموش و شبنمیں اشکوں کے لطف و درد سے
Shed through the sorrows of dim years,	جو مدتوں بہتے رہے
Mother!	میرا ایماں پاک کر اور رام کر دے دل مرا
Sooth my rebel heart when aching,	اے مادرِ شیریں ادا!
Calm my faith with terror shaking	ٹوٹ کر دنیا مری اُف ذرہ ذرہ ہو نہ جائے
Hold my world to atoms breaking.	گوہر یہ تیرا کھو نہ جائے
	تھام لینا تھام لینا میری دنیا کو ذرا
Mother!	اے مادرِ شیریں ادا!
With beauty of thy love so pure,	اپنی بے باک و بلند الفت کے سوز و ساز سے
That through the ages will endure,	ہمدردیٔ پرواز سے
Mother!	چوٹیوں پر دور یا تاروں میں تو لے چل مجھے
Lead me to the glorious heights,	دور ان تاریک راتوں سے مجھے لے چل ذرا
Lead me to the starry lights,	اے مادرِ شیریں ادا!
ar away from moonless nights,	

اے مادرِ رنگیں نوا!

ٹوٹتے ہیں زندگی کے مجھ پہ طوفاں ہر طرف
آہ ماں منڈلا رہے ہیں یاس و حرماں ہر طرف
دردِ الفت کے مرے چہرے پہ تو آنسو بہا
سر مرا سینہ پہ رکھ اور پیار سے مجھ کو سُلا
بھول جاؤں تا ترے سائے میں سب جَور و جفا
اے مادرِ شیریں ادا!
اے مادرِ رنگیں نوا!

زندگی بھر شمع ہو میرے لئے چاہت تری
لاکھ رنج و غم میں ہو چاہت تری راحت مری
شمعِ الفت سے چمک اُٹھے تری سینہ مرا
تیری الفت ہو تو ہو دل میرا گردوں آشنا
تیری الفت ہو تو مل جائے مجھے میرا خدا
اے مادرِ شیریں ادا!
اے مادرِ رنگیں نوا!

بشیر احمد

Mother!

The storms of life are breaking, see
I bring my restless heart to thee,
Mother!
Soothing tears upon me shed,
Rest upon thy breast my head,
Till my pain and fear have fled,
Mother!

Thy love shall be my light through life,
Thy love shall help me win this strife,
Mother!
With thy love my soul shall fly,
To the vast and azure sky,
Reach at last my God on high,
Mother!

MUMTAZ JAHAN.

مصوّر کا شہکار

مجھے اپنی زندگی کچھ اس درجہ مرغوب و پسند ہے کہ کبھی کسی دوسرے کی زندگی پر مجھے رشک ہوا نہ حسد۔ البتہ رافت اور صرف رافت کی زندگی نے ایک نئے جذبات رشک سے آشنا کر دیا۔

رافت سے میری پہلی سرسری ملاقات کانپور کے اسٹیشن پر اتفاقیہ ہوئی تھی۔ لیکن خدا جانے اُس ہستی میں کس بلا کی کشش اور جاذبیت تھی کہ گو تھوڑی دیر میں اپنے ذہن سے کبھی فراموش نہ کر سکا۔ میں نے رافت سے یہ بھی نہ دریافت کیا کہ اُس کا وطن کہاں ہے؟ میری بے نیازی کا یہ ایک بین ثبوت ہے لیکن رافت سے ملنے کی میرے دل میں ایک خلش تھی اور یہ خلش میرے استغنا کی مستقل توہین تھی۔ میں نے اُس کو دل سے بھلا دینا چاہا مگر میری ہر جدوجہد و کوشش نے ردِ عمل کی صورت اختیار کر کے اور بھی مشتاق بنا دیا۔ اور کسی طرح اُس کا خیال دل سے نہیں جاتا تھا۔ میں بہت خوش تھا کہ اگر اُس کی یاد میرے استغنا کے منافی ہے تو وہی شانِ بے نیازی اُس کی تلافی کا وسیلہ بن گئی یعنی رافت سے ملنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے میں اس کا قائل نہ تھا لیکن واقعات اور مشاہدات کو کیا کیجئے کہ جن کا واحد مقصد اجتہادِ قیاسی کی تردید کرنا ہے۔

رافت سے اس ملاقات کے پورے ایک سال بعد کسی ضرورت سے میرا باندہ جانا ہوا۔ جب گاڑی ہمیر پور پہنچی تو میں نے رافت کو ایک چرمی بیگ ہاتھ میں لئے گاڑی کے انتظار میں کھڑا دیکھا۔ مجھے اس اتفاق سے بہت مسرت ہوئی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ واقعی بہت جذباتِ دل کی کشش کا ایک معجز نما کرشمہ ہے۔ مگر میں نے شانِ تغافل کا پاس کرتے ہوئے خود اُس سے ملنے میں پیشقدمی نہیں کی۔ اُس نے ایک اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی اور میری ہی گاڑی میں داخل ہوا۔ ایک طرف بیگ رکھ کر اُس نے ٹوپی اتاری اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک طائرانہ نظر مسافروں پر ڈالتے ہوئے رافت نے مجھے پھر دیکھا اور پوچھا "آپ ہیں! اخوشا قسمت" یہ کہہ کر مجھ سے بہت گرمجوشی سے ملا۔

مجھے اپنی بے نیازی اور تغافل سے نادم نہ ہونے پر بہت مسرت ہوئی اور پھر تو میں رافت سے بہت جلد بے تکلف ہو گیا۔ شوقِ ملاقات کے اظہار کے بعد میں نے اجمالاً اُس کے حالات معلوم کر لئے۔ اُس کا وطن مہوبا تھا اور وہ وہیں جا رہا تھا جب تک باندہ نہیں آیا بہت دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ باندہ کے اسٹیشن پر ہم دونوں اُترے۔ میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے کہ ہماری یہ پُرلطف ملاقات بہت جلد ختم ہو گئی۔"

رافت نے نہایت متانت آمیز تبسم کے ساتھ کہا "دنیا کی ہر شے کا یہی انجام ہے"

میں نے کہا "یہ سچ ہے مگر کیا کروں مجھے اس ملاقات سے سیری نہیں ہوئی"

اُس نے ہنس کر جواب دیا "سیری نہ ہونا ہی لطف دوستی کا باعث ہے"

میں نے جواباً کہا "آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے لیکن ....

"دخل درمعقولات سے معاف فرمائیے گا۔ مجھے کچھ عرض کرنا ہے" اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"فرمائیے" میں نے جواب دیا۔

رافت نے کہا "میں آپ کی ذرہ نوازی سے ایک جائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں اگر آپ منظور کریں"

میں نے مجبوراً اپنی عادت کے خلاف عدم امکان کی وسعت پر خیال کرتے ہوئے کہا "بسر و چشم۔ ارشاد"

رافت نے کہا "جب آپ یہاں سے رخصت ہونے لگیں تو کم از کم دو تین روز کے لئے غریب خانہ پر تشریف کر مجھ کو ممنون ہونے کا موقع دیجئے۔

ہر چند میرے پاس کافی وقت تھا مگر ذاتی اہمیت کے نفسی مسئلہ پر غور کرتے ہوئے میں نے جواب دیا "فرصت تو نہیں مگر آپ کی نوازش اور عزت افزائی نے مجبور کر دیا۔

شکریہ ادا کرتے ہوئے رافت نے دریافت کیا "یہاں آپ کتنے دن قیام فرمائیں گے؟"

میں نے کہا "بمشکل تین دن ٹھیروں گا"

رافت نے زیرلب کچھ حساب لگاتے ہوئے مجھ سے کہا "تو آپ شنبہ کو تشریف رکھیں گے؟"

میں نے کچھ توقف کر کے جواب دیا "انشاء اللہ"

اس مختصر گفتگو کے بعد میں رافت سے رخصت ہو کر شہر چلا گیا۔ رافت کی سادہ زندگی، بے لوث خلوص، ہمہ گیر محبت، استغنا، علمی ذوق اور گفتگو کے موثر لیکن نرالے انداز نے مجھے اور بھی گرویدہ بنا لیا۔ اور اس امر کے انکشاف نے کہ وہ بھی میرا مشتاق تھا جس کی صحت و صداقت اُس کی گفتگو اور چہرہ کے تاثرات و انداز سے ہوتی تھی، مجھے اس مقولہ کا قائل کر دیا کہ واقعی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے

کام سے فراغت پانے پر میں شنبہ کو ہوا پہنچا۔

رافت کی قیام گاہ قصبہ سے الگ ایک خوش منظر اونچی پہاڑی کے دامن میں ایک باغیچہ اور صرف تین کمروں پر مشتمل تھی۔ بڑا کمرہ باغیچہ کے وسط میں ایک مستطیل چبوترے پر تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک میں خواب گاہ تھی

جس میں ایک طرف ایک پلنگ بچھا تھا اور دوسری طرف ایک چٹائی کے اوپر ہرن کی کھال بچھی تھی۔ قبلہ رخ دیوار میں ایک الماری تھی جس کے اوپر کے درجہ میں چند کتابیں، دوسرے درجہ میں چرمی بیگ، آئینہ کنگھا اور تیل کی دو خوبصورت شیشیاں رکھی تھیں۔ کمرہ کے دو رخوں پر دو دروازے اور تین کھڑکیاں تھیں۔ تیسری جانب ایک بڑی کھڑکی تھی چوتھی طرف ایک دروازہ دوسرے حصہ میں جانے کا تھا۔ دوسرے حصہ کو ملاقات کا کمرہ کہئے یا چھوٹا سا کتب خانہ۔ طول میں یہ خواب گاہ سے بڑا تھا۔ اس کے دو رخوں پر کھڑکیوں کی بجائے دو خوشنما الماریاں دیوار کے اندر بنی ہوئی تھیں ہر ایک الماری کے پانچ پانچ خانے تھے۔ چاروں الماریوں میں اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی زبان کی مختلف علوم پر چیدہ چیدہ کتابیں حسن ترتیب سے چنی تھیں۔ الماریوں کے بیچ میں ایک ایک دروازہ تھا۔ تیسری دیوار میں ایک کھڑکی اور اس کے دونوں طرف دو الماریاں تھیں۔ ایک میں مصوری کا پورا سامان احتیاط سے رکھا تھا۔ اور دوسری میں بھی کچھ مصوری کا سامان قلم دوات، قلم تراش اور چند اقسام کے رنگین و سفید کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ الماریوں کے پہلوؤں پر مختلف قدرتی مناظر کی تصویریں لگی تھیں۔ نیچے چٹائی کا پورا فرش تھا جس پر موٹے کھدر کی ایک صاف چاندنی بچھی تھی۔ دونوں حصوں کے چاروں طرف پھوس کا برآمدہ تھا جس کے اوپر مختلف بیلیں خوب پھیلی اور چھائی ہوئی تھیں۔ پھول اور پتیوں سے کہیں پھوس نظر نہ آتا تھا۔ برآمدہ کے آگے کھلا ہوا چبوترہ تھا۔

اس چبوترے کے آس پاس مختلف خوشنما پھولوں کی کیاریاں تھیں جن کے کنارے روشیں بنی تھیں کیاریوں کے بعد چاروں طرف ترتیب اور تناسب کے ساتھ پھلوں کے درخت قطار در قطار لگے تھے۔ بڑے کمرے کے چپ و راست کیاریوں کے بعد دو کمرے تھے۔ راست جانب والے کمرے کے بھی دو حصے تھے ایک میں باورچی خانہ تھا اور دوسرا کھانا کھانے کا کمرہ تھا۔ ان دونوں حصوں میں بہت ہی مختصر لیکن ضروری سامان تھا۔ دوسرے کمرے میں باغبانی وغیرہ کا سامان رکھا تھا تینوں کمروں کی عمارت بہت سادہ تھی اور غیر ضروری نمائشی آرائش کا کہیں وجود نہ تھا۔

پھلوں کے درختوں کے بعد ایک دو بیگہ زمین میں مختلف ترکاریوں کے چھوٹے چھوٹے کھیت تھے اور باغیچہ کے چاروں طرف خاردار سرسبز گھنی جھاڑیوں کا جنگلہ تھا۔

پہاڑی سے ایک چھوٹا شفاف چشمہ جاری تھا جو باغیچہ میں پیچ در پیچ گھومتا، لہراتا ہوا سامنے والے بڑے تالاب میں غائب ہو جاتا تھا۔

یہ تھی رافت کے انہماکات کی مختصر لیکن دلچسپ دنیا۔ چپہ چپہ میں شعریت اور رومان نظر آتی تھی ہر چیز اور ہر بات میں سادگی تھی۔ قدرت کا بھولاپن اور کائنات کی دلفریبیاں ہر شے میں جلوہ نما تھیں۔

رافت کی دلچسپی اور انتہائی انہماک کا ثبوت مجھے اس امر سے ملا کہ اُس نے باغیچہ کی ہر ایک شے اور ایک ایک درخت اور پودے کے فرداً فرداً حالات مجھ سے بیان کئے اور بیان کرتے وقت اُس کا چہرہ شادمانی و مسرت سے دمک اُٹھتا تھا۔

وہ مجھ سے اس درجہ خلوص و محبت سے پیش آیا کہ اس سے پہلے میرے خیال میں بھی یہ نہ آتا تھا کہ دنیا والوں میں بھی ایسا خلوص و انس ہو سکتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ باغیچہ کے قریب جو غربا اور عوام کا طبقہ رہتا تھا رافت اُن سے بھی ہمیشہ ویسے ہی خلوص و محبت سے پیش آتا تھا۔

رافت ایک کشیدہ قامت، متناسب الاعضاء، خوش رو، چھریرے بدن کا نوجوان تھا۔ اس وقت اُس کی عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔ اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تنہا رہتا تھا۔ باغبانی وغیرہ کے کاموں میں اُس کے دیہاتی بھائی شریک و سہیم رہتے تھے اور جو کچھ ترکاریوں وغیرہ سے آمدنی ہوتی تھی وہ انہیں لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اُس کی ذاتی ضروریات بہت ہی مختصر تھیں۔ باغیچہ کی مصروفیت کے علاوہ رافت کی دو اور بھی دلچسپیاں تھیں۔ ایک مطالعہ کتب اور دوسری مصوری۔ مصوری میں اُسے کمال حاصل تھا۔ اُس کے مختصر کتب خانہ کی دیواروں پر جو تصویریں لگی تھیں وہ اس کی مصوری کا بہترین نمونہ تھیں۔

ایک دن ہم دونوں اسی کتب خانہ میں بیٹھے مختلف بحثوں پر گفتگو کر رہے تھے کہ مصوری کے موضوع پر بات چیت ہونے لگی۔ رافت نے فنِ مصوری پر ایک بسیط اور مدلل تقریر کی۔ اُس نے بیان کیا کہ فنونِ لطیفہ میں مصوری و نقاشی کا کیا رتبہ ہے۔ اُن کا احاطہ کس قدر وسیع ہے۔ اس فن میں کیا کیا نکات اور خوبیاں ہیں۔ مصوری کو شاعری پر کہاں تک فوق حاصل ہے۔ زمانہ قدیم میں اس فن نے کس قدر نشوونما پائی اور قرونِ وسطیٰ میں کس قدر تکمیل کی۔ دنیا کی کون کون قوموں نے کیا کیا صنعتیں مصوری میں ایجاد و اختراع کیں اور اُن کو کہاں تک کمال پر پہنچایا۔ مشرقی اور مغربی مصوری میں کیا فرق و امتیاز ہے۔ چینیوں نے اس فن میں کیا کیا کمالات حاصل کئے۔ ایرانیوں اور ہندیوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں۔ عہدِ مغلیہ میں اس فن نے ہندوستان میں کس قدر ترقی کی۔ قدیم یونان، روم اور مصر کے مصوروں اور نقاشوں نے کس درجہ اس میں کمال حاصل کیا۔ اور پھر عہدِ حاضر میں یورپ نے کیا کیا ترقیاں اس فن میں کیں۔ آخر میں مختصر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے اُس نے مصوری اور نقاشی کے مستقبل پر روشنی ڈالی۔ میں حیرت و استعجاب سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا کہ اس شخص کو اس فن میں کس درجہ عبور اور تبحر حاصل ہے۔

تقریر ختم کرنے کے بعد رافت نے کمرہ کی تصویریں اتاریں اور ہر ایک تصویر کو دکھا دکھا کر اُن کے نکات، باریکیاں اور

خوبیاں بیان کرنا شروع کیں۔ میں مجسمۂ حیرت بنا ہوا کانوں سے اُس کے سامعہ نواز الفاظ سن رہا تھا اور آنکھوں سے اُن باصفا فروز قدرتی مناظر کو جنہیں ایک انسان کے بہترین تخیل نے معمولی قلموں کے ذریعہ سے اپنی انگلیوں کی جنبشوں سے اور زیادہ حسین بنا کر ہمیشہ کے لئے کاغذی پیراہن میں زندہ کر دیا تھا دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اُن تصاویر کو دکھا چکا تو اُس نے ایک الماری کھولی اور تصویروں کا ایک خوشنما مرقع نکالا اور "میری ساری زندگی کا سرمایہ صرف یہ مرقع ہے" یہ کہہ کر اُس نے وہ مرقع میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں کل چوبیس تصویریں تھیں۔ میں ایک ایک تصویر کو دیکھ رہا تھا اور خود عالمِ تحیر میں تصویر بنا ہوا تھا۔

رافت شادمانی کی تصویر بنا ہوا تبسم کے ساتھ کبھی مجھ پر نظر ڈالتا تھا اور کبھی ان تصاویر پر۔ اس مرقع میں زیادہ تر تصویریں قدرتی مناظر کی تھیں۔ باغچہ کے مختلف حصص کے مختلف مناظر اور قرب وجوار کے دیگر پُرفضا مقامات کی بھی تصویریں مرقع میں شامل تھیں کئی تصویروں میں دیہاتی زندگی کے بہترین نمونے دکھائے تھے۔ صبح شام اور چاندنی راتوں کے منظروں کے ساتھ مختلف نسائی جذبات اور دلی تاثرات کو بحسن وکمال نمایاں کرتے ہوئے صنفِ نازک کی کئی اعلیٰ تصویریں کھینچی گئی تھیں جن میں امید، وفا، محبت، فراق، رشک اور معصومیت کے اعلیٰ ترین تخیل کے بہترین نقوش صفحۂ قرطاس پر نظر آتے تھے۔ چند روحانی تصویریں بھی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد میری نظر ایک تصویر پر پڑی۔ یہ تصویر ایک خوش نما لفافہ میں رکھی تھی۔ میں نے اُسے اُٹھایا اور رافت کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرہ پر اس تصویر کے اٹھانے سے پہلے تو عجیب متذبذب کیفیات نمایاں ہوئیں۔ پھر چند لمحات میں ان کیفیات نے نیا رنگ اختیار کر لیا۔ اُس کے لبوں پر تبسم تھا لیکن مصنوعی۔ آنکھوں سے حسرت وشوق کے جذبات نمایاں تھے۔ چہرہ پر رنج ومسرت کے خفیف آثار ساتھ ساتھ ظاہر ہو رہے تھے۔ مجھے رافت کے اس تغیر پر تعجب ہوا اور تصویر کے دیکھنے کا اشتیاق بڑھ گیا۔ میں نے لفافہ سے تصویر نکالی۔ تصویر کے اوپر باریک گلابی ابری کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے ابری کو ہٹا کر تصویر کو دیکھا۔ تصویر کیا تھی رافت کا شہکار اور مصوری کا اعجاز تھا۔ پہاڑی منظر دکھایا تھا۔ ایک اونچی پہاڑی سے چشمہ نکل کر اُس کے دامن میں بہ رہا تھا۔ چٹانوں پر سبزہ کا فرش تھا کہیں کہیں جنگلی بوٹیوں کے پھول نظر آ رہے تھے چشمہ کے کنارے ایک درخت لگا تھا۔ اُس کی شاخ پر کوئی پرند بیٹھا تھا۔ آسمان پر گہرے گہرے بادل چھائے تھے۔ چاند کا کچھ حصہ سیاہ بادل کے ٹکڑے میں چھپ گیا تھا۔ چاندنی چھٹکی تھی۔ درخت کے سامنے چشمہ کے دوسرے کنارے پر ایک سرو قد دبلی پتلی نوجوان عورت کالی ساڑھی باندھے شفاف رواں پانی میں پاؤں ڈالے ایک پتھر پر عجیب دلفریب انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ پانی میں [illegible] مہتاب کا انعکاس [illegible] پر لوٹ رہا تھا۔ لمبے لمبے سیاہ بال اُس کے شانوں پر بکھرے

سر کے اوپر سے ساڑھی سرک گئی تھی۔ کتابی چہرہ تھا۔ رخساروں اور لبوں پر ہلکی سرخی دوڑی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اُس کی نظریں نیچے پڑ رہی تھیں۔ سیدھا ہاتھ دل پر تھا اور دوسرے ہاتھ کا بازو کہنی سے کچھ اوپر سیدھے ہاتھ کے پنجے سے ملا ہوا تھا۔ تین سبک انگلیاں بائیں رخسارہ پر تھیں اور چھنگلی لبوں کے کونہ پر۔ اور انگوٹھا زنخداں والی ہڈی کے نیچے لگا ہوا تھا۔ زیوارت سے سارا جسم بھرا تھا۔ چہرہ پر غم کے آثار نمایاں تھے لیکن غور کرنے سے اُن میں امید کی ایک ہلکی جھلک نظر آتی تھی۔ آنکھوں سے حسرت اور انتظار کی کیفیات ہویدا تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کی یاد میں اُس کا دل تڑپ رہا ہے۔ عجب پرکیف اور موثر سماں دکھایا تھا۔ تصویر کے نیچے عربی خط میں سنہرے حرفوں سے "الفت" بہت خوشخط لکھا ہوا تھا۔

میں بہت دیر تک مبہوت بنا اس تصویر کو دیکھا کیا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اُس وقت جب کہ میں اس طرح تصور کے دیکھنے میں مدہوش تھا، رافت کے چہرہ پر کیا کیا اثرات مرتب ہوتے رہے۔ تصویر سے یکبارگی نظر ہٹا کر میں نے رافت سے کہا "الفت کی بجائے فراق کیوں نہ لکھا؟"

رافت نے اپنے چہرہ کو متبسم بنا کر کہا "پھر بتاؤں گا"

میں نے کہا "بہتر" اور اُس کے اس جواب نے خدا جانے کیا کیا اور خصوصیات پیدا کر دیں کہ میں پھر دوبارہ تصویر کے دیکھنے میں محو ہو گیا۔

"رافت!" میں نے کہا "آپ کا کمال اور ارفع تخیل میری تعریف و توصیف سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ اُن کی تعریف کرنا آپ کی توہین کرنا ہے۔ مگر مجھے افسوس اور حیرت ہے کہ ایک ایسی یکتا سرمایۂ ناز ہستی اس طرح ایک گوشۂ گمنامی میں اپنی زندگی بسر کرے۔"

رافت یہ سُن کر ہنسا اور کہنے لگا "بھائی کیا کہوں مجھے کچھ ایسی ہی زندگی میں سکون اور راحت نصیب ہے۔ دولت و حشمت اور جاہ و شہرت کی ہوس انسان کو زندگی کے صحیح نصب العین، حقیقی مقاصد، سچی مسرت اور پاکیزگی سے بہت دور لے جا کر گناہوں اور غموں کے خوفناک غار میں گرا دیتی ہے اور وہ شخص زندگی کی بہترین نعمتوں کو کھو بیٹھتا ہے کہ اکثر اوقات اُس کی زندگی اُس کے لئے ایک ناقابلِ برداشت بار ہو جاتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں؟ میری مصوری پر جو آپ نے اظہارِ خیال کیا یہ محض آپ کا حسنِ ظن ہے۔ یہ تصویریں جو آپ نے دیکھیں یہ تو محض مصوری کا ایک بہت معمولی کھیل ہے۔ اصل مصوری اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔" آخری جملہ کو ختم کر کے اُس نے فوراً روئے سخن بدل کر مجھ سے کہا "خیر چلئے اُس سامنے والی پہاڑی پر چلیں۔"

میں بغیر کچھ کہے اُس کے ساتھ ہولیا۔ میری نگاہوں میں وہی الفت کی تصویر پھر رہی تھی اور اس میں اس درجہ محویت تھی کہ میں رافت کی گفتگو پر تنقید نہ کرسکا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رافت کی زندگی "الفت" کی تصویر کے ساتھ یقیناً کوئی تعلق رکھتی ہے اور یہی اُس کی زندگی کا راز ہے اور اس راز کو معلوم کرنے کے لئے میں بہت بے چین اور مضطرب تھا۔

ہم دونوں باغیچہ سے ہوتے ہوئے چشمہ کے کنارے کنارے چلے۔ چڑھائی پر ہم جارہے تھے۔ آفتاب غروب ہوچکا تھا۔ ماہتاب ضیا باریاں کر رہا تھا۔ باغ سے کچھ ہی فاصلہ پر چڑھائی ختم ہوئی۔ ہم لوگ کچھ آگے بڑھے اور تھوڑا فاصلہ طے کرنے پر مجھے ہو بہو وہی الفت کی تصویر والا منظر اور موقع نظر آنے لگا۔ یہ ایک بڑا مسطح مرتفع حصہ سامنے والی پہاڑی ہی کا تھا۔ چشمہ اوپر سے بہہ رہا تھا۔ شفاف پانی کا پیچ در پیچ چٹانوں پر سے چاندنی میں لہرانا اور میدان میں آہستہ آہستہ بہنا بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی روانی میں ماہتاب کا انعکاس شوخیاں دکھا رہا تھا۔ کرنیں مچل رہی تھیں۔ آس پاس کہیں کہیں ڈھاک اور نیند وغیرہ دشتی درخت محویت کے عالم میں کھڑے نظر آتے تھے۔ جیسا تصویر میں دکھایا تھا اسی طرح ایک درخت چشمہ کے کنارہ لگا تھا اور اُس کے سامنے چشمہ کے دوسرے کنارہ پر ویسا ہی ایک پتھر رکھا تھا۔ البتہ آسمان پر بادل نہیں چھائے تھے نہ درخت کی شاخ پر کوئی پرند بیٹھا تھا۔ اور نہ پتھر کے اوپر کوئی عورت بیٹھی تھی۔ میں وہیں پتھر کے قریب کھڑا ہوگیا۔ میں نے رافت سے کہا "کیا آپ نے الفت کی تصویر اسی مقام پر کھینچی ہے؟

رافت نے جواب دیا "آپ کا خیال درست ہے۔"

"اچھا کچھ دیر اسی چشمہ کے کنارے بیٹھئے" میں نے کہا۔

رافت نے کہا "مناسب" اور ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔

"رافت!" میں نے کہا "یہ منظر خود ہی بہت دلفریب اور روح افزا ہے مگر آپ کے قلم کی موشگافیوں نے صفحۂ قرطاس پر اس منظر میں غضب کی شعریت پیدا کردی۔"

رافت بولا "یہ آپ کی ستائش اور قدر افزائی ہے" اور خاموش ہوگیا۔

"رافت!" میں نے اُسے مخاطب کرکے اس طرح سلسلۂ سخن چھیڑا "اُس نام کی تشریح تو کیجیے۔"

"آپ نے فراق نام محض تصویر کے موضوع پر تجویز کیا ہے اور میں نے اُس عورت کے نام پر۔"

"کیا اس عورت کا نام ہی الفت ہے؟"

رافت نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا تو کیا یہ تصویر اُس کی زندگی کا ایک رخ بھی ہے"؟

اس نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا "محبت کے موضوع پر ہم دونوں میں کئی دن متواتر گفتگو ہوتی رہی جس قدر آپ کو اس بحث سے دلچسپی ہے شاید اسی حد تک مجھے بھی ہے۔ اگرچہ دونوں کے نظریوں میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ آپ کا یہ فلسفہ کہ محبت کا مقصد، غرض اور غایت صرف محبت ہی ہے اور اس کی ارتقائی معراج محبوب سے بے نیاز ہو جاتا ہے، میرے نظریہ کا نقیض ہے۔ آپ کا نظریہ خود غرضی کی تعلیم دیتے کہ محض تخیل کے فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ میرے خیال میں محبت صرف محبوب سے ملنے کا وسیلہ اور اُس کی تسلیم و رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور اُس کی دلیل دلی تاثرات مشاہدات اور واقعات ہیں اور آپ کے نظریہ کا ثبوت محض ظنی اور خیالی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

رافت کی یہ گفتگو میں بہت بے چینی سے سن رہا تھا۔ کیونکہ میں الفت کی زندگی کے حالات سننے کے لئے ہمہ تن شوق بن رہا تھا۔ میں نے پہلے خیال کیا کہ شاید رافت نے الفت کی زندگی کے واقعات بیان کرنے کے سلسلہ میں یہ تمہید شروع کی ہو۔ مگر معاً خیال آیا کہ کہیں وہ میری توجہ کو نفسی اصول کی تحت میں اس بحث پر منعطف تو نہیں کرنا چاہتا! کیونکہ اس درمیان میں وہ میری فطرت کا بہت کچھ رازدار بن گیا تھا۔ اس لئے میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ "اس نظریہ اور فلسفہ پر تو پھر کبھی مفصل گفتگو ہوگی۔ اِس وقت تو آپ الفت کی زندگی پر تبصرہ کیجئے" چونکہ میں اُس کی طبیعت سے خوب واقف اور بے تکلف ہو چکا تھا اس لئے اس طرح استفسار کرنے پر مجھے کچھ تذبذب نہیں ہوا۔

رافت نے ہنستے ہوئے کہا "آپ کا اشتیاق بہت بڑھ گیا ہے؟"

میں نے اُس کا جواب صرف تبسم سے دیا۔ رافت نے اپنی نگاہیں زمین پر جمالیں اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے "اچھا سنئے" کہہ کر اس طرح داستان شروع کی:-

کل شام کو جو شخص چبوترے پر بیٹھا آپ سے باتیں کر رہا تھا اُس کا نام کریم ہے۔ الفت اسی کی بھانجی ہے۔ والدین کے سایۂ عاطفت سے وہ غریب بچپن ہی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکی تھی۔ اُس کی پرورش اور تربیت کی تنہا ذمہ دار میری والدہ مرحومہ تھیں۔ الفت کی ماں والدہ صاحبہ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اِس لئے اُس نے آخری وقت الفت کو والدہ کے سپرد کر دیا تھا۔ الفت کا سارا خاندان غریب کاشتکار پیشہ ہے۔ والدہ مرحومہ ان لوگوں کا بہت خیال رکھتی تھیں اسی وجہ سے یہ خاندان مجھ سے اب بھی بہت محبت کرتا ہے۔ میرے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ مرحومہ اس مکان میں رہتی تھیں جو باغیچہ کے شمالی جانب ہے اور جس میں اب کریم رہتا ہے۔ ہاں تو والدہ صاحبہ نے الفت کو بہت شفقت اور محبت سے پالا کیونکہ میرے سوا اُن کی کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ میں اُس زمانہ میں ہمیرپور کے انگریزی مدرسہ میں تعلیم پاتا تھا۔ مدرسہ کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ میں سالانہ امتحان دے کر یہاں آیا۔ والدہ صاحبہ علیل تھیں کئی ڈاکٹر علاج

حکیموں کا علاج ہوتا رہا لیکن مشیتِ ایزدی کو منظور ہی کچھ اور تھا۔ چند مہینے کی علالت کے بعد انہوں نے مجھے خدا حافظ کہہ کر اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اُس وقت میری عمر سولہ سال کی ہوگی اور الفت غالباً بارہ تیرہ برس کی تھی۔

چند اعزہ تعزیت میں آئے تھے انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں اُن کے ہمراہ چلوں لیکن میں کسی کے ساتھ نہیں گیا۔ کچھ دنوں کے بعد سب لوگ اپنے اپنے وطن کو چلے گئے اور میں تنہا رہ گیا۔

والدہ صاحبہ کے فراق کا صدمہ کچھ ایسا صدمہ نہ تھا کہ میں آسانی سے اُس وقت برداشت کر لیتا۔ بیمار ہوا اور ایسا سخت بیمار کہ زندگی کی کوئی امید نہ تھی۔ شروع میں بخار آیا کیا۔ اس میں بداحتیاطی سے ہوا لگ گئی۔ پھر کیا تھا سرسام کا بہت سخت حملہ ہوا۔ یہی لوگ جنہیں آپ میرے "دیہاتی بھائی" کہتے ہیں میرے معالج اور تیماردار تھے۔ لیکن پھر بھی ان بیچاروں کو چوبیس گھنٹوں کی فرصت کہاں۔ سب سے زیادہ کریم اور اُس کے عزیز میرا خیال رکھتے تھے لیکن ان سب میں صرف ایک الفت کی ذات تھی جو برابر راتوں جاگتی رہتی اور ہر طرح سے میرا خیال رکھتی۔ اول اس کے دل پر والدہ مرحومہ کا صدمہ ہی کیا کم تھا اس پر میری علالت۔ اور اس وقت اس کی عمر ہی کیا تھی۔ سرسام کی حالت میں تو مجھے اُس کے اس ایثار محبت اور خلوص کا احساس ہو سکا لیکن جب میری طبیعت سنبھلی میں نے دیکھا کہ سوائے دن کے چند گھنٹوں کے جب کہ دوسرے لوگ میرے پاس موجود ہوتے ہیں وہ دن اور رات میرے ہی پاس گذارتی ہے۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ مرض سے اتنی جلدی افاقہ ہو جانا صرف الفت کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ میرا بخار اب بھی نہیں اترا تھا۔ وہ دن رات میں کتنی ہی بار کھانے کو پوچھتی رہتی۔ اور ہر وقت دریافت کرتی رہتی کہ "رافت بھائی کیسی طبیعت ہے؟"

میں نے جب کئی راتوں سے اُسے متواتر جاگتے اور ہر طرح کی تیمارداری کرتے دیکھا تو مجھ سے اُس کی مشقت اور تکلیف برداشت نہ ہو سکی۔ میں نے ایک دن کہا "الفت اب گھر جاؤ۔ میں اچھا ہو گیا" اس جملہ کو سن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہنے لگی "رافت بھائی! کیا تم مجھ سے خفا ہو گئے۔ میں نے کیا کیا؟" میں نے اُس کی سادگی اور خلوص کو محسوس کرتے ہوئے کہا "نہیں الفت! بھلا میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔ کتنے ہی دنوں سے تم جاگتے جاگتے تھک گئی ہو اب کچھ دنوں آرام کر لو ورنہ تم خود بیمار ہو جاؤ گی" یہ سُن کر اُس کے چہرہ پر مسرت کی جھلک دوڑ گئی۔ اُس نے کہا "نہیں میں تو دن کو ایک دو گھنٹے سو لیتی ہوں۔ اگر میں یہاں سے چلی بھی جاؤں تو مجھے رات بھر نیند نہ آئے گی" میں لاجواب ہو گیا۔

وہ بہت مستعدی اور تن دہی سے میری تیمارداری کیا کرتی اور میں دل پر جبر کئے ہوئے اُس کا ممنون ہوتا رہتا۔ خدا خدا کر کے تین ہفتوں کے بعد بخار اُترا لیکن بیماری اور والدہ کے غم کے مارے کمزوری عرصہ دراز تک رفع نہ ہوئی۔ س

زمانہ میں میری تنہا انیس وغمگسار یہی الفت تھی۔ دیہاتی بھائی بھی صبح شام آکر دیکھ جاتے تھے۔

ایک دن نقاہت اور کمزوری کی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ الفت آئی اور اپنے گھر اور محلہ کے حالات بیان کرتی رہی۔ تذکرۃً اُس نے پوچھا۔ "رافت بھائی! اب تم کہیں جاؤگے تو نہیں؟"

میں نے کہا "کیوں"

وہ بولی "کچھ نہیں۔ میں نے یوں ہی پوچھا"

میں نے کہا "ابھی تک کچھ سوچا نہیں"

اُس نے کہا "بھیّا! تم کہیں جانا نہیں۔ یہیں رہنا"

میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا "دیکھا جائے گا"

اِس جملہ کو سُن کر وہ مغموم سی ہوگئی۔ میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے تسلی دینے کے لئے مذاقاً کہا "اچھا الفت میں کہیں نہ جاؤں گا۔ لیکن تم بھی کہیں نہ جانا"

پہلے جملہ سے اُس کے چہرے پر بشاشت آگئی لیکن دوسرے جملہ پر وہ کیفیت زائل ہوگئی۔ میں اُس وقت اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

دو تین مہینوں کے بعد میں بالکل اچھا ہوگیا۔ اب میں پریشان تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ دنیا اور اُس کی دلچسپیوں سے میرا دل سرد ہوگیا تھا۔ مجھے نہ کسی چیز کی تمنا تھی نہ آرزو۔ جوش مٹ چکا تھا۔ ولولے سرد ہوگئے تھے البتہ علمی ذوق کچھ باقی تھا لیکن آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا۔ اس لئے میں نے تعلیم کا خیال بھی چھوڑ دیا۔

مجھے لڑکپن سے پھولوں، پودوں اور تصویروں سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اور میری دلچسپی کو دیکھ کر ہی والد مرحوم نے اس باغیچہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھلوں کے کتنے ہی درخت انہیں کے لگوائے ہوئے ہیں۔ ترکاریوں کی کاشت کی ابتدا بھی انہیں نے کی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہی مشاغل میری زندگی کے لئے کافی ہیں۔

ایک دن میرے سب دیہاتی بھائی میرے پاس آکر جمع ہوئے۔ اُن کی غرض اِس اجتماع سے میرے مستقبل پر روشنی ڈالنے کی تھی۔ بڑی طویل بحث وتمحیص کے بعد سب نے مل کر مجھ سے کہا کہ "رافت بھائی! تم ہم لوگوں کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ۔ اگر کہیں جاؤگے بھی تو ہم لوگ نہ جانے دیں گے۔ تم یہیں بے فکری سے رہو اور ہم لوگ سب مل کر تمہارا کام کیا کریں گے"

اُن کے اِس خلوص و محبت سے مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میں نے کہا " بھائیو! تم لوگ پریشان نہ ہو۔ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ اپنی زندگی اسی باغیچہ میں بسر کروں گا۔"

میرے اِس ارادہ سے سب بہت خوش ہوئے۔ سب نے بہت بہت دعائیں دیں۔ اُس دن سے میں نے مستقلاً یہیں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ اور باغ کی ترتیب اور تنظیم بھی اُسی دن سے شروع کر دی۔

الفت میرے اس ارادہ سے بہت فرحاں و شاداں تھی۔ باغیچہ کے اکثر انتظامات اور میرے کھانے پکانے کی ذمہ داریاں اُس نے اپنے اوپر خود بخود عائد کر لی تھیں۔

اسی طرح تین سال گذر گئے۔ مصوری کی مشق، چمن بندی، درختوں کی قطع و برید، ترکاریوں کی کاشت اور مطالعۂ کتب میری دلچسپیاں تھیں۔ اس درمیان میں الفت کی بے لوث محبت اور خلوص نے میرے دل پر گہرا نقش کر لیا۔

ایک دن کریم آیا۔ اُس نے مجھ سے تخلیہ میں کہا " رافت بھائی! الفت اب جوان ہوگئی۔ اس کی شادی ہو جانا چاہئے۔ اُس کے چچا نے اپنے چھوٹے لڑکے وزیر کا پیغام دیا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا " تمہارا وزیر کے متعلق کیا خیال ہے؟"

کریم بولا " وزیر بہت اچھا لڑکا ہے۔ چار ہل کی کھیتی کرتا ہے۔ میرے خیال میں الفت کو اس سے اچھا گھر نہیں ملے گا۔"

میں نے پوچھا " اُس کی عمر کیا ہوگی؟"

اُس نے کہا " ستائیس اٹھائیس سال کی۔"

میں نے کہا " الفت کی بھی کسی طرح مرضی معلوم کر لیتے۔"

اُس نے ہنس کر کہا " کہیں دنیا میں ایسی باتیں بھی لڑکیوں سے پوچھی جاتی ہیں۔ شریفوں کے یہاں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے؟"

مجھے اُس کی اس سادگی اور شرافت کے معیار پر بہت ہنسی آئی لیکن میں نے ضبط کر کے اُس سے کہا " پھر دوسروں سے رائے لینا بھی بے کار ہے۔"

وہ بولا " دنیا کا یہی طریقہ اور رواج ہے۔ سارے کام کاج بھائی بندوں ہی سے پوچھ کر کئے جاتے ہیں۔"

میں نے اُس کے اس خیال پر کوئی جرح کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے کہا " جیسا تمہیں ٹھیک اور مناسب معلوم ہو کرو۔"

اس کے بعد وہ چلا گیا۔ ایک دو ہفتہ کے اندر آئندہ ماہ میں نکاح و رخصت کی تاریخ مقرر ہوگئی۔

ایک دن الفت میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے مذاقاً اُس سے کہا " الفت تمہاری شادی پر میں مبارکباد دیتا ہوں

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چہرہ پر غم کے آثار نمایاں تھے اور وہ خاموش تھی۔ میں نے بہت اصرار کر کے اُس سے دریافت کیا کہ آیا اُسے اپنی شادی کا علم ہے کہ نہیں اور وہ بھی اس رشتہ سے خوش ہے؟

ہرچند کہ وہ مجھ سے بہت بے تکلف تھی۔ لیکن ان معاملات میں اُس نے مجھ سے کوئی مفصل گفتگو نہیں کی۔ کچھ شرم کے جذبات اور غم کی کیفیات اس پر طاری تھیں۔ بہت مبہم لفظوں میں اُس نے مجھ پر ظاہر کیا کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتی۔

میں نے ذرا تفصیل سے اُسے بتایا کہ شادی کی غرض اور ضرورت کیا ہے۔ ازدواجی زندگی کس درجہ دلچسپ اور سکون دہ ہے۔ ایک عورت پر شادی ہونے کے بعد کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ عورت کے کیا کیا فرائض ہیں اور اُن کو کس طرح ادا کرنا چاہئے اور عورت کو اپنی زندگی خاوند کی زندگی سے کس طرح وابستہ کر دینا چاہئے۔

وہ میری تمام تقریر خاموشی کے ساتھ سنا کی جب میں خاموش ہوا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ "تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی"؟

میں اُس کے اس سوال پر لاجواب سا ہو گیا۔ کیونکہ میں نے مجردانہ زندگی بسر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر میں نے کہا "الفت تم خوب واقف ہو کہ مجھ پر کیسے کیسے غم و مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے۔ اتنا دل و دماغ کہاں تھا کہ میں اپنی شادی کے متعلق کچھ سوچتا۔ دوسرے تم لوگوں کی محبت اور خیال نے مجھے کسی دوسرے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہونے دی۔ آئندہ دیکھا جائے گا"۔

یہ سن کر الفت خاموش ہو گئی۔ میں متعجب تھا کہ اُس نے میری شادی کے متعلق اصرار کیوں نہیں کیا۔ اور نہ میرے جواب پر کوئی نکتہ چینی کی۔ وہ مجھے حسرت و تاسف کے ساتھ جس میں محبت کی رنگ آمیزی تھی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے مجھ سے پھر سوال کیا "بھائی! اگر تم شادی کرو گے تو کس سے؟"

اُس کے اِس سوال پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "اس بارے میں ابھی کچھ سوچا نہیں۔ تمہیں بتاؤ میں کس سے شادی کروں؟"

وہ میرے اس جواب اور استفسار پر ہنسنے لگی۔ اتفاق سے اُسی وقت اُس کی ممانی بھی وہیں آ گئی۔ الفت نے ممانی کو دیکھ کر مجھ سے کہا "یہ ممانی سے پوچھ لو"

اُس کی ممانی نے بہت اشتیاق کے ساتھ مجھ سے پوچھا "رافت بھائی! کیا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ الفت مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میری کس سے شادی ہوگی؟ اس پر میں نے کہا کہ

تمہیں بتادو۔"

وہ بولی "ہاں رافت بھائی! اب تم شادی کرلو تو ہم لوگوں کو بہت خوشی ہو۔"

مَیں نے ہنس کر کہا۔ "پھر کیا، تمہیں کہیں نسبت لگا کے کرڈالو۔"

وہ ہنسنے لگی اور بولی "بھلا ہم غریب تمہاری نسبت کہاں لگائیں گے۔ تمہاری شادی تو تمہارے خاندان والے ہی کریں گے۔"

الفت خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے کہا "نہیں۔ تم لگادو تو!"

الفت بیچ میں بول اٹھی "اچھا ہم لگائیں گے۔"

اُس کی ممانی ہنس دی۔ اُس کے بعد دوسری باتیں ہوتی رہیں اور محفل برخاست ہوئی۔

اُسی دن سے الفت کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہربات میں صلاح ومشورہ مجھ سے لیا جاتا تھا۔ کیونکہ میں شادی کے تمام اخراجات کا کفیل بن گیا تھا اور ہر کام نہایت دلچسپی اور خوشی سے انجام دیتا تھا۔ لیکن میں نے اس درمیان میں الفت کو خوش وخرم نہیں دیکھا۔ میرے پاس وہ روزانہ آتی تھی مگر اُس میں وہ پہلی سی بشاشت نہ تھی خاموش زیادہ رہتی تھی۔ میں حیران تھا کہ کیا بات ہے؟ کئی بار میں نے اس سے وجہ بھی دریافت کی مگر اُس نے کبھی خاطر خواہ دل کا حال نہیں بتایا۔

آخر نکاح کا دن آگیا۔ تمام رسمیں بہت حسن وخوبی کے ساتھ انجام پائیں۔ کھانے وغیرہ کا انتظام اچھا رہا۔ جہیز اگر زیادہ نہ تھا تو ناکافی بھی نہ تھا۔

دوسرے دن اُس کی رخصت تھی۔ میں مکان کے اندر گیا۔ وہ ایک کمرہ میں عروسانہ پوشاک پہنے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے مخاطب کیا "الفت!"

وہ چہرہ پر دوپٹہ ڈالے ہوئے تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ہاتھ سے دوپٹہ ہٹا کر کہا "الفت! تم چپ کیوں ہو؟"

اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ اور عجیب غمگینی اور شرمندگی کی کیفیات اُس کے نورانی چہرہ پر ہویدا تھیں یہ دیکھ کر اس خیال سے کہ اگر اس حالت کے متعلق کچھ استفسار وغیرہ کیا گیا اور تسلی تشفی دی گئی تو اس کے جذبات اور بھی برانگیختہ ہوجائیں گے، میں نے گفتگو کا یہ پہلو اختیار کیا "الفت! تمہیں تین چار دن کے بعد یہیں بُلالیں گے۔"

لیکن وہ اِس پر بھی کچھ نہ بولی میں نے پھر کہا " اچھا الفت! سسرال سے کچھ ہمارے لئے لاؤگی بھی؟"
اس کا بھی اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھوں سے آہستہ آہستہ آنسو نکلنے لگے۔

میں نے اس طرح سے کہ گویا اُس کے آنسو دیکھے ہی نہیں اور غم کی حالت کو محسوس ہی نہیں کیا، اس سے کہا " الفت آج تو تم کچھ ناراض سی معلوم ہوتی ہو"

اس جملہ کو سن کر اُس نے ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس لی اور کہا " ہاں بھائی! سچ کہتے ہو۔ میں ہی تو آپ سے ناراض ہونگی!"

اُس کا مجھے لفظ "آپ" سے مخاطب کرنا ایک نئی بات تھی میں متحیر تھا کہ اس کی یہ کیا حالت ہے۔ میں نے کہا۔ "ناراض نہیں تو یہ کیا کہ تم مجھ سے بات ہی نہیں کرتیں"

اتنے میں کریم نے مجھے آواز دی۔ میں نے الفت سے کہا " خدا تمہیں شادماں رکھے۔ جاؤ سسرال میں خوب ہنسی خوشی سے رہنا سہنا۔ ہم اکثر تمہیں بلا لیا کریں گے"

اُس نے روکر کہا " مجھے بھول نہ جانا"

میں نے کہا کیسی باتیں کرتی ہو۔ بھلا تم کو میں بھول جاؤں! ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟ اچھا خدا حافظ" یہ کہہ کر میں فوراً باہر چلا آیا۔ اور اُسی دن وہ رخصت ہوکر چلی گئی۔ وزیر کی شباہت دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اُس کی فطرت سلیم نہیں۔ اس کی روح گناہوں سے ملوث ہے۔ اُس کی سرشت میں بدگمانی اور شک کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ غصہ انتقام اور حیوانی جذبات کا پتلا ہے۔

مجھے افسوس ہوا کہ ایک پاکیزہ سیرت معصوم خوبصورت لڑکی لطیف احساسات اور بہترین جذبات رکھنے والی جس کے پہلو میں بے لوث محبت کا نازک آبگینہ ہو ایک بہیمہ صفت، سنگدل اوباش کے سپرد کر دی جائے۔ مگر میں کیا کرتا قضا و قدر کو یہی منظور تھا۔ کریم اور اُس کے تمام عزیزوں کی یہی آرزو اور تمنا تھی۔ میں نے دل کو تسلی دینے کے لئے سوچا کہ خدا کرے میرا قیاس غلط ہو اور وزیر اُس کے حسن و عادات پر فریفتہ ہو جائے۔ مگر سرنوشت تقدیر کو کون مٹا سکتا ہے۔

الفت چلی گئی لیکن اُس کا خیال میرے دل سے نہیں گیا۔ اُس کی شکل آنکھوں میں پھرا کرتی تھی۔ میں اپنی اس حالت پر بہت متعجب اور پریشان تھا۔

چوتھی کی رسم ادا ہونے کے لئے وہ بلائی گئی۔ میں نے اُس کی آمد کی خوشی میں بہت سامان اور انتظام کیا۔ وہ آئی اس نے مجھے دیکھا بہت خوش ہوئی۔ میں نے ایک دن اُس سے کہا کہ " خدا کا شکر ہے کہ تم ہنسی خوشی تو آئیں"

یہ سُن کر اُس کی ساری خوشی غم میں تبدیل ہوگئی۔ میں متحیر رہ گیا۔ اُس نے کہا "بھائی! میری اس مسرت و خوشی کے یہ معنی نہیں کہ وہاں بھی اسی طرح خوش تھی۔ اور نہ یہ وجہ ہے کہ میری شادی ہوگئی۔ میری شادی ہونے اور یہاں سے چلے جانے کی تو خوشی آپ لوگوں کو ہوئی۔ آہ! آپ کو کیا معلوم اور آپ کو معلوم بھی کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر آپ کے پہلو میں بھی ویسا ہی دل ہوتا۔ جیسا کہ میرے پہلو میں، تو آپ کو اس کی حقیقت معلوم ہوتی"۔

میں نے کہا: "خیر رہتے رہتے دل بہل جائیگا اور طبیعت لگ جائے گی پھر تو یہاں کا خیال بھی نہ آئے گا"۔

یہ جملہ اُس سے کہنے کو تو کہہ گیا مگر میں ہی جانتا ہوں کہ مجھے اس جملہ کے بعد کو کس درجہ کوفت ہوئی۔

اُس نے یہ جملہ سنا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں اُس نے درد بھری آواز میں کہا "رافت بھائی آپ نے مجھے چھیڑ ہی دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اپنا غم سُنا کر کسی کو تکلیف دوں اور اسی وجہ سے میں نے اپنے دل کا حال کبھی کسی سے نہیں کہا۔ جیسا کہ آپ لوگ سمجھتے ہیں مجھے شادی سے خوشی نہیں ہوئی۔ اور کیوں یہ میں نہیں بتا سکتی۔ اور بتاؤں کیا، میں خود نہیں جانتی۔ میں خوب جانتی ہوں کہ دنیا میں کہیں لڑکیاں گھر میں بیٹھی نہیں رہتیں۔ مگر میں کیا کروں میرا دل ہی شادی کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ میں تو آپ کے باغیچہ کے ایک کونہ میں اپنی عمر کاٹنا چاہتی تھی۔ مگر بدقسمت بے بس کیا کرتی۔ کس سے دل کا حال کہتی اور کون مانتا۔ دنیا کی شرم و حیا جان سے لگی تھی۔ خیر آپ لوگوں کی تو خوشی ہوگئی۔ میں آپ کی نصیحتوں کو بھولی نہیں۔ خدا کو منظور رہے تو اپنی انتہائی کوششوں سے بالکل اسی طرح زندگی کے دن بسر کروں گی۔ اُن کی خدمت اور فرمانبرداری سے کبھی منہ نہ موڑوں گی۔ کیونکہ یہی خدا کی مرضی اور آپ کی خوشی ہے۔ ہاں دل پر زور نہیں۔ جانے کیوں ہوکیں سی اُٹھتی ہیں اور آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ وہاں کے لوگ مجھ پر ہنستے اور انگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ ایک دن میں اپنی قسمت پر رو رہی تھی۔ روکنے پر بھی آنسو نہ رکتے تھے کہ وہ آگئے۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ "تمہاری یہ حالت اچھی نہیں۔ کس کی محبت میں مر رہی ہو۔ رو رو کر تم نے نحوست پھیلائی ہے۔ اب کی جو آنسو نکلے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں۔ اب کی گھر ہو آؤ پھر دیکھیں تمہیں کون لے جاتا ہے۔ وہاں کی صورت بھی نہ دکھاؤں گا۔ اُن کی یہ باتیں سن کر میرے دل پر بہت صدمہ ہوا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ آپ کی باتیں یاد آگئیں۔ میں نے دل کو بہت سنبھالا اور خوش رہنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر ہائے کمبخت دل پر بس نہیں، آنسو نکل ہی آتے ہیں۔ اب اس خیال سے دل میں اور ہوک اٹھتی ہے کہ وہ مجھے پھر یہاں نہ بھیجیں گے"۔

میں نے اُس کی گفتگو پر کوئی تنقید کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ میرے دل پر خود اُس کے غم سے بہت صدمہ تھا۔ میں نے کہا: "تمہیں ڈرانے کو یوں ہی وزیر نے کہہ دیا ہوگا۔ تم برابر اُس کی فرمانبرداری کرتی رہنا۔ اور جہاں تک ہو

سکے کوئی بات اُس کی مرضی کے خلاف نہ کرنا۔ اُس کے طعنوں اور سخت کلامی پر دل میں کوئی اثر نہ لینا۔ خاوند کا خوش رکھنا ہی عورت کی سب سے بڑی خوبی اور دین و دنیا دونوں میں فلاح و بہبود کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ اور خود بھی ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرتی رہنا۔ ورنہ رو دھو کر تو سب ہی زندگی کے دن بسر کر لیتے ہیں"

بمشکل تمام اتنا کہہ کر میں اُس کے پاس سے اُٹھ آیا۔ کیونکہ میرا دل خود بھی بھر آیا تھا۔ تین چار روز کے بعد وہ سسرال چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں ایک سال کے لئے مصوری کی تکمیل کرنے باہر چلا گیا باغیچہ کا کاروبار انہیں دیہاتی بھائیوں پر چھوڑ گیا۔

جب میں یہاں واپس آیا۔ میں نے از سرِ نو باغیچہ کی تنظیم کی۔ اور اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل بنا لیا اور اسی معیار کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں

یہاں آنے پر الفت کی عجیب پُرالم داستان معلوم ہوئی۔ سوءِ اتفاق، جیسا میں نے وزیر کو قیافہ سے جانا تھا وہ ویسا ہی نکلا۔

وہ ایک آوارہ مزاج شخص تھا۔ اُس کی بیوہ بھاوج کو اُس کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ گھر کے تمام کاروبار پر وہی متصرف تھی۔ الفت کی کوئی ادا اُن دونوں کے تعلقات پر کارگر ثابت نہ ہوئی بلکہ الٹا یہ اثر ہوا کہ وزیر کو الفت سے نفرت ہو گئی۔ اُس کی بھاوج نے لوگوں کے ذریعہ سے الفت کی خوب برائیاں کرائیں۔ اور بے بنیاد تہمت لگائے پھر کیا تھا۔ وزیر کے ظلم و تعدی کے ہاتھ اُس غریب پر کھل گئے۔ اس معصوم کو سخت سے سخت سزائیں دی جانے لگیں۔ مگر وہ خدا کی بندی سوائے صبر و شکر کے زبان سے اُف بھی نہ نکالتی تھی۔ وزیر نے دن رات بیہودہ محبت کے طعنے دینا اور برا بھلا کہنا شروع کیا۔ وہ سنتی اور قسمت کو رو دیتی۔ ڈیڑھ سال ہو گیا لیکن اُس ظالم نے ایک دن کے لئے بھی یہاں نہ بھیجا۔ اکثر اوقات وہ سنگدل اُس کو سخت سے سخت سزائیں دیتا۔ کئی کئی دن کھانا نہ کھانے دیتا اور اس قدر مارتا کہ وہ بیچاری بیہوش ہو جاتی۔ مگر الفت کو کمال حاصل تھا کہ کبھی زبان سے اُس کی شکایت میں ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔

مجھے جب یہ حالات معلوم ہوئے دل کو سخت صدمہ اور قلق ہوا۔ مگر کرتا تو کیا۔ وزیر کے پاس جاتا تو خدا جانے وہ ظالم اُس کا کیا حال کرتا۔ اور کون میری باتیں سنتا اور کہنا۔ تا کبھی کبھی میں کریم کو سمجھانے بجھانے کے لئے بھیج دیتا تھا۔ آخر کو کریم سے بھی ضبط نہ ہوا اور دونوں میں شکر رنجی ہو گئی۔

میں اُس کی تکلیفوں کی یاد سے بے چین اور غمگین ادھر اُدھر تڑپتا پھرتا۔ کس طرح دل کو قرار آتا اور نہ کوئی چارہ کار سمجھ میں آتا۔ اسی غم اور پریشانی میں چھ سات مہینے گذر گئے۔

میرے ایک دوست نے جو قدرتی مناظر کی تصویریں لینے کشمیر جا رہے تھے مجھے اپنے ہمراہ چلنے پر مجبور کیا۔ میں نے بھی دل بہلانے کا موقع غنیمت سمجھا اور سفر کی تیاری کر لی۔ اُس دن جب کہ میں یہاں سے روانہ ہو رہا تھا ایک شخص الفت کی سسرال سے آیا اور اُس نے بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت وزیر کی بھاوج نے اُس کو کھانے میں زہر دے دیا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اُس نے زہر کیوں دیا۔ اس کے اثر سے وزیر دو تین گھنٹے میں تڑپ کر مر گیا اور اُس کی بھاوج ایسی غائب ہوئی کہ پتہ اور نشان نہ ملا۔

میں نے کہا "اچھا ہوا۔ اپنے اعمال کی سزا پائی۔ خس کم جہاں پاک"۔

اُسی وقت میں نے کریم کو بلا کر کہا "اب الفت کو وہاں جا کر لے آنا۔ میں دو تین مہینے میں واپس آؤں گا" اور اُسی دن میں روانہ ہو گیا۔

پورے تین مہینے کے بعد میں کشمیر سے واپس آیا۔ برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ میں اپنی قیام گاہ پر آٹھ بجے رات کو پہنچا۔ سب دیہاتی بھائی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے چند جملوں میں اجمالاً سب کی خیریت اور حالات پوچھ کر کریم سے دریافت کیا کہ "الفت آ گئی؟"

اُس نے کہا کہ "میں تو جب ہی لوا لایا تھا"۔

میں نے پوچھا "اس کی طبیعت کیسی ہے اور اس وقت کہاں ہے؟"

کریم کی بیوی نے کہا "اب تو اچھی ہے۔ ابھی پہاڑی پر چلی گئی"۔

میرے ساتھ کچھ سامان تھا اُسے کمرہ میں رکھ کر سیدھا پہاڑی پر چلا گیا۔

بادل آسمان پر چھائے تھے۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ ماہتاب کے ساتھ ابر کے بچے کھیل رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اس پتھر پر جس کے قریب آپ بیٹھے ہیں، الفت اسی انداز سے بیٹھی تھی جیسا کہ میں نے تصویر میں دکھایا ہے۔ اُس وقت کے سمے اور کیفیات کو میں نے امکانی کوشش سے تصویر میں ظاہر کیا ہے۔ میں اُسے اس طرح بیٹھا دیکھ کر سامنے والے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپتا ہوا دبے پاؤں اُس کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن اُسے خبر نہ ہوئی۔ میں بڑی دیر تک اُسے اسی محویت اور استغراق کے عالم میں دیکھا کیا۔

جب میں نے دیکھا کہ اُس کی خود فراموشی اور محویت حد سے گزر گئی ہے۔ میں نے اُس کے قریب جا کر اُسے مخاطب کیا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے وفورِ مسرت کے مارے آنسو جاری ہو گئے۔ بڑی دیر تک وہ سکتہ کے عالم میں مجھے خاموش دیکھا کی۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں کے انداز محبت کے پاکیزہ جذبات کی بہترین تفسیر کر رہے تھے۔

الفت کی وہ نگاہیں میرے دل سے کبھی نہ بھولیں گی۔

میں نے سلسلۂ گفتگو اس طرح شروع کیا "الفت کس کی یاد کر رہی تھیں؟"

اُس نے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا "کسی کی نہیں"

میں نے اُس کو چھیڑنے کے لئے پوچھا "کیا مجھے بھی بھول گئی تھیں؟"

یہ سن کر وہ اپنے جذبات کو زیادہ دیر تک نہ ضبط کر سکی۔ وہ بولی "بھائی! تم بہت دنوں میں آئے ہو ایک ایک دن گن گن کر کاٹتی رہی۔ آج جب دل بہت گھبرایا اس طرف آنکلی پپیہا بول رہا تھا، بادل چھائے ہوئے تھے، میں دل بہلانے کے لئے اس پتھر پر بیٹھ گئی۔ اس وقت تمہاری ہی یاد کر رہی تھی ...."

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "جب ہی تو میں آگیا"

بڑی دیر تک وہ اپنے غم کی داستان سناتی رہی لیکن شکایت کا ایک حرف بھی اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ اس کے بعد ہم دونوں یہاں سے اٹھ گئے۔

الفت اب خوش تھی۔ دن رات وہ میرے باغیچہ میں رہتی اور میرے سب کاموں میں حصہ لیتی رہتی، ہر وقت اُس پر ایک عجیب محویت کا عالم طاری رہتا تھا۔ اُس زمانہ میں مجھے اچھی طرح احساس اور یقین ہو گیا کہ الفت کو میرے ساتھ بچپن ہی سے بے غرض اور بے لوث محبت تھی۔ اور اسی محبت نے رفتہ رفتہ عشق کا درجہ حاصل کر لیا۔ وزیر کے ساتھ نکاح ہونے سے بہت پہلے وہ میرے سوا دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ لیکن اُس وقت مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف نہ ہو سکا۔ میں صرف یہ سمجھتا تھا کہ الفت بہ نسبت دوسرے لوگوں کے مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہے۔ جب میں نے کئی بار اس کی تمام زندگی کا ناقدانہ تجزیہ کیا تو اُس کی ہر بات اور زندگی کا ہر پہلو میری ہی محبت سے مملو نظر آیا لیکن اُس نے بذات خود کبھی محبت کا اظہار یا اقرار نہیں کیا۔ مجھے اُس کی اِس نسائی فطرت پر بہت حیرت اور تعجب ہے۔

میں نے ایک بار اُس سے دریافت کیا کہ محبت کسے کہتے ہیں، وہ بولی، "دنیا کی تمام خوشیوں کا کسی ایک ذات میں اکٹھا ہو جانا"

میں متحیر رہ گیا کہ اس نے کس درجہ سادگی سے ایک جملہ میں محبت کی جامع تفسیر کر دی۔ میں نے پھر پوچھا "محبت کیا چاہتی ہے؟"

اُس نے ہنس کر کہا "تمام عمر محبوب کا دیدار"

میں نے کہا "اس سے نتیجہ؟" وہ بولی "دل کا سکون۔ زندگی کی راحت!"

میں اُس کے اِن جوابات کو سُن کر محبت کے اعجاز کا قائل ہوگیا کہ ایک غیر تعلیم یافتہ دیہاتی عورت کو محبت نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔"

یہ کہہ کر رافت بولا "یہ تھی مختصر داستان جس کے سننے کے لئے آپ بہت مضطرب تھے۔"

میں اُس کی تمام گفتگو مجسمۂ حیرت و شوق بنا ہوا سنا کیا۔ جب وہ مخاطب ہوا میں نے پوچھا "الفت اب کہاں ہے؟"

رافت نے کہا "ایک مہینہ ہوا اُس کی بڑی بہن آئی ہوئی تھیں۔ وہ بہت اصرار سے اُسے مجبور کرکے اپنے ہمراہ لے گئی ہیں۔"

میں نے کہا "رافت! الفت واقعی الفت کی دیوی ہے لیکن افسوس کہ اس کی زندگی رنج و غم ہی میں بسر ہوئی۔ اُسے وہ راحت نہ مل سکی جس کی کہ وہ مستحق ہے۔"

رافت نے غمگین لہجہ میں کہا "مجھے بھی اس کا صدمہ ہے۔"

میں نے کہا "اب آپ اس سے عقد کیوں نہیں کر لیتے؟"

رافت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر کہا "رافت! اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو یہ آپ کی خود غرضی کا سب سے بڑا ثبوت ہوگا۔ کیونکہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی زندگی کے باقی ایام سکون و راحت سے بسر کرے گی۔ ورنہ دنیا والے اُسے کسی طرح چین نہ لینے دیں گے۔ آپ کا اس سے شادی نہ کرنا آپ کی زندگی پر ایک بدنما داغ ہوگا۔ شادی نہ کرنے کے جواز میں آپ بہت سی توجیہات اور مجبوریاں پیش کر سکتے ہیں۔ مگر وہ سب بیکار ہونگی آپ ہی کے نظریہ کے مطابق میں آپ کو مجبور کرتا ہوں کہ آپ ضرور اس سے بہت جلد عقد کرلیں۔"

رافت نے کہا "میں اس مسئلہ پر عرصہ سے غور کر رہا ہوں" یہ جملہ ختم کرکے اُس نے روئے سخن بدل کر مجھ سے کہا "دیر ہوگئی اب باغ واپس چلیے۔" میں نے کہا "بہتر" اور ہم دونوں اُٹھ آئے۔

دوسرے دن میں اُس سے رخصت ہو کر وطن چلا آیا۔ چند مہینوں کے بعد مجھے رافت کا ایک خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ رافت کی زندگی الفت کی ہستی کے ساتھ ازدواجی رشتہ میں ہمیشہ کے لئے منسلک ہوگئی۔ ہر چند اس کے تمام عزیز و احباب نے اُسے بہت مطعون کیا، مگر اُس نے بہت جرات اور ہمت سے کام لے کر ان لوگوں کے حملوں کی کوئی پروا نہیں کی۔

شرفی رضوی

نوائے راز

میں یہ کہتا نہیں کہ ہوں معصوم
تیری رحمت سے کیوں رہوں محروم!

ہے تغیر پسند فطرتِ دل
شاد ہے یہ کبھی، کبھی مغموم

یوں ہی دنیا کے کام چلتے ہیں
کوئی خادم ہے اور کوئی مخدوم

جانتا ہوں کہ چند روزہ ہے
قیدِ ہستی میں کیوں رہوں مغموم

چوٹ سی اک جگر پہ لگتی ہے
یاد آتا ہے جب دلِ مرحوم

طلبِ گُل کا ہے یہی حاصل
ہر خوشی دل سے ہو گئی معدوم

کہہ رہا ہوں میں راز کی باتیں
کوئی سمجھے گا کیا مرا مفہوم

آئینہ ہے یہ حسنِ کامل کا
اللہ اللہ مرتبہ دل کا

خلوتِ دل عجیب خلوت ہے
سب کو اس پر گماں ہے محفل کا

آج تجھ کو دکھا دیا اُس نے
میں ہوں ممنون دیدۂ دل کا

پوچھتے کیا ہو، آدمی کیا ہے
اک نمونہ ہے حسنِ کامل کا

بحرِ ہستی میں تیرنے والے!
کچھ پتا بھی ہے تجھ کو ساحل کا؟

خود نمائی ہے راہبر تیری
مل چکا بس نشان منزل کا!

جب سے دیکھا ہے اُس کو میں نے رازؔ
کچھ عجب حال ہے مرے دل کا

ابوالفاضل رازؔ چاندپوری

دیوِ خونخوار

سیر و تفریح کی ایک دخانی کشتی قسطنطنیہ سے ہمیں جزیرہ پرنکی پو کے ساحل پر لے آئی اور ہم وہاں اتر پڑے۔ کشتی میں کچھ زیادہ آدمی سوار نہ تھے۔ ایک پولی خاندان کے چار افراد ماں، باپ، اُن کی بیٹی اور اُس کا شوہر اور اُن کے علاوہ ہم دو، بس۔ ہاں مگر جب ہم لکڑی کے اُس پل پر سے گزر رہے تھے جو شاخِ زریں اور قسطنطنیہ کو عبور کرتا ہے تو ایک یونانی جسے نوجوان ہی کہنا چاہیے ہم سے آملا۔ یہ غالباً کوئی مصور تھا کیونکہ اُس نے اپنی بغل میں ایک اُس قسم کا بستہ داب رکھا تھا، جیسا مصوروں کے پاس ہوتا ہے۔ بالوں کی لمبی لمبی لٹیں اُس کے کندھوں پر پڑ رہی تھیں۔ اُس کا چہرہ زرد تھا اور اُس کی سیاہ آنکھیں گہرے حلقوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لئے مجھے اُس سے دلچسپی پیدا ہو گئی خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ متواضع تھا اور اسے جزیرے کے مقامی حالات کا بھی علم تھا۔ لیکن وہ اتنا باتونی تھا کہ آخر میں تنگ آکر اُس کے پاس سے ہٹ گیا۔

یہ پولی گھرانا بھی نہایت خوش اخلاق واقع ہوا تھا۔ باپ اور ماں دونوں بے تکلف تھے اور اُن کا داماد وجیہ و شکیل ہونے کے علاوہ ایک سلجھی ہوئی اور آزاد طبیعت کا مالک تھا۔ پرنکی پو میں یہ لوگ لڑکی کی خاطر جو کچھ مریض سی معلوم ہوتی تھی گرمیوں کے چند مہینے گزارنے آئے تھے۔ لڑکی حسین تھی مگر اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یا تو وہ کسی سخت بیماری سے صحت یاب ہوئی ہے یا کوئی خوفناک مرض اُس کے جسم پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا ہے۔ وہ اکثر اپنے شوہر کے بازو کا سہارا لے کر چلتی تھی اور راہ میں عموماً دم لینے کے لئے بیٹھ جاتی تھی۔ اُس کی سرگوشیوں کو بار بار ہلکی ہلکی خشک قسم کی کھانسی منقطع کر دیتی تھی۔ راستے میں اُس کو کھانسی کا دورہ ہوتا تھا تو وہ اور اُس کا شوہر دونوں ٹھہر جاتے تھے۔ وہ اپنی ہمدردانہ تشویش کی نگاہیں اُس پر ڈالتا تھا اور یہ اُس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جو کہتی تھیں: "نہیں، کچھ نہیں، میں اچھی ہوں!" اُن کا یقین صحت اور مسرت میں تھا۔

اُس یونانی کے کہنے پر، جو کشتی سے اترتے ہی ہم سے جدا ہو گیا، ہم نے پہاڑی پر کے ہوٹل میں قیام کا انتظام کیا۔ ہوٹل والا کوئی فرانسیسی تھا اور اُس نے عمارت کو آرام و آسائش کے تمام سامانوں سے فرانسیسی طرز پر منظم و مزین کر رکھا تھا۔ ناشتا ہم سب نے اکٹھا ہی کیا اور جب دوپہر کی گرمی ذرا کم ہوئی تب بھی ہم تقریباً ایک ساتھ ہی پہاڑی پر چڑھے اور وہاں سا بیریلکے چیڑوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر کوہستان کے پر فضا نظارہ سے مسرت حاصل کرنے لگے۔ ابھی ہم گ

انتخاب کرکے بیٹھے ہی تھے کہ وہ یونانی پھر نمودار ہوا۔ اُس نے ہمیں آہستہ سے سلام کیا، اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ہم سے چند قدم کے فاصلہ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنا بستہ کھولا اور تصویر بنانے میں مشغول ہوگیا۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کر چٹانوں کی جانب پیٹھ کرکے بیٹھا ہے تاکہ ہم اُس کی تصویر کی طرف نہ دیکھ سکیں"۔

نوجوان پول نے کہا "ہمیں اِس کی ضرورت بھی کیا ہے، ہمارے سامنے دیکھنے کے لئے بہت کچھ ہے"۔ ذرا ٹھہر کر اُس نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تصویر میں ہمیں بھی شامل کر رہا ہے، اچھا، اسے کرنے دو!"

حقیقت میں ہمارے سامنے دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ پرنکی پو جیسی خوبصورت اور پُرفضا جگہ ساری دنیا میں نہ ہوگی مشہور شہید وطن آئرٹن نے جو چارلس اعظم کا ہم عصر تھا اپنی جلاوطنی کا ایک مہینہ یہیں گذارا تھا۔ اگر میں ایک مہینے تک یہاں رہ سکتا تو اپنی تمام بقیہ عمر اس مقام کے تصور کی مسرت میں گزار دیتا۔ بلکہ میں اُس ایک دن کو کبھی نہیں بھولوں گا جو میں نے وہاں بسر کیا۔

ہوا ایسی صاف تھی جیسے چمکتا ہُوا ہیرا، اور ایسی نرم و خوشگوار کہ انسان کی ساری روح اُس کے ساتھ مل کر مصروفِ پرواز ہوجاتی تھی۔ دائیں طرف سمندر سے پرے ایشیائی پہاڑوں کی چوٹیاں اپنے بھورے بھورے سر اٹھائے کھڑی تھیں اور بائیں جانب دُور یورپ کے ڈھلوان ساحلوں پر شفق کے بادۂ ارغواں کا انعکاس ہورہا تھا۔ چانکی، "مجمع الجزائر سلطانیہ" کے نو جزیروں میں سے وہ جزیرہ جو ہماری ہمسائگی میں واقع تھا ایک مغموم خواب کی طرح اپنے سرو وصنوبر کے جنگلوں سمیت آسمان کی پُرامن بلندیوں کے ساتھ باتیں کررہا تھا اور اُس کے سر پر تاج کی طرح ایک عالی شان عمارت تھی جو اُن لوگوں کا مسکن تھی جن کے دل بیمار ہوں۔

بحیرۂ مارمورا کے پانیوں میں سے بلور کے ایک چمکدار ٹکڑے کی طرح رنگ برنگ کی لہریں اُٹھتی تھیں۔ دُور پانی دودھ کی طرح سفید تھا پھر اُس سے اِدھر گلابی، دونوں جزیروں کے درمیان نارنگی کی طرح آتشیں اور ہمارے عین نیچے سبزی مائل نیلا جیسے صاف شفاف نیلم ہو اور اُس کے حسن کا پرتو خود اسی میں پڑ رہا تھا۔ اُس کی سطح پر بڑے بڑے جہاز کہیں بھی نظر نہ آتے تھے۔ صرف دو چھوٹی کشتیاں جن پر انگریزی جھنڈے لہرا رہے تھے ساحل کے ساتھ ساتھ اڑی چلی جا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک جو اتنی بڑی تھی جتنی کسی پہرہ دار کی کٹی ہوئی بے دخانی کشتی تھی، دوسری کو درجن بھر آدمی چپو چلا رہے تھے اور جب چپو یک لخت پانی سے اوپر اُٹھتے تھے تو پگھلی ہوئی چاندی کے سے قطرے اُن سے گرتے تھے۔ ماہی خوار مچھلیاں پانی سے باہر سر نکال نکال کر جھانکتی تھیں اور بگلے محراب دار اڑانیں لگاتے ہوئے اُن کے اوپر اوپر

منڈلاتے تھے کبھی کبھی نیلگوں آسمان پر دونوں بر اعظموں کے درمیان خاموش اور مطمئن عقاب مصروف پرواز نظر آتے تھے۔

پہاڑی کی ڈھلوان جس کی چوٹی پر ہم بیٹھے ہوئے تھے تمام کی تمام گلاب کے پھولوں سے ڈھنپی ہوئی تھی اور ہوا اُن کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ اُس قہوہ خانے سے جو سمندر کے قریب واقع تھا موسیقی کی لہریں صاف ہوا کے ساتھ مل ملا کر ہم تک پہنچتیں تھیں اور راستے کی دُوری سے دھیمی ہو ہو جاتی تھیں۔

یہ کیفیت مسحور کن تھی۔ ہم سب خاموش بیٹھے تھے اور یہی روحوں کو ہم نے اس جنت کی تصویر میں غرق کر رکھا تھا۔ وہ نوجوان لڑکی اپنے سر کو اپنے شوہر کے سینے کا سہارا دیئے گھاس کے مخملیں فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے زرد بیضوی نازک چہرے پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوئی اور اُس کی نیلی آنکھوں سے یک لخت آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ یہ دیکھ کر سب کا دل بھر آیا۔ اُس کی ماں کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں اور میرے دل میں بھی درد کی ایک ٹیس اٹھنے لگی۔

لڑکی نے آہستہ سے کہا یہاں روح اور جسم دونوں کو اچھا ہو جانا چاہیئے۔ آہ، یہ جگہ کیسی فرحت خیز ہے!

لڑکی کے باپ نے کہا " خدا جانتا ہے میرا کوئی دشمن نہیں ہے لیکن اگر کوئی ہو بھی تو یہاں میں اُسے معاف کر دوں "۔

اور پھر سب خاموش ہوگئے۔ ہم پر کچھ عجیب کیفیت طاری تھی۔ ایسی عجیب کہ زبان بھی اُس کے اظہار سے قاصر ہے! ہر ایک اپنے آپ میں مسرت کی ایک دنیا پاتا تھا اور ہر ایک تمام دنیا کو اس دنیائے مسرت میں شریک کر لینے پر آمادہ تھا۔ سب کے دل کی ایک سی کیفیت تھی، اور اسی لئے کوئی ایک بھی دوسرے سے تعرض نہ کرنا چاہتا تھا تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اُس یونانی نے اپنا بستہ لپیٹا، ذرا جھک کر ہمیں سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہوگیا ہم وہیں بیٹھے رہے۔ ہم میں سے کسی نے اُس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔

آخر کئی گھنٹوں کے بعد جب جنوبی منظر کی دوریوں پر تیرہ فام اداہٹ کی سحر کاری نمایاں ہونے لگی تو لڑکی کی ماں نے کہا کہ اب واپس جانے کا وقت ہے۔ ہم اُٹھے اور بے فکرے بچوں کی طرح ہلکے اور سبک قدم اٹھاتے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ہم ہوٹل کے نفیس برآمدے میں بیٹھ گئے۔

اتنے میں نیچے سے کسی کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہمارا یونانی ہوٹل والے سے دست و گریباں ہو رہا تھا ہم اُن کی لڑائی کا لطف اٹھاتے رہے، مگر یہ تماشا کچھ زیادہ دیر تک نہ رہا۔ ہوٹل والا اب زینہ کو طے کر کے ہماری طرف آرہا تھا اور غصہ میں کہہ رہا تھا " جیسے میرے پاس اور مہمان نہیں ہیں "۔

جب وہ قریب آ پہنچا تو نوجوان پولی نے کہا "ذرا مجھے بھی بتانا یہ شخص کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟"

ہوٹل والے نے زہر آلود نظروں سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا "اس کا نام؟ اس کا نام کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم اسے دیوِ خونخوار کہا کرتے ہیں۔"

"یہ مصور ہے نا؟"

"بھلی تجارت ہے!" ہوٹل والے نے کہا "یہ مُردوں کی تصویریں بناتا ہے۔ اُدھر کوئی قسطنطنیہ میں یا یہاں گرد و نواح میں مرا۔ اِدھر اُس کے ہاں مرنے والے کی تصویر مکمل ہوئی۔ یہ اُس کی موت سے پہلے ہی تصویر کھینچنی شروع کر دیتا ہے ——— اور اس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی ——— یہ گدھ ہے گدھ!"

دہشت کے مارے پولی عورت کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اُس کی آغوش میں اُس کی بیٹی سرسوں کے پھول کی طرح زرد اور بےحس و حرکت پڑی تھی۔ اُسے غش آ گیا تھا۔

ایک جست میں پولی لڑکے نے سیڑھیوں سے اتر کر یونانی کو جا دبوچا۔ ایک ہاتھ سے اُس نے اُسے قابو کیا اور دوسرے سے اُس کا بستہ چھیننے لگا۔

ہم بھی اُس کے پیچھے اُتر آئے۔ دونوں ریت میں لوٹ رہے تھے۔ بستہ کی تمام چیزیں نکال کر بکھیر دی گئیں ایک ورق پر اُس لڑکی کی تصویر تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور ماتھے پر پھولوں کا ایک ہار تھا۔

نیرودا

منصور احمد

زندگی و عمل

ساحلِ افتادہ گفت   گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد   آہ کہ من چیستم
موجِ ز خود رفتۂ   تیز خرامید و گفت
ہستم اگر مے روم
گر نہ روم نیستم

اقبال

ہجومِ جلوہ

اِک جلوہ زارِ حسن تری بارگاہ تھی
چشمِ نظارہ جُو مری حیرت پناہ تھی

پہلو میں کوئی چیز تڑپتی تو تھی ضرور
اب جانے دل تھا یا تری برقِ نگاہ تھی

دل میں نہیں ہے نام و نشانِ شکیب و صبر
اُف کس قدر کسی کی نظر بے پناہ تھی

تاریکیٔ فراق میں عالم تھا نُور کا
آنکھوں میں ایک صورتِ زیبائے ماہ تھی

میری جبینِ شوق نے دیکھا نہ اس قدر
کعبہ تھا، دیر تھا کہ کوئی خانقاہ تھی

کچھ اس طرح تھا حسن ترا دل میں جاگزیں
جس جا نظر پڑی وہ تری جلوہ گاہ تھی

تاروں میں ڈھونڈتا تھا کسی کو جنونِ شوق
آوارۂ فلک مری اِک اِک نگاہ تھی

مضطر کا حال کیا کہیں رنجِ فراق سے
آنکھوں میں اشک تھے نہ کوئی لب پہ آہ تھی

رام رتن مضطر

غزل

یہ وہ فسانہ نہیں جسے ضم کوئی گلستاں کا باب کر دے
اگر لکھو میرا قصۂ غم، تو ختم ساری کتاب کر دے

جہاں تو وقفِ ستم رہا ہے وہاں کی حالت خدا ہی جانے
مجھے یہ ڈر ہے نہ چال تیری نظامِ محشر خراب کر دے

یہ خاک کے بے شمار ذرّے فلک کو حسرت سے تک رہے ہیں
زکوٰۃِ حسنِ ازل سے اُن کو بھی غیرتِ آفتاب کر دے

میں شمع بن کر جلوں تو اچھا، میں سوزِ غم سے گھلوں تو اچھا
مگر تری بزم میں ستمگر، خدا مجھے باریاب کر دے

مشاہدہ خلق کو کرادوں کہ پستیوں میں بھی ہے بلندی
مرے ارادوں میں آج مجھ کو اگر خدا کامیاب کر دے

حقیر ہے دیکھنے میں لیکن، کچھ ایسا ویسا نہیں ہے شاکی
اگر وہ شکوے کرے تو دونوں جہان کو لاجواب کر دے

شاکی شاہجہانپوری

محفلِ ادب

مرزا غالب کی خود نوشتہ سوانح عمری

جب بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں میرزا غالب کے قدیم کلام کا نسخہ ملا تو انجمن ترقیٔ اردو کی جانب سے اُس کی ترتیب وغیرہ کا کام ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے لئے بہت سی نئی نئی چیزیں جمع کی گئی تھیں۔ منجملہ اُن کے ایک عجیب چیز خود مرزا صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو انہوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے۔ یہ ورق کہیں سے سید افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا اور انہوں نے اپنی عنایت سے مرحوم بجنوری کو بھیج دیا تھا۔ اگرچہ یہ حالات انہوں نے اس طرح لکھے ہیں جیسے کوئی غیر شخص لکھتا ہے۔ لیکن عبارت کا ڈھنگ صاف بتا رہا ہے کہ اس پردے میں خود مرزا نوشہ باتیں کر رہے ہیں۔ دوسرے ایک دو باتیں جو وہ لکھ گئے ہیں وہ مرزا کے دل کی ہیں وہ دوسرا شخص کہاں لکھ سکتا تھا۔ تیسرے خط اُن کا ہے۔

اسد اللہ خاں۔ غالب تخلص۔ عرف مرزا نوشہ قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے اُس کا دادا قوقان بیگ خان شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا پہاسو کا پرگنہ جواب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اُس کی جاداد میں مقرر تھا۔ باپ اسد اللہ خاں مذکور کا عبد اللہ بیگ خاں دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا۔ اسد اللہ خاں اکبر آباد میں پیدا ہوا سال ولادت ۸۔ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری بروز یک شنبہ۔ عبد اللہ بیگ خاں الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور پانچ چھ برس کا تھا اُس کا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا ۱۸۰۳ء عیسوی میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا برگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اُس نے اپنے زورِ بازو سے سونک سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لئے جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بطریقِ استمرار عطا فرمائے مگر خانِ موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد بمرگ ناگاہ ہاتھی پر سے گر کر مر گیا جاگیر سرکار میں

باز یافت ہوئی اور اُس کے عوض نقدی مقرر ہوگئی۔ اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اس مزرع معانی میں سے ملتے ہیں اُس نے شاعری میں بڑا کمال پیدا کیا۔ نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا ہے۔ نثر کی تین کتابیں ہیں۔ پنج آہنگ۔ مہر نیمروز دستنبو۔ فارسی نظم کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل اردو اخبار لکھنو میں چھاپا ہوا ہے۔ گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدۂ مدح نذر دیتا ہے اور سات پارچے جیغہ سر پیچ موتیوں کے مالا خلعت پاتا ہے۔ اب کے بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے درباردارں کی فہرست کے صاحب کمشنر بہادر حصار نے کہ ان دنوں قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں مثل اور سد رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا۔ بیچارہ بہ سبب تہی دستی اور بے مقدوری کے لاہور نہ جا سکا۔ مجھ سے کہتا تھا ستر برس کا آدمی کانوں سے بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا اور بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے اُس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدۂ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بسبیل ڈاک لارڈ الن برا گورنر سابق کی معرفت بھیجا ہے اور اوائل ۱۸۵۶ء میں تین خط انگریزی بے واسطۂ انڈیا گورنمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں۔ اب ہم اُن تینوں خطوں کے خلاصے لکھ کر اُس کے ذکر کو ختم کرتے ہیں۔

نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ

"اردو"

باقیاتِ فانی

وہ بے خودی کے پیالے پلا دیئے تو نے	مرے حواس ٹھکانے لگا دیئے تو نے
گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر	تجلیات کے دریا بہا دیئے تو نے
بنا کے ہجر کی راتوں کو بے نیازِ سحر	تعینات کے پردے اُٹھا دیئے تو نے
دکھا کے تجزیہ رنگ و بو کا حسنِ کمال	مشاہدات کے ٹکڑے اُڑا دیئے تو نے
دلوں کو دے کے فریبِ سکونِ بے آرام	تغیرات کے فتنے جگا دیئے تو نے
یقینِ عشق کی ہلکی سی لہر دوڑا کر	توہمات کے شعلے بجھا دیئے تو نے

عطائے نعمتِ سوز و گداز کی خاطر
اذیتوں کے خزانے لٹا دیئے تو نے

سرورِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تو نے

حجابِ نطق کو معجز نوائیاں دے کر
نظر کی آڑ میں جادو جگا دیئے تو نے

جمالِ یار کا افسانہ چھیڑ کر فانیؔ
شعاعِ نور سے دِل جگمگا دیئے تو نے

"طور"

عمل

عملی آدمی کو صرف اُن چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے جن میں تبدیلی کا امکان ہو۔

ذوقِ عمل دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ حالات کو بدلنے کی ضرورت سے اور اس قوت کے احساس سے کہ ہم تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔

بہت سے واقعات و حالات میں سے اُس سادہ سے مسئلہ کو نکال کر الگ کر لینا جو ضروری ہے، اس کا نام عمل ہے۔

ہمارے سینوں میں دینے کو بس ایک دل ہے۔ عمل کو اس میں سے جو کچھ دیا جاتا ہے محبت سے وہ چھیننا پڑتا ہے۔

اگر تم کسی عملی آدمی کو خوش کرنا چاہتے ہو تو اُس کے سامنے اُن کاموں کا ذکر نہ کرو جو وہ کر چکا ہے بلکہ اُن کا جو وہ ابھی اور کر سکتا ہے۔

سچا سردار وہ ہے جو اپنے لئے بس وہی کام رکھے جو سوائے اُس کے کوئی اور نہ کر سکے۔

عملی آدمی اپنے بڑے بڑے ارادوں کے متعلق مشکل ہی سے زبان کھولتا ہے۔

"جامعہ"

رازِ الفت

جب نرگس آغوشِ مرگ میں سو گئی تو چشمہ کا آبِ شیریں آبِ شور میں تبدیل ہو گیا۔ اور بن کی دیویاں

قلبِ صحرا سے آہ و بکا کرتی ہوئی نکلیں کہ اپنے غم ربا نغموں سے اُس کے دل کو تسکین دیں۔
اور جب انہوں نے دیکھا کہ چشمہ بجائے آبِ شیریں کے تلخ آنسوؤں سے لبریز ہے تو انہوں نے اپنی زمردیں بالوں کی لٹیں بکھیر دیں اور رقت آمیز لہجہ میں کہا "آہ! نرگس اتنی حسین تھی کہ اُس کے غم میں تمہاری قلبِ ماہیت چنداں تعجب خیز نہیں معلوم ہوتی۔
"لیکن کیا نرگس حسین تھی؟" چشمہ نے دریافت کیا
"ہاں ۔۔۔۔۔ اور تم سے زیادہ اس امر کا کسے علم ہو سکتا ہے"؟
بن کی دیویوں نے کہا، "ہماری طرف تو اُس کی نگاہِ التفات کبھی بھول کر بھی نہ پڑی۔ البتہ اُس نے تمہاری جستجو کی۔ تمہارے کنارے قیام پذیر ہوئی اور وہ تمہارے ہی شفاف آئینہ میں اپنے حسن کا مشاہدہ کیا کرتی تھی"۔
"لیکن چشمہ نے کہا" مجھے تو نرگس اس لئے محبوب تھی کہ جب وہ کنارے سے دیکھا کرتی تھی تو مجھے اُس کی آنکھوں کے آئینہ میں اپنا ہی جمال عکس ریز نظر آتا تھا"۔

(آسکر وائیلڈ) "نیرنگِ خیال"

حقیقی ترقی کیا ہے؟

دنیا ترقی کے لئے کوشاں ہے ہر شخص جد و جہد کے میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اُسے نہیں معلوم کہ حقیقی ترقی کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہوتی ہے۔
حقیقی ترقی مادی ترقی نہیں ہے بلکہ روحانی ترقی ہے اور روحانی ترقی انسان کی تکمیل کا پیام ہے۔ مادی دنیا میں لاکھوں ترقی یافتہ انسان تمہیں نظر آئیں گے۔ لیکن جب اُن کی حقیقت پر تم غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ یہ ترقی نہیں کر رہے ہیں بلکہ تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔
ایک مزدور ترقی کرتے کرتے روس کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ ایک سائیس ترقی کرتے کرتے ایران کی حکومت کو قبضہ میں لے سکتا ہے ایک معمولی سپاہی بڑھتے بڑھتے ترکی کا پریسیڈنٹ بن سکتا ہے لیکن پھر بھی تم دیکھو گے کہ حقیقی ترقی سے وہ محروم ہے۔
حقیقی ترقی کے لئے قلب کو نورانی شعاعوں سے منور کرو اور اُن شعاعوں سے پوچھو کہ ترقی کیا ہے۔ تمہیں ترقی کا سیدھا راستہ مل جائے گا۔

"دین و دنیا"

نئی کتابیں

مسیح کی زندگی ۔ یہ کتاب مشہور انگریزی تصنیف "ہز لائف" کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔ اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کی مقدس زندگی کے واقعات بہ الفاظ اناجیل اربعہ لکھے گئے ہیں، اور اناجیل ہدایت و نور کا سرچشمہ ہیں۔ حجم تین سو صفحات سے زائد اور قیمت ۴ ہے۔ پادری ایچ ای ایڈرسن صاحب ایم اے سہارن پور سے منگائیے۔

صراط الحمید ۔ مولفہ پروفیسر الیاس برنی صاحب ایم اے ایل ایل بی علیگ اڑھائی سو صفحے کی یہ مبسوط کتاب مقامات مقدسہ واقع عراق، شام فلسطین و حجاز کا سفرنامہ ہے۔ سفر کے تمام ضروری ہدایات، ملک اور شہروں کے حالات مقامات متبرکہ کے عکسی نقشے، زیارات مقدسہ کے انعامات، بیت اللہ کے فتوحات، حج کے احکام و مسائل اور طور وطریق نہایت وضاحت سے اس میں درج ہیں۔ قیمت ۱۲؍ ۔ حاجی مقتدی خاں صاحب شروانی علی گڈھ سے طلب فرمائیے۔

پارسی علوم اور اسلام ۔ مولفہ پروفیسر محمد مسلم صاحب سینٹ کولمباز کالج، ہزاری باغ (بہار) اس کتاب میں اُن الزامات کی تردید کی گئی ہے جو عرب فاتحین پر پارسی ادبیات کی غارت گری کے متعلق لگائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی پر عربی کے اثرات احسانات کو واضح کیا گیا ہے حجم ساٹھ صفحے اور قیمت بارہ آنے ہے۔ جناب مصنف سے مل سکتی ہے

اسلامی مساوات ۔ مصنفہ مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی اس کتاب میں اسلامی اصول جمہوریت کی نہایت اچھی تشریح اور ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کی نہایت عمدہ تفسیر کی گئی ہے حجم ۸۸ صفحات اور قیمت ۸ ہے

اسلام اور غلامی ۔ مصنف مذکور کی دوسری کتاب ہے جس میں آزادی مساوات اور اخوت کا اسلامی نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے حجم ۳۲ صفحے ہے اور قیمت تین آنے۔ دونوں کتابیں مسلم بک ڈپو پھلواری شریف پٹنہ سے ملتی ہیں

تاریخ ملتان ۔ مولفہ لالہ بالکشن صاحب بترہ، پلیڈر ملتان۔ شہر ملتان اپنی قدامت کے لحاظ سے ایک خصوصیت رکھتا ہے اور ہندوؤں کا تیرتھ اور مسلمانوں کے اولیا کا مدفن ہونے کے اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں یہاں کے واقعات سلسلہ وار درج ہیں۔ تین عکسی تصویریں بھی کتاب کی زینت ہیں مولف موصوف سے طلب فرمائیے۔

خزینۃ القواعد ۔ فارسی زبان کی گرامر ہے جسے انگریزی طرز پر لکھنے کی کوشش کی گئی ہے ترجمہ، ضرب الامثال، محاورات اور اُن کی تشریح کے ابواب کتاب کا مفید حصہ ہیں۔ آخر میں یونیورسٹی کے پیپر بھی دیے ہیں حجم ۲۳۹ صفحے ہے قیمت درج نہیں ملنے کا پتہ شیخ الٰہی بخش رحیم بخش صاحبان تاجران کتب گجرات (پنجاب)

شعر و شاعری عصر جدید ایران۔ آقا سید محمد علی صاحب پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن کی دلکش تقریر ہے جو انہوں نے ایران کے عصر جدید کی شاعری کے خصوصیات و تبدیلات بیان کرتے ہوئے شعبۂ جامعہ معارف کے سامنے کی حجم ۴۲ صفحے ہے۔ قیمت درج نہیں۔

اقبال و شعر فارسی۔ پروفیسر موصوف کا دوسرا لیکچر ہے جس میں انہوں نے علامہ اقبال کی فارسی شاعری سے ایرانیوں کو روشناس کرایا ہے۔ یہ رسالہ اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق اور زبور عجم پر ایک فاضلانہ تبصرہ ہے حجم ۴۸ صفحے۔ دونوں کتابیں جناب پروفیسر سے طلب فرمائیے۔

سرود بہ مستاں۔ مصنفہ جناب رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ) مسلم یونیورسٹی علی گڈھ حجم ۲۰۷ صفحے اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں اردو شعر و شاعری پر ایک نظر ڈالی ہے اور شعر کے بلند معیار کو بہت اچھی طرح واضح کیا ہے۔ دوسرا حصہ دیوان فانی کی تنقید میں ہے۔ اس میں جناب فانی کے کلام کو لطافت زبان اور نزاکت بیان کے اعتبار سے غالب کی ارتقا یافتہ شکل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ہم اس معاملہ میں جناب مصنف کے متفق نہیں ہو سکے۔

مجموعہ قصائد مومن۔ مرتبہ ضیا احمد صاحب ایم اے بدایونی۔ اس مجموعہ میں ہندوستان کے مشہور نازک خیال حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے اردو قصائد درج کئے گئے ہیں۔ قابل مرتب نے مقدمہ اور حواشی میں اچھے اچھے نکات پیدا کئے ہیں حجم ۱۰۲ صفحے اور قیمت ۱۲ر ہے۔ انا ظر پریس لکھنؤ سے طلب فرمائیے۔

دیوان ولایت، پنج رقعۂ ولایت اور ملتقط نگارش عاری — یہ تینوں کتابیں ان بزرگ کی ہیں جن کی ساری عمر زبان فارسی میں کمال حاصل کرنے میں صرف ہوئی یہ وہی ولایت ہیں جنہوں نے ارادت ایرانی کے پنج رقعہ کا جواب لکھ کر غالب کے پاس بغرض اصلاح بھیجا تھا۔ غالب نے کہا تھا کہ "خوشامد فقیر کا شیوہ نہیں، تمہاری تحریر پنج رقعۂ سابق سے کہیں بہتر ہے اصلاح کی مطلق گنجائش نہیں۔ موجد سے مقلد بہتر نکلا یعنی تم نے خوب لکھا، ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" پنج رقعہ کے آخر میں فاضل مصنف کے مختصر حالات بھی درج ہیں تینوں کتابوں کی قیمت علی الترتیب [illegible] ہے ملنے کا پتہ سید اشرف علی صاحب ڈپٹی کلکٹر، گورکھپور

مسدس کریما۔ ادب و اخلاق کی کتابوں میں یہ کتاب مقبول عام ہے اور مولانا سعدی علیہ الرحمتہ سے منسوب کی جاتی ہے۔ جناب الٰہی بخش صاحب نامی محلہ کرار خاں شہر جالندھر نے ہندوستانی بچوں کی سہولت کے لئے نظم و نثر میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ہمارے خیال میں نثر کافی تھی نظم تکلف ہے قیمت چار آنے مقرر کی گئی ہے۔

جھو جھو نئیے اور نوایجاد جھولا
دنیا کی موجودہ ترقی
معزز و مستند ڈاکٹر اپنے بچوں کو جھلاتے ہیں اور بچوں کے واسطے تجویز کرتے ہیں
جھو جھو بہت کام ۔ بڑے آرام اور تھوڑے دام کی چیز ہے
کے اینڈ کیز کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۲۲ فیض بازار دہلی
سب اشیاء کی یکجائی قیمت صرف دس روپے 10/-
نوٹ
ڈبل الارم ٹائم پیس
گارنٹی
کارآمد فاؤنٹن پن
رسٹ واچ
گارنٹی ۷ سال
۲۲ کیرٹ گولڈ پلیٹڈ رسٹ واچ
قیمت چھ روپے
لیور پاکٹ واچ
گارنٹی ۵ سال
قیمت پانچ روپے
گولڈ چوڑیاں
نوٹ نمبر (۱)
نوٹ نمبر (۲)
سپر واچ ہاؤس اجمیری گیٹ دہلی

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی، ادبی، تمدنی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے علاوہ محصول ڈاک، فی پرچہ ۸ر، نمونہ ۱۰ر

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

[illegible] منیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام [illegible] پرنٹر چھپوا کر شائع کیا۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بیادگارِ علامۂ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر- بشیر احمد- بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر
حامد علی خاں- بی۔ اے
منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۴ — بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء — نمبر ۶

تصویر:- زینۂ زرّیں

آپ اور ہم

یہ سال کا آخری نمبر ہے۔ اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہمایوں اپنی عمر کی سات منزلیں طے کر رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمایوں کے بلند مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس سال بھی کامیاب و کامران رہے ہیں، اپنی استعداد کے مطابق ہم نے جتنی کوششیں بھی کی ہیں وہ بنظرِ استحسان دیکھی گئی ہیں۔

اس وقت ملک کے بعض رسائل کا ہر پرچہ ہر مہینے کئی ایک بلند بانگ دعاوی لے کر نکلتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اپنے دعاوی کی کسی حد تک پاسداری میں وہ ترقی کی دوڑ میں بھی چند قدم حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس کے برخلاف ہمایوں اپنے معاونین کو کبھی کوئی ایسی امید یا توقع نہیں دلانا چاہتا جس کو بعد میں پورا نہ کر کے اُسے شرمسار ہونا پڑے۔ وہ ہمیشہ اپنی کوششوں کا کم از کم اندازہ کرتا ہے۔ ہمایوں کے سرورق کے آخری صفحے پر آپ نے اکثر یہ فقرہ ملاحظہ کیا ہوگا کہ

"ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمایوں نے اپنی موعودہ ضخامت کے ۸۶۴ صفحے نومبر ہی میں پورے کر لئے تھے۔ اس لئے اگر بہتر صفحے کے حساب سے دیکھا جائے تو ہمایوں نے سال بھر میں بارہ کی بجائے تیرہ پرچے دیئے۔

اپنی اعانت کو جاری رکھتے ہوئے ہماری مساعی کی جو قدر افزائی آپ نے کی ہے اُس کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں اور وہ ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم آئندہ رسالہ کو بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن تدبیر کو عمل میں لائیں، لیکن اِن تدابیر کو قابلِ عمل بنانے کے لئے ہم محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔ یہ وہی مدد ہے جس کا مطالبہ ہم کئی بار آپ سے کر چکے ہیں۔ یعنی توسیعِ اشاعت کے لئے کوشش۔ اس معاملہ میں ہم اُن حضرات کے ممنون ہیں جنہوں نے ہماری گزشتہ سال کی اپیل پر توجہ فرمائی اور اُس وقت سے لے کر اب تک اس توجہ کو ہمارے شاملِ حال رکھا۔ لیکن کیا ہمارے مخاطب یہی چند نیک دل اصحاب تھے؟ نہیں! ہم تو آپ سب سے اپنی کوششوں کی عملی داد لینا چاہتے تھے۔ پھر کیا اب ہم امید کریں کہ آپ ترقی و توسیعِ ہمایوں کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ مبذول فرمائیں گے؟

ہم

سالگرہ نمبر

ہمایوں کا آئندہ پرچہ سالگرہ نمبر ہوگا اور ہماری رائے میں ہمایوں کے تمام سابقہ خاص نمبروں سے زیادہ مفید زیادہ دلکش اور زیادہ دلچسپ ہوگا۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحات سے زائد تجویز کیا گیا ہے اور ان صفحات کے لئے ملک کے بلند پایہ اور مشہور ادبا و فضلا کی نظم و نثر کے تازہ ترین اور بہترین مضامین حاصل کئے گئے ہیں۔ تصاویر کا اہتمام وانتخاب نہایت محنت اور صرفِ کثیر سے کیا گیا ہے۔ تمام کی تمام تصویریں دنیا کے مشہور و مقبول مصوروں کے شاہکار ہوں گی اور حسبِ معمول تمام خیالی تصاویر کے ساتھ نظمیں ہوں گی گویا مصور اور شاعر کے احساساتِ لطیف کے دو آئینے ہوں گے جن کی کرشمہ زائیاں ایک دوسرے میں منعکس نظر آئیں گی۔

علمی مضامین میں مذہب اور سائنس کی دیرینہ کشمکش اور بالآخر اُن کے ملاپ پر ایک نئے انداز اور نئی قسم کا مضمون ہوگا جس میں روح اور روحانیت کے مسائل پر ایک بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا ہے۔

ہمایوں کے فلک پیما نامہ نگارِ خصوصی کے شوخ و شگفتہ قلم سے ایک ڈراما ہوگا جس کا انوکھا پن اور نکتہ طرازی قابلِ دید ہونگے۔ اس کے علاوہ تین مختلف النوع تاریخی و ادبی دلچسپ افسانے ہونگے جنہیں آپ کئی کئی بار پڑھنا چاہیں گے۔

صاحبِ "مبادیٔ سیاسیات" کے قلم سے ایک تاریخی سیاسی مضمون ہوگا جس میں ایک نوزائیدہ اسلامی سلطنت کے سیاسیات اور حالات لکھے ہیں۔

ہندوستان کے ایک فطرت نگار عالم کے قلم سے ایک خیالی سیرت کا خاکہ ہوگا جس کا ایک ایک فقرہ آپ کے دل میں پیوست ہوتا چلا جائے گا۔

ایک شہرۂ آفاق مغربی شاعر کے متعلق ایک مضمون ہوگا جس میں اُس کے مختصر حالات، اُس کے کلام کی تنقید اور اُس کے اشعار کے نظم و نثر میں نمونے دیئے جائیں گے۔

"جدید خیال" کا ایک مفصل و مبسوط مضمون ہوگا جو ارادوں میں عزم اور فیصلوں میں قوت پیدا کرے گا۔

ایک نادر فلسفیانہ مضمون ہوگا جسے ہمارے ایک خاص مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

دوسرے عالی پایہ مضامین، دل افروز نظمیں اور خوبصورت یک رنگی و سہ رنگی تصاویر بھی قابلِ دید ہوں گی۔

یہ نمبر کثیر تعداد میں چھپوایا جا رہا ہے لیکن پھر بھی آپ اپنے دوستوں کے لئے یہ تحفہ حاصل کر لینے کا جلد انتظام کر لیجئے۔

اس کی قیمت ایک روپیہ ہوگی۔ سالانہ خریداروں سے چندہ بدستور سابق صرف پانچ روپے علاوہ محصول لیا جائے گا جس میں یہ بے نظیر پرچہ بھی شامل ہوگا۔

مینجر

جہاں نما

ترکی کی نسوانی تحریک

اسلامی دنیا کی نگاہیں اس وقت ترکی کی طرف لگ رہی ہیں جو مغرب کے معیارِ ترقی پر پورا اُترنے اور دورِ حاضر کے ترقی یافتہ وسائل سے مستفید ہونے کے اعتبار سے ایشیائی حکومتوں کا سرتاج سمجھا جاتا ہے۔ افغانستان اور ایران پوری سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ ترکی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ایشیا کی اس انقلابی تحریک کا سب سے نمایاں پہلو نسوانی تحریک ہے کیا یہ حیرت انگیز انقلاب نہیں ہے کہ وہی قومیں جو صدیوں سے اپنی عورتوں کو چار دیواری میں بند رکھنے اور اُن کی زندگی کے مشاغل کو پُراسرار بنانے کی خوگر تھیں۔ آج انہیں مردوں کے دوش بدوش دنیا کی جدوجہد سے عہدہ برآ ہونے کی تعلیم دے رہی ہیں تاکہ اُن کا وجود ملک اور ملت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو۔

"انٹرنیشنل ریویو آف مشنس" میں ایک مغربی خاتون کا جسے ترکی میں قیام کئے ہوئے ایک عرصہ گذر چکا ہے ترکی کی نسوانی تحریک کے متعلق ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے جس کا حسبِ ذیل اقتباس قارئینِ کرام کی ضیافتِ طبع کے لئے درج کیا جاتا ہے۔

"قسطنطنیہ میں عورتوں نے نسوانی حقوق کے تحفظ کی غرض سے ایک خاص انجمن قائم کی ہے جس کا نام "انجمنِ تحفظِ حقوقِ نسوان" ہے پچھلے دنوں ترکی کی روشن خیال اور بیدار مغز خواتین کا ایک وفد انگورہ پہنچا اور اُس نے اپنے حقوق کے متعلق مجوزہ اصلاحات کا پروگرام اس معقولیت اور استقلال کے ساتھ پیش کیا کہ حکومت کے لئے اسے منظور کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

"اس کے علاوہ خود حکومت یہ چاہتی ہے کہ عورتیں پردہ کی قید سے آزاد ہو کر مردوں سے سوشل تعلقات پیدا کریں۔ ٹریم کشتی اور دیگر پبلک مقامات میں "حرم کا پردہ" ہٹا دیا گیا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں اکثر عورتیں چارشف کے بجائے مغربی طرز کا ایک ہلکا سا نقاب استعمال کرتی ہیں جو کبھی چہرہ پر نہیں ڈالا جاتا بلکہ سر کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے بعض خواتین ہیٹ زیبِ سر کرتی ہیں۔ مگر ترکی کے اندرونی قصبات میں معاشرتی تغیرات کی رفتار مدھم نظر آتی ہے۔ یہاں جدید اصلاحات کا انحصار زیادہ تر مقامی حالات پر ہے۔ نئی تعلیم ترکی کی نسوانی اور خانگی زندگی پر ایک خاص اثر ڈال رہی ہے۔ عورتیں خانہ داری کے متعلق یورپین مصنفوں کی کتابوں اور رسالوں کو بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔ ترکی خواتین

کے لئے یہ امر قابلِ ستائش ہے کہ انہوں نے کسی قسم کی بے اعتدالی کے بغیر وقار اور سرگرمی کے ساتھ اپنی حالت میں تغیر پیدا کرنے کی اہلیت کا ثبوت دیا ہے۔ بہت سی عورتوں کے دلوں میں ملکی خدمت کا جذبہ موجزن ہے۔ وہ ملک کے لئے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے کوئی خاص خدمت انجام دینا چاہتی ہیں۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کے متعلق ان کی کئی انجمنیں ہیں جو بہت مفید کام کر رہی ہیں۔ انجمن ہلالِ احمر اپنی صنعتی تحریک کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتی ہے۔ وہ غریب لڑکیوں کو قدیم ترکی سوزن کاری کی تعلیم دے رہی ہے جو خوبصورتی اور نفاست کے لئے مشہور ہے۔ انجمن ہلالِ اخضر نے جو زیادہ تر عورتوں پر مشتمل ہے انسدادِ مسکرات کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے۔ اسی طرح کئی اور نسوانی انجمنیں ہیں جنہوں نے یتیم بچوں کی غور و پرداخت اور اُن کی پرورش کا فرض اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

"نسوانی تحریک کی نشوونما کا حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ ترکی عورتیں تعلیم کے معاملہ میں خاص دلچسپی لے رہی ہیں حکومت نے یہ دیکھ کر کہ لڑکیوں کے لئے تحتانی مدارس کی تعداد کافی نہیں ہے نارمل سکولوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے۔ طریقۂ تعلیم میں بھی اصلاح کر دی گئی ہے۔ ان مدارس کی طالبات کو کوئی فیس نہیں دینی پڑتی لیکن اس رعایت کے معاوضہ میں فارغ التحصیل طالبات کو چند سال کے لئے سرکاری ملازمت کا پابند ہونا پڑتا ہے۔

حکومت نے گذشتہ تین سال سے استنبول کے نارمل سکول کے لئے ایک امریکن اُستانی کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ یہ استانی ترکی لڑکیوں کو خانہ داری کی تعلیم دیتی ہے جو ترکی میں ایک نیا اور اہم مضمون ہے۔ استنبول کی یونیورسٹی نے جس کے نظام کی باگ بالکل ترکی ہاتھوں میں ہے۔ ترکی لڑکیوں کے لئے باقاعدہ جماعتیں کھول دی ہیں۔ طب اور قانون کی علمی شاخوں سے اُسے خاص شغف ہے۔ طبی مدرسہ کے رجسٹر میں چار سو پچاس طالبات کا نام درج ہے۔ جن میں سے تیس اس سال فارغ التحصیل ہو چکی ہیں ملک کے اندرونی قصبات میں طبی گریجوایٹوں کی زیادہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ بعض ترکی لڑکیاں طب کا مزید علم حاصل کرنے کے لئے یورپ اور امریکا کو روانہ ہو گئی ہیں۔ ان میں چند ایسی بھی ہیں جنہوں نے مغربی ممالک میں اپنی تقریروں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔

"ترکی میں لڑکیوں کی جسمانی تربیت کے لئے بھی بہت سی جماعتیں کھول دی گئی ہیں۔ مدرسوں اور یتیم خانوں میں محکمہ حفظانِ صحت کی طرف سے جسمانی تربیت کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ تعلیم کا یہ جدید شعبہ اس قدر کامیاب ثابت ہوا ہے کہ وزیرِ تعلیم نے سرکاری نارمل مدارس میں لڑکے اور لڑکیوں کی جسمانی نشوونما کے لئے سویڈش اُستاد مقرر کئے ہیں جو اس فن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔"

جمہوریۂ چین کا جدید دستور

جمہوریہ چین کے جدید دستور کے متعلق جو اطلاعات اِس وقت تک موصول ہوئی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چین کی قومی حکومت حکمرانی کے اختیارات اور فوج کی اعلیٰ کمان کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھے گی۔ حکومت پانچ "یوان" (مجالس) یعنی منتظمہ، مقننہ، عدلیہ، ممتحنہ اور ناظرہ پر مشتمل ہوگی۔ جمہوریہ کا ایک صدر ہوگا جو حکومت کا اصلی نمایندہ اور فوج کا سپہ سالار ہوگا۔

بارہ سے سولہ تک مشیرانِ حکومت ہونگے۔ جن میں سے پانچ "یوان" کے صدر اور نائب صدر مقرر کئے جائیں گے مجلسِ منتظمہ کی حیثیت سب سے اعلیٰ ہوگی یہی جمعیت وزرا اور کسی مجوزہ قانون کا فیصلہ کرنے کے لئے کمیشن مقرر کرے گی۔ ہر قانون مجلسِ مقننہ میں پیش کیا جائے گا۔ یہ جماعت علاوہ قانون کے ملکی بجٹ، امن کے مسائل اور جنگ کے معاہدات وغیرہ کی ذمہ دار ہوگی۔ عدلیہ عدالتی انتظام کی ذمہ دار ہوگی۔ ممتحنہ امتحانات کی نگرانی اور سرکاری خدمت کے لئے ضروری قابلیت کا فیصلہ کرے گی۔ ہر شخص کو سرکاری خدمت کے لئے امتحان دینا پڑے گا۔ مجلسِ ناظرہ احتساب اور حساب کی پڑتال کے فرائض انجام دے گی۔

جدید اٹلی کا بانی

ڈاکٹر فونس پریذیڈنٹ براؤن یونیورسٹی نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں جدید اٹلی کے متعلق مسولینی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:۔ "تمہارا جی چاہے تو تم مسولینی کو جابر اور ظالم کہہ سکتے ہو۔ میرے خیال میں بھی وہ جابر ہے لیکن اس نے اپنی قوم کی روح کو ایسا بدل دیا ہے کہ اطالوی ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو اس قدیم اور باجبروت رومن قوم کا جانشین کہہ سکتے ہیں جس کے یہ اخلاف ہیں۔

"آج سے بارہ سال پہلے اگر ہم اٹلی کی سرزمین میں داخل ہوتے تو ہمیں ایسے حسین اور بااخلاق لوگوں سے سابقہ پڑتا جو آسمان تلے سورج کی روشنی میں کسی نظام کے پابند نہ تھے۔ موسیقی اور نقاشی ان کا بہترین مشغلہ تھا اور وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ اپنے شاندار ماضی کی داستان بیان کرنے یا سننے میں صرف کرتے تھے۔ مگر اب مسولینی نے ان کو ایک ایسی شے دی ہے جس سے وہ صدیوں سے نا آشنا تھے۔ یہ وہ شے ہے جس نے روما کو رفعت و عظمت کے بام تک پہنچایا۔ اس نے اپنے شدید ضابطہ، بے رحمانہ ضبطِ نفس، قانون کی پابندی اور اپنے جبر و ستم کی بدولت (اگر تم اسے جبر و ستم ہی کہنا چاہتے ہو) اطالوی قوم سے ہر ایسے شخص کو ملک بدر کر دیا ہے جو محض عیش و عشرت کا دلدادہ ہے اور جو اپنے مفاد کو ملک کے

مفاد پر مقدم سمجھتا ہے اُس نے ضابطہ اور آئین کی شدید پابندی کے عمل سے اٹلی کے اُن باشندوں میں قوتِ عمل کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا ہے جنہوں نے مسرت اور راحت کی زندگی بسر کرنا اپنی زندگی کا مقصدِ وحید قرار دے رکھا تھا۔ اُس نے مذکورہ بالا عمل سے اٹلی میں حقیقی مسرت اعتماد اور غیر فانی امید کے جذبات کی لہریں از سر نو پیدا کر دی ہیں۔ اٹلی نے ایک اعلیٰ نصب العین کے حصول کی خاطر صدیوں کی غفلت اور کمزوری کی نیند سے بیدار ہو کر ایک ایسی وادی میں قدم رکھا ہے جہاں خوشی کے پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں۔

امریکا کا ایک سفری مدرسہ

پروفیسر ڈاکٹر جی۔ ایس کرشنیا نے ٹسکیگی (امریکا) میں زراعت اور اقتصادیات کے ایک سفری مدرسہ کے حالات لکھے ہیں جس کے پرنسپل امریکا کے مشہور قوم پرست حبشی مسٹر بوکر ٹی واشنگٹن ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ مسٹر موصوف نے امریکا کی حبشی آبادی کے مستقبل کے متعلق ایک موقع پر کہا "ہم جس قدر محنت اور مشقت سے کام کرنا اپنے لئے باعثِ عزت سمجھیں گے اور زندگی کے روزانہ مشاغل میں دماغی طاقت اور چابکدستی سے کام لیں گے اسی قدر خوشحالی کی منزلِ مقصود کے نزدیک پہنچیں گے" اسی نصب العین کو مدنظر رکھ کر مسٹر واشنگٹن نے ایک بہت بڑا انسٹیٹیوٹ قائم کیا جس کا یہ مقصد تھا کہ حبشی کسان اور اُن کے خاندان زراعت کے بہترین طریقوں پر عمل پیرا ہو کر اپنی آمدنی کو بڑھائیں اور معاشرتی حالت کو درست کریں حبشی لڑکے اور لڑکیاں اپنے زراعتی کاروبار میں دلچسپی لیں اور اُسے ترقی دیں۔ اس طریقہ سے امریکا کے حبشیوں پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو گئی ہے کہ وہ اپنی حالت میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔

توسیعِ زراعت کا جو لائحہ عمل امریکا کے حبشیوں کے لئے تیار کیا گیا اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے پچیس یا تیس سال ہوئے ایک سفری مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ یہ سفری مدرسہ سال میں ملک کے تمام حصوں اور بالخصوص ان مقامات کا دورہ کرتا رہتا ہے جہاں ریل نہیں جاتی ایگریکلچر ایجنٹ اپنے علاقہ میں سفری مدرسہ کی آمد سے پہلے ہی لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے۔ اور کسانوں سے سفری مدرسہ کے لئے کچھ زمین حاصل کر لیتا ہے جہاں ہفتہ بھر کے لئے مدرسہ کی تمام ضروریات مہیا کی جاتی ہیں۔ یہاں سفری مدرسہ عملی تعلیم اور نمائش سے کسانوں کے بچوں کے دلوں میں دلچسپی اور شوق کا جذبہ پیدا کرتا ہے غرضکہ سفری مدرسہ کی عملی تعلیم اور نمائش کو ہر پہلو سے کامیاب بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جاتا۔ بڑے بڑے اشتہاروں اور دیگر طریقوں سے زراعتی جلسوں کے لئے جگہ اور وقت کا پورے طور پر اعلان کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ کسان بتعداد کثیر ان جلسوں سے مستفید ہو سکیں۔

طلوعِ سحر

طلسمِ شب تیرہ و تار ٹوٹا
وہ مشرق سے اِک چشمۂ نور پھوٹا

کیا جس نے سیراب سارے جہاں کو
منوّر کیا جس نے کون و مکاں کو

سنہری شعاعوں کا زینہ بنا ہے
کہ بحرِ ضیا میں سفینہ بنا ہے

اور اس میں فرشتے بہے آ رہے ہیں
شعاعوں میں مل کر چلے آ رہے ہیں

بندھا عرش سے فرش تک ایک تانتا
خداوندِ عالم کے پیغامیوں کا

فلک سے یہ پیغامِ حق لا رہے ہیں
ضیا علم و حکمت کی پھیلا رہے ہیں

صداقت کا یہ بول بالا کریں گے
دلوں کے جہاں میں اجالا کریں گے

منصور

زبدہ زادی

فنِ تقریر

اِنَّ مِنَ البَیَانِ لَسِحرًا

جس وقت چارلس ڈبلیو ایلاٹ، ہارورڈ کے صدر تھے، وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہر مرد و زن کے لئے تعلیم سے پہلے اپنی مادری زبان کا صحیح استعمال جاننا نہایت اہم اور ضروری ہے۔

سچ پوچھتے ہو تو تسخیرِ قلوب کا بہترین ذریعہ اور اجنبی لوگوں کے دلوں پر اپنا اثر ڈالنے کا واحد طریقہ صرف حسنِ تقریر ہے۔ تم اپنی خوش بیانی کے ذریعہ سے اُن کی توجہات کو اپنی طرف منعطف کر سکتے ہو۔ شیریں کلامی نہ صرف تمہیں لوگوں کے دلوں پر اپنا اثر ڈالنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی بلکہ یہ تمہاری زندگی میں آسانیاں بھی پیدا کرے گی۔ یہ وکالت پیشہ افراد کے لیے موکل، ڈاکٹروں کے لئے بیمار اور تاجروں کے لیے گاہک کھینچ کر لائے گی۔ غرض شیریں کلامی کی وجہ سے ہر مجلس اور ہر سوسائٹی میں تمہاری قدر و منزلت کی جائے گی اگرچہ تم غریب اور مفلس ہی کیوں نہ ہو۔

ایک ایسا آدمی جو اپنے خیالات کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں خوش اسلوبی کے ساتھ ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اور لوگوں کو اپنی تقریر کے ذریعہ سے دلچسپی کا سامان مہیا کر سکتا ہے اُس شخص سے بدرجہا افضل ہے جو ہزار عالم و فاضل ہو، مگر اپنے خیالات کو آسانی سے یا فصاحت کے ساتھ بیان کرنا نہ جانتا ہو۔

ممکن ہے تم کسی خاص ہنر یا علم میں مہارت رکھتے ہو یا تمہیں کسی فن میں خاص امتیاز حاصل ہو مگر تم اپنے کمال کو ہر وقت اور ہر جگہ لوگوں پر اس طرح ظاہر نہیں کر سکتے، جس طرح فنِ تقریر کو ہر وقت کام میں لا سکتے ہو۔ فرض کرو، تمہیں علمِ موسیقی میں خوب واقفیت حاصل ہے اور اس علم کے حاصل کرنے میں تمہیں سینکڑوں روپیہ برباد اور کئی سال بہترین اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرنا پڑا ہے مگر باایں ہمہ سعی و کوشش تمہارے قدردانوں کا حلقہ بالکل محدود ہوگا اور بہت کم لوگ تمہارے کمال اور جوہر سے واقف ہونگے جب تک تم [illegible] قابلیت [illegible] اظہار نہ ہو۔

اگر تم بہترین قوال ہو اور تم نے گانے بجانے میں وہ مشق بہم پہنچائی ہے کہ اپنی خوش الحانی کے ذریعہ سے حاضرین کو مسحور کر سکتے ہو تو تمہارے جوہر سے کوئی شخص اُس وقت تک واقف نہ ہو سکے گا جب تک کہ تم اپنے کمال کو اس کے سامنے ظاہر نہ کرو۔ کوئی شخص دنیا کا چکر لگا دے مگر جب تک اُس کو اپنے کمال کے اظہار کا موقع نہ ملے کوئی اُس کو آنکھ اٹھا کر بھی

نہ دیکھے گا۔ اِس کے برعکس جس شخص کو فنِ تقریر میں کافی بہرہ حاصل ہو وہ کیسی ہی مجلس میں کیوں نہ جائے اور اُس کی ظاہری حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ ضرور اپنے کمال کے ذریعہ سے خراجِ تحسین وصول کرے گا۔

فرض کرو کہ تم مصور ہو اور تم کو اس فن کے سلسلہ میں بڑے بڑے اساتذہ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ اور تم نے اپنی عمر کا ایک گراں قدر حصہ صرف کرنے کے بعد اتنی استعداد بہم پہنچائی ہے کہ اب تمہاری تصویریں شاہی محلات اور بڑی بڑی نمائش گاہوں میں آویزاں ہونے کے قابل بن گئی ہیں مگر اس کے باوجود صرف معدودے چند افراد ہونگے جن کو تمہاری تصویروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ لیکن اگر تم مصورِ تقریر ہو تو جو شخص تم سے ملے گا تمہاری زندگی کی تصویر اُس کے سامنے ہوگی، جس پر تم نے دورانِ تقریر میں نقش ونگار کیا تھا۔

غرض آپ جس کسی فن میں کامل دستگاہ حاصل کریں گے، اُس سے بالکل کم لوگوں کو مستفیض ہونے کا موقع ملے گا۔ لیکن اگر تم فنِ تقریر میں کمال پیدا کروگے تو جس شخص سے تم ہمکلام ہوگے، وہ تمہاری ذہانت اور فراست کی داد دینے لگے گا۔

ایک سوسائٹی کا قابل ترین لیڈر جس کو فنِ تقریر میں خاص ملکہ حاصل ہے، اپنے افراد کو یوں نصیحت کرتا ہے کہ "کہے جاؤ، کہے جاؤ، اس کی کچھ زیادہ پروا نہیں کہ تم کیا کہتے ہو، مگر آہستگی اور خوبی کے ساتھ کہے جاؤ۔ ایک ایسے آدمی کو جو نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بات چیت کرتا ہے، کوئی چیز ہراساں اور خوفزدہ نہیں کر سکتی"۔ اس نصیحت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تقریر سیکھنے کے لئے تقریر کرنا چاہئے۔ وہ لوگ جو سوسائٹی سے بالکل نامحرم ہیں اور تقریر کرنے سے ابھی جھجکتے ہیں۔ اُن کے لئے ضروری ہے کہ دوسروں کی تقریر کو غور سے سنا کریں۔

ہر مجلس یا دعوت میں عمدہ مقررین کو طلب کیا جاتا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ فلاں شخص کو کھانے پر یا کسی مجلس میں مدعو کیا جائے کیونکہ وہ بہترین مقرر ہے اور اُس کی باتوں سے کچھ دیر کے لئے احباب کا دل بہل جاتا ہے۔ گو اس میں سینکڑوں عیوب ہی کیوں نہ ہوں مگر لوگ اُس کی صحبت سے محظوظ ہوتے ہیں کیونکہ وہ خوش بیان ہے۔

شستہ اور بلیغ تقریر نہایت موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ وہ شخص جو اپنے خیالات کو صفائی کے ساتھ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور بغیر فکر و تامل کے الفاظ زبان سے نکالنے لگتا ہے، عمدہ مقرر نہیں کہلا سکتا اور ایسی فضول تقاریر سے، جو فائدہ کہ مقصود ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہزاروں نوجوان اپنے قیمتی اوقات کو اور اپنے چھٹی کے دنوں کو صرف ہرزہ سرائی اور بیہودہ گوئی میں صرف کئے جاتے ہیں اور انہیں اپنے نقصان کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ صبح سے شام تک ایسی بیہ

کرتے رہتے ہیں جو مذاقِ سلیم پر ناگوار گذرتی ہیں۔ اور سوائے بھونڈی، نامعقول اور اخلاق سوز باتوں کے کوئی عمدہ بات اُن کی زبان سے نہیں نکلتی۔ آپ نے سڑکوں پر، گاڑیوں میں اور شاہراہوں پر لوگوں کو آہستہ یا جلدی نہایت بُرے تلفظ کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے سنا ہوگا۔

"ابے کیا بولتا"، "یہ ٹوپی بولو"، "وہ بھوت لمّا آدمی ہے"، "مارتوں دیکھ اب" وغیرہ وغیرہ ایسے ہی بہتیرے مہمل اور نامعقول جملے اکثر سننے میں آتے ہیں۔

بات چیت سے انسان کی تمام بھلائیاں اور برائیاں معرضِ ظہور میں آجاتی ہیں۔ بات چیت ہی سے ہر شخص کو اس بات کا اندازہ لگانے کا موقع مل جاتا ہے کہ تم کتنے پانی کے آدمی ہو۔ اسی سے ہر شخص کی علمی قابلیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ تقریر ہی تمہاری کل زندگی کا مرقع سننے والے کے سامنے پیش کرتی ہے۔ تم جو کچھ کہوگے اور جس طرح کہوگے، اس سے ہر شخص تمہاری قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکے گا۔ جب تک انسان بات نہیں کرتا اُس کے تمام راز پوشیدہ رہتے ہیں۔ مگر جب وہ منہ کھول دیتا ہے تو اُس کے عیب و ہنر صاف نظر آنے لگتے ہیں ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

میٹھی باتوں کے سوا کوئی ایسا کمال یا ہنر نہیں جس کو ہم ہمیشہ کماحقہٗ استعمال کر سکیں اور اُس کے ذریعہ سے دوستوں کے لئے تفریح کا سامان بھی مہیا ہو جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ زبان جیسی نعمت ہمیں اس لئے عطا کی گئی ہے کہ ہم اس کو درجۂ کمال تک پہنچا دیں مگر سخت افسوس ہے کہ ہم میں سے اکثر افراد اپنے غلط استعمال سے اس کی مٹی پلید کیا کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے تقریر کو ایک خاص فن کی حیثیت نہیں دی۔ ہم کو عمدہ گفتگو سیکھنے کی زحمت اٹھانا تک گوارا نہیں۔ گفتگو کرنے سے پہلے کچھ دیر سوچنا اور اپنے خیالات کو آسان اور فصیح پیرایہ میں ادا کرنے کی کوشش کرنا ہم پر گراں گزرتا ہے۔ ٹوٹی پھوٹی زبان میں جوں توں اپنا مطلب ادا کر دینا ہمیں آسان معلوم ہوتا ہے جو لوگ تقریر میں بالکل پیچھے ہیں وہ ترقی کرنے اور سیکھنے کی کوشش کرنے کے بجائے اپنے آپ کو یہ کہہ کر بچا لینا چاہتے ہیں کہ "عمدہ مقررین فطرتاً پیدا ہوتے ہیں اور بنائے نہیں جاتے"۔ اگر یہ سچ ہے تو اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں تمام قابل وکلا، عمدہ فلاسفر اور بڑے بڑے تجار بھی فطرتاً پیدا ہوتے ہیں اور بنائے نہیں جاتے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی بغیر کوشش اور جہدِ بلیغ کے اس درجۂ کمال کو نہیں پہنچا۔ یہ قابلیت صرف اُن کی ذاتی محنت اور مشقت کا ثمرہ ہے۔

اکثر مشہور و معروف افراد کی ترقی اور شہرت کا دار و مدار صرف اُن کی قوتِ تقریر پر ہے۔ لوگوں کے لئے اپنی گفتگو میں دلچسپی

پیدا کرنا اور اُن کو اپنی طرف مائل کرنا، ایک بہت بڑا کمال ہے۔ وہ آدمی جو گفتگو میں لڑکھڑاتا ہے اور کوئی بات جانتا ہے مگر اُس کو منطقی، دلچسپ اور زوردار زبان میں ادا نہیں کرسکتا، وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔

میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جس نے فنِ تقریر میں اتنی استعداد بہم پہنچائی ہے کہ ہر شخص کا جی یہی چاہتا ہے کہ اُس کی باتوں کو سنا کرے۔ اُس کی زبان میں سلاست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اُس کے الفاظ نہایت صاف ستھرے مزے دار اور چٹ پٹے ہوا کرتے ہیں۔ اُس کی گفتگو میں اتنا مزہ حاصل ہوتا ہے کہ جو شخص اُس کی بات چیت سنتا ہے، اُس پر جھٹ فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اُس نے اپنی تمام زندگی میں عمدہ نظم و نثر کا غور کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور تقریر کو ایک فن کی حیثیت سے سیکھا ہے۔

تم خیال کرتے ہوگے کہ تم مفلس و قلاش ہو اور عرصۂ حیات تم پر بالکل تنگ ہے۔ ممکن ہے تم پابندی کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہو، تمہاری ذات سے دوسروں کی زندگیاں وابستہ ہیں اور تمہیں کسی مدرسہ یا کالج جانے کی بھی فرصت نہ ملتی ہو یا تم میں اتنی طاقت نہ ہو کہ موسیقی یا کوئی ہنر جس کو تم سیکھنا چاہتے ہو، حاصل کرو۔ ممکن ہے کہ تم کسی ناموافق صورتِ حالات کی بنا پر افکار و آلام میں گھرے ہوئے ہو مگر تاہم تم ایک عمدہ اور خوش بیان مقرر بن سکتے ہو بشرطیکہ ہر ایک جملہ کو جو تمہاری زبان سے نکلے، عمدہ اور بلیغ پیرایہ میں ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ ہر کتاب جس کا تم مطالعہ کرتے ہو اور ہر فصیح گو جس سے تم بات چیت کرتے ہو تمہاری مدد کے لئے کافی ہے۔

بہت کم لوگ بات چیت کرنے سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات کا کس طرح اظہار کر رہے ہیں۔ جو لوگ فنِ تقریر میں ابھی پیچھے ہیں، ان میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ جیسے الفاظ اُن کی زبان پر آتے ہیں، فوراً بول اُٹھتے ہیں۔ وہ اتنی دیر تامل نہیں کرتے کہ بولنے سے پہلے ایک جملہ بنا لیں جو خوبصورت، شستہ اور زوردار ہو۔ الفاظ ابھی ترتیب بھی نہیں پا چکتے کہ اُن کی زبان سے پھسلتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

ہم کو کتنی فرحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے جب ہم ایک ایسے شخص سے ملاقات کرتے ہیں جو فنِ تقریر میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو۔ بخلاف اِس کے ہم کو کتنا تعجب ہوتا ہے جب ہم لوگوں کو اپنی کج مج بولی کے ذریعے سے زبان کی مٹی پلید کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اگر تقریر کو ترقی دی جائے تو یہ ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کرنے کے قابل ہے۔

مجھے اپنی عمر میں تقریباً ایک درجن ایسے اشخاص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، جنہوں نے مجھے فنِ تقریر کی ایسی ایسی عظیم الشان قابلیتوں کے نمونے دکھائے ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے میری نظر میں تمام فنون ہیچ نظر آتے ہیں۔

میں ایک دفعہ باسٹن میں وِنڈل فلپ کے گھر ملاقات کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ اس پُر لطف صحبت کی یاد اب تک

میرے ذہن میں باقی ہے۔ قلب کی آواز کی شیرینی اور اُن کی جادو بھری تقریر اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے وہ پیارے پیارے الفاظ وہ میٹھی میٹھی باتیں مجھے عمر بھر نہ بھولیں گی۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر اس طرح باتیں کیا کرتے تھے جیسے کوئی اپنے پرانے ہم جماعت سے باتیں کرتا ہے۔ جب وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتے تھے تو مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے کبھی ایسی پیاری اور میٹھی زبان نہیں سنی۔ غرض میں نے ایسے ہی بہتیرے آدمیوں سے ملاقات کی ہے، جو صحیح معنوں میں تقریر کا جوہر "جو سننے والوں کو مسحور کر دیتا ہے" رکھتے تھے۔

ہم بہت سے ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو اوروں کو اپنا ہم خیال بنانے میں بہت جلد کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ بذاتِ خود اپنی بات لوگوں سے نہیں منواتے بلکہ صرف اُن کی دلاویز تقریر اور میٹھی زبان دوسروں کو فوراً ماننے پر مجبور کرتی ہے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بالکل کم سخن ہوا کرتے ہیں مگر اُن کے الفاظ پُرمغز اور زوردار ہوتے ہیں، اور جو بات وہ ہمیں سمجھانا چاہتے ہیں فوراً ہمارے دلوں پر کالنقش فی الحجر ہو جاتی ہے۔

فنِ تقریر نے قدیم زمانہ میں آج سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ صورت اختیار کر لی تھی۔ مگر موجودہ دورِ تہذیب و تمدن نے اس میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا اور اُس کی ترقی محدود ہو گئی۔ پہلے تمام تعلیم زبانی دی جاتی تھی۔ تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بھی صرف زبان تھی۔ نہ اخبارات و رسائل جاری تھے اور نہ کتابیں بکثرت تصنیف ہوا کرتی تھیں۔

بیش قیمت جمادات و معدنیات کے انکشافات نے انسان کے لئے دولتِ بے کراں حاصل کرنے کا راستہ کھول دیا اور انسان کی زندگی میں ایک نمایاں انقلاب رونما ہو گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج جس کو دیکھئے صرف حصولِ جاہ و ثروت کے لئے سرگرمِ عمل نظر آتا ہے۔ فکر و تامل اور غور و خوض کے لئے مہلت ہی کس کو ہے جو فنِ تقریر کو ترقی دینے کی کوشش کرے آج کل اخبارات و رسائل کی وہ بھرمار ہے کہ ہر شخص دنیا بھر کی خبریں اور مفید ترین معلومات جن کی تدوین کے لئے ہزاروں روپے خرچ کئے جاتے ہیں، صرف چند پیسوں میں گھر بیٹھے حاصل کر سکتا ہے آج خیالات کو تقریر کے ذریعہ سے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی جتنی کہ پہلے تھی۔ آج کل طباعت اتنی ارزاں ہو گئی ہے کہ ایک غریب سے غریب آدمی چند روپے خرچ کر کے اتنی کتابیں حاصل کر سکتا ہے جتنی قرونِ وسطیٰ میں بڑے سے بڑے بادشاہوں کو ہزاروں روپیہ خرچ کرنے پر بھی حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔

انہی وجوہ کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنِ تقریر آج گویا ایک کھویا ہوا فن ہے۔ آج جس طرح عمدہ اور نغز گو مقررین کا کال ہے اُسی طرح کسی کو شستہ اور میٹھی زبان بولتے ہوئے سننا بھی نہایت مشکل ہے۔

فنِ تقریر کے سیکھنے میں مطالعہ سے بھی زیادہ تر مدد مل سکتی ہے۔ بہترین کتابوں کا مطالعہ صرف معلومات کو وسیع نہیں کرتا، بلکہ اس سے نئے نئے الفاظ بھی معلوم ہوتے ہیں اور ہمارے دماغ میں الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ محفوظ رہتا ہے جس سے تقریر کے دوران میں ہمیں سب سے زیادہ مدد ملتی ہے۔ بہت سے لوگ عمدہ خیالات رکھتے ہیں مگر انہیں الفاظ کی

قلت کی وجہ سے ظاہر نہیں کر سکتے۔ اُن کے پاس اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے اور دلچسپ بنانے کے لئے بہترین الفاظ ہی نہیں ہوتے۔ وہ بات چیت کرتے ہیں تو اپنے خیالات کے اظہار کی کوشش میں ایک ہی بات کو بار بار دہراتے ہیں اور ایک ہی دائرہ میں چکر لگاتے ہیں مگر اُن کو کوئی ایسا جامع لفظ نہیں ملتا جو اُن کو صاف طور پر ظاہر کر سکے۔

اگر تم ایک بہترین مقرر بننا چاہتے ہو تو تمہیں چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو، عمدہ مقررین کی صحبت اختیار کرو۔ اور بہترین سوسائٹی میں نشست و برخاست جاری رکھو۔ اگر تم عزلت نشین بن جاؤ گے تو ہرگز فنِ تقریر میں ترقی نہ کر سکو گے۔ اگرچہ تم عالم و فاضل ہی کیوں نہ ہو۔

مجھے اُن تمام لوگوں کے ساتھ اور خصوصاً اُن ڈرپوک اور شرمیلے افراد کے ساتھ نہایت ہمدردی ہے جنہیں اپنے خیالات کا گلا گھونٹ کر دبا رکھنا پڑتا ہے۔ جب وہ اُن کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں تو شرم اور گھبراہٹ انہیں بولنے سے روک دیتی ہے۔ شرمیلے نوجوانوں کو اکثر کالج یا سکولوں میں تقریر کرتے ہوئے اسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ کمزوری اُن ہی کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ ہر ایک مقرر اور خوش بیان کو بھی پہلے پہل پبلک میں تقریر کرتے ہوئے ایسی ہی حالت پیش آتی ہے اور اپنی لغزشوں اور غلطیوں کی بدولت اُس کو بھی پہلے پہل ندامت اٹھانی پڑتی ہے۔ فصیح و بلیغ گفتگو کرنے اور بہترین مقرر بننے کا یہی ایک طریق ہے کہ ہمیشہ اپنے خیالات کو زیادہ تر خوش اسلوبی اور سلاست کے ساتھ ظاہر کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔

اگر دورانِ تقریر میں خیالات تمہارے دماغ سے نکل جائیں اور تم ہکلانے لگو یا ٹپٹا جاؤ اور الفاظ تمہارے ذہن میں نہ آئیں تو یقین رکھو کہ تم اپنے خیالات کو مجتمع کرنے کی جتنی بھی کوشش کرو گے خواہ اُس میں ناکامی ہی کیوں نہ ہو تمہیں دوسرے وقت تقریر کرنے میں اتنی ہی آسانی پیدا ہو گی۔ یہ بخوبی یاد رہے کہ جو شخص لگاتار کوشش کرتا ہے گا وہ بہت جلد اپنے نقائص و اسقام کو دور کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اُس کے لئے اپنے خیالات کے حسنِ اظہار میں آسانیاں پیدا ہوتی جائیں گی۔

ہم بہت سے لوگوں کو نقصان اُٹھاتے ہوئے دیکھتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ اپنے خیالات کو دلچسپ اور زوردار زبان میں ظاہر کرنا نہیں جانتے۔ ہم عام جلسوں میں جہاں اہم مسائل پر مباحثہ ہو رہا ہو، اکثر ہوشیار اور صاحبِ فراست آدمیوں کو خاموش بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں کیونکہ ان میں اتنی قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خیالات کو بخوبی ظاہر کر سکیں، حالانکہ انہیں اُن لوگوں سے زیادہ معلومات حاصل ہوتے ہیں جو باوصف اپنی ہیچمدانی کے زیادہ تر تقریر میں حصہ لیتے ہیں۔

اکثر لوگ اور خصوصاً طلبہ یہ خیال کرتے معلوم ہوتے ہیں کہ اُن کے لئے زندگی میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری

کام یہ ہے کہ جتنی قیمتی باتیں دماغ میں سما سکیں حاصل کرلیں۔ گو یہ خیال ایک حد تک مفید ہے، لیکن اگر وہ اسی پر اکتفا کرنا پسند کرتے ہیں تو یہ اُن کی سخت غلطی ہے کیونکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی نہایت ضروری ہے کہ اپنے معلومات کو کس طرح دلچسپ پیرایہ میں ظاہر کیا جائے۔ تم ایک طالب علم بن سکتے ہو، تم تاریخ اور پولیٹکس میں خوب مہارت حاصل کر سکتے ہو۔ تم سائنس علم ادب اور اَور فنون میں تعجب خیز کمال پیدا کر سکتے ہو تاہم اگر تمہارے معلومات صرف تمہارے دماغ میں بند رہیں تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اور تم ہمیشہ گھاٹے میں رہوگے۔

وہ لیاقت جو کسی پر ظاہر نہ کی جائے، انفرادی طور پر کسی حد تک تسکین بخش ہو سکتی ہے، مگر یہ ضروری ہے کہ اُس کو بجائے بند رکھنے کے میدان میں لایا جائے اور اُس کو جہاں تک ہو سکے دل نشین انداز میں ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ دنیا کو اُس کے حسن و قبح کے اندازہ لگانے کا موقع ملے۔

وہ ہیرا جو ابھی پتھر کے اندر چھپا ہوا ہو، خواہ کتنا ہی بیش قیمت کیوں نہ ہو، کوئی شخص اُس کی قدر نہیں کریگا۔ تاوقتیکہ اُس کو قلبِ حجر سے نکال کر باہر نہ لایا جائے اور اُس کی آب و تاب لوگوں پر ظاہر نہ ہو جائے۔ اسی طرح انسان کی وہ قابلیت اور کمال جو سینہ کے اندر محفوظ ہو اُس ہیرے کے مانند ہے جو پتھر کے اندر چھپا ہوا ہو۔ تقریر انسان کے کمالات کو نہیں بڑھاتی بلکہ منظرِ عام پر لاتی ہے۔ اسی طرح، جیسے ہیرے کو جلا دینے سے اس میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا بلکہ صرف اُس کی قدر و قیمت ظاہر ہوتی ہے۔

بہت کم والدین کو اُس نقصان کا احساس ہوتا ہے جو وہ اپنے بچوں کو فنِ تقریر کی بیش قیمت قابلیتوں سے نابلد اور مجہول رکھنے کی صورت میں پہنچاتے ہیں۔ بچوں کو گھروں کے اندر بالکل بے ترتیبی کے ساتھ گفتگو کرنے کی اجازت دے کر زبان کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔

ہر قسم کے مضمون پر عمدہ، دلچسپ و نفیس گفتگو کرنے کی بلاناغہ مشق کرنے سے انسان کے دماغ اور اخلاق پر بھی نیک اثر پڑتا ہے۔ اپنے خیالات کو پاک زبان اور دلچسپ صورت میں ظاہر کرنے کی باقاعدہ کوشش کرنا بھی ایک شاندار فن ہے۔ ہم بہت سے ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جنہوں نے گو بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں تعلیم نہیں حاصل کی مگر ایسی عمدہ اور شستہ تقریر کا ملکہ رکھتے ہیں کہ سننے والے کے دل میں اُن کی عظمتِ شان اور تبحرِ علمی کا گہرا نقش بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس بہتیرے کالج کے تعلیم یافتہ مگر فنِ تقریر سے بے بہرہ افراد محفلوں میں مقررین کا صرف منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور خود تقریر میں حصہ لینے سے ہچکچاتے ہیں۔ لوگ اُن کی خاموشی کو کم مائیگی پر محمول کرتے ہیں اور عمدہ مقرر اپنی بے بضاعتی کے باوجود لوگوں سے خراجِ تحسین وصول کر لیتا ہے۔

کسی علم کے حاصل کرنے کے لئے طالب علم کو ایک محدود سکول یا کالج میں چند سال تک صرف چند گھنٹے روزانہ حاضر رہنا پڑتا ہے، مگر فنِ تقریر کے سیکھنے کے لئے کسی مقررہ وقت یا جگہ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کی تعلیم ایک ایسے مدرسہ میں ہوتی ہے جو ہمیشہ کے لئے کھلا رہتا ہے۔ اور جس کا جی چاہے اس مدرسہ میں اپنی کوشش سے عمدہ ترین مقرر بن سکتا ہے۔

تقریر ہی کے ذریعہ سے آدمی کی لیاقت اور اُس کا علم وفضل ظاہر ہوتا ہے۔ یہی چیز خیالات کو متحرک کرتی ہے اسی کے ذریعہ سے اپنی قابلیت اور استعداد بڑھائی جا سکتی ہے۔ اگر ہم بہترین مقرر بن جائیں اور لوگوں کے دل اپنی خوش بیانی کے ذریعہ سے مسخر کرنا سیکھ لیں تو خود اعتمادی اور خودداری کا جذبہ بھی ہمارے دلوں میں خود بخود پیدا ہو جائیگا

کوئی شخص خود اپنی ذاتی لیاقت اُس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک کہ وہ اپنی قابلیت لوگوں پر ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرے۔ لوگوں پر اپنی استعداد ظاہر کرنے سے دماغ کے راستے کھل جاتے ہیں اور ذہنی قوتوں میں چستی و چالاکی عود کر آتی ہے۔ ہر عمدہ مقرر سامع کے ذریعہ سے اپنے آپ میں ایک ایسی قوت محسوس کرتا ہے جس کو پہلے اُس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ قوت اکثر مقرر کے دل میں تازہ جد وجہد کی روح پھونک دیتی ہے۔ جس طرح دو کیمیائی اجزا کی ترکیب سے ایک تیسری چیز پیدا ہوتی ہے، اسی طرح ایک خیال کے دوسرے خیال کے ساتھ اور ایک دماغ کے دوسرے دماغ کے ساتھ ملنے سے ایک نیا حوصلہ اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

عمدہ تقریر کرنے کے لئے اوروں کی تقریر کو غور کے ساتھ سننا بھی نہایت ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کی تقریر سے عمدہ عمدہ باتیں اخذ کرنی چاہئیں تاکہ اُن سے اپنی تقریر میں کچھ مدد مل سکے۔

ہم صرف تقریر ہی میں پیچھے نہیں ہیں بلکہ کسی کی بات سننے میں بھی تکابل و تکاسل سے کام لیا کرتے ہیں۔ ہم میں یہ بُری عادت ہے کہ کسی کی تقریر سننے کے وقت نہایت بے صبری کا اظہار کرتے ہیں۔ نہایت توجہ اور شوق کے ساتھ سننا تو درکنار، مقرر کی عزت کا لحاظ کرتے ہوئے خاموش بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اِدھر اُدھر بے صبری کے ساتھ نظر دوڑاتے ہیں۔ اور غالباً اپنی گھڑی کی زنجیر کے ساتھ کھیلتے ہیں یا اپنی انگلیوں سے کسی میز یا کرسی پر طنبور بجانے لگتے ہیں۔ کبھی متجسسانہ نظروں کے ساتھ اس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں گویا کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ غرض اپنی بیہودہ حرکات سے مقرر کو اپنی تقریر بھی پوری نہیں کرنے دیتے۔ ہم میں اتنی جلد بازی اور بے صبری ہے کہ ہم پوری تقریر سننا بھی پسند نہیں کرتے حصولِ دولت کی کوشش میں اِدھر اُدھر پھرنا اور ہجوم کو چیرتے پھاڑتے ہوئے اپنا راستہ بنا لینا ہمیں خوب آتا ہے لطیفے، غزلیات وغیرہ سننے کے لئے ہمارے پاس وقت ہے

فضول اور بیہودہ باتیں کرنے کے لئے ہمیں فرصت مل جاتی ہے۔ مگر اپنی تقریر میں شیرینی اور الفاظ میں نفاست پیدا کرنے
کے لئے یا کسی کی تقریر کو غور سے سننے کے لئے ہمیں وقت نہیں ملتا۔

قدیم زمانہ میں کسی بہترین مقرر کی تقریر کو سننا باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ لوگ نہایت دلی شوق اور خوشی کے ساتھ مقرر
کے اردگرد کثیر تعداد میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ نیز وہ تقریریں بھی اتنی موثر اور کارآمد ہوا کرتی تھیں کہ موجودہ دور تہذیب
وتمدن کے لکچروں اور بیش قیمت کتابوں کی پند آموز تحریروں میں بھی وہ اثر اور فائدہ نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ
اُن تقریروں میں مقرر کی شخصیت کا زیادہ تر اثر ہوا کرتا تھا۔ اُس کی خوش خلقی اور پسندیدہ اوضاع و اطوار میں ایک سحر
ہوتا تھا، ایک مقناطیسی کشش ہوا کرتی تھی جو لوگوں کے قلوب کو اپنی طرف مائل کر لیتی تھی۔ اُن لوگوں کے لئے جو علم کی
حقیقی پیاس رکھتے تھے ایسی تقریریں شاہی ضیافتوں سے کم نہیں ہوا کرتی تھیں —— مگر آج ہر کام اور ہر بات میں
جلد بازی اور بے پروائی ہمار [illegible] ہم کو چلتے چلتے کچھ دیر توقف کرنے اور اچھی طرح سلام کرنے تک کی مہلت
نہیں ملتی۔ بجائے "السلام علیکم" کے صرف "سم" [illegible] "ور خیریت" کے بجائے صرف "خیت" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں تعظیم کے
لئے سر جھکانا بھی تضیع اوقات سمجھا جاتا ہے۔ صرف سر کا اشارہ کر دینے سے اپنا مطلب نکال لینا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس
اخلاق حسنہ پیدا کرنے کے لئے وقت ہی نہیں اور دوسرے بیہودہ افعال کے لئے خوب وقت نکل آتا ہے۔ ہم میں تہذیب
وتمدن کیا آئے قدیم زمانہ کی برکتیں اور دلچسپیاں نیست و نابود ہو گئیں۔ ہم نے اپنے اوقات کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ دن
کو خوب کام کریں اور شام کو کسی تھیٹر یا تفریح گاہ میں جا بیٹھیں۔

ہم اپنی تفریح کے لئے اوروں کو تو اُجرت دیتے ہیں مگر اپنی تفریح کا سامان آپ مہیا کرنے یا اپنی طبعی ظرافت اور
خوش طبعی کو کام میں لانے کی ہرگز کوشش نہیں کرتے۔ ہماری مثال اُن لڑکوں کی سی ہے جو صرف اپنے اساتذہ پر بھروسا کئے
بیٹھے رہتے ہیں تاکہ وہ امتحان میں انہیں کامیاب بنا دیں اور آپ تھوڑی سی بھی تکالیف اٹھائے بغیر علم و لیاقت کو بنی بنائی
چیز کی طرح خرید لیں۔

ہماری زندگی میں بناوٹ اور تکلف بھرا ہوا ہے۔ ہمارے طرز معاشرت و تمدن میں بے لوث اور پاک و صاف
زندگی کا امکان ہی نہیں پایا جاتا۔ طبعی ظرافت اور اپنی شخصیت کی سحر آفرینی ہم میں مفقود ہے۔

فن تقریر میں ہمارے اس درجہ تنزل و انحطاط کا سبب یہ ہے کہ ہم میں ہمدردی بنی نوع انسان کا کال ہے۔ ہماری
طبیعت میں خود غرضی پائی جاتی ہے۔ اور ہر کام میں صرف ذاتی بہبود کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد
الگ بنانا اور صرف اپنے فائدے کی تدابیر سوچنا ہمارا معمول ہے۔ یاد رکھو کہ وہی تقریر سب سے عمدہ ہو سکتی ہے جس میں محاسن
ظاہری کے ساتھ معنوی خوبیاں بھی موجود ہوں اور وہی مقرر بہترین کہلا سکتا ہے جس کی زبان فصیح ہونے کے ساتھ

ساتھ اُس کے دل میں انسانی ہمدردی بھی موجود ہو اور دوسروں کی زندگی میں وہ دخل پیدا کرنے کی قابلیت بھی رکھتا ہو۔

والٹر بسنٹ ایک عورت کے متعلق کہا کرتے تھے کہ وہ ایک بہترین بذلہ سنج اور شیریں بیان کی حیثیت سے لوگوں میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی حالانکہ وہ بولتی بالکل کم تھی۔ وہ نہایت ہمدرد اور خیر خواہ تھی اور حتی الامکان شرمیلے اور ڈرپوک مقررین کو ہمت دلانے میں کبھی کوتاہی نہ کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتی تھی کہ مقرر اپنے آپ کو گھر میں بیٹھے باتیں کرتا ہوا سمجھے۔ ڈرپوک نوجوانوں کے دلوں سے ڈر اور گھبراہٹ دور کرنے کی ہر ممکن طریقہ سے کوشش کیا کرتی تھی چنانچہ اکثر لوگ جن کی زبان دوسرے مواقع پر دورانِ تقریر میں لڑکھڑانے لگتی تھی اس کی موجودگی میں ایسی شستہ اور فصیح و بلیغ تقریر کرنے لگتے تھے کہ سننے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ لوگ اس کو بہترین مقررہ کہتے تھے کیونکہ اُس میں دوسروں کی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ موجود تھا

اگر تم ہر دلعزیز بننا چاہتے ہو اور فنِ تقریر میں شانِ امتیاز پیدا کرنے کی خواہش رکھتے ہو تو تمہیں لازم ہے کہ اُن لوگوں کی زندگی میں دخل پیدا کرو جن کے سامنے تم تقریر کر رہے ہو۔ جو کچھ کہو، اُن کے رُجحان اور دلچسپی کے مطابق کہو۔ گو کسی مضمون کے متعلق تمہارے معلومات کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں لیکن اگر اس سے سامعین نے کچھ دلچسپی نہ لی تو تمہاری تمام کوششیں اکارت جائیں گی۔

بڑے بڑے مقررین اکثر ناصح ہوا کرتے ہیں وہ اپنی خوش طبعی کے ذریعہ سے لوگوں کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اگر تم بھی لوگوں کا دل بہلانا چاہو تو اتنا ضرور یاد رکھو کہ اس کوشش میں کہیں اُن کی دل آزاری نہ ہو جائے۔ اُن کے خاندان کی دبی ہوئی ہڈیاں نہ اکھیڑو۔ بعض لوگوں میں یہ عُمدہ صفت ہے کہ وہ صرف ہماری خوبیوں کو ڈھونڈتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو صرف برائیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تقریر آزاردہ ہونے کے سوا کچھ سودمند نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ بلند پایہ مقرر ہمیشہ ایسی باتوں سے احتراز کرتا ہے جن سے اوروں کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہو۔ وہ کبھی اُن پہلوؤں پر گفتگو نہیں کرتا جن سے کسی کے عیوب و نقائص کا اظہار ہو۔ اُس کی نظر ہمیشہ لوگوں کے عیوب کے بجائے محاسن پر پڑتی ہے۔

لنکن اپنی ذات کو لوگوں کی تفریح اور دلچسپی کا ذریعہ بنانے میں نہایت کامیاب استاد تھا۔ وہ اپنی مزیدار کہانیوں اور لطیفوں سے لوگوں کو اس قدر خوش کیا کرتا تھا کہ لوگ اپنے دلی خزانے اُس کے سامنے بلا کم و کاست کھول کر رکھ دیتے تھے اور انہیں اس بات کا احساس تک نہ ہوتا تھا کہ اُن کا مخاطب ایک پرایا شخص ہے۔ اجنبی لوگ اس کی صحبت سے حظ اُٹھایا کرتے تھے کیونکہ وہ نہایت بذلہ سنج تھا اور لوگوں کو اپنے معلومات کے ذریعہ سے بے حد فائدہ پہنچایا کرتا تھا۔

گو طبعی ظرافت جیسا کہ لنکن میں موجود تھی، تقریر کی دلپذیری اور زور و قوت میں اضافہ کرتی ہے مگر ہر شخص بذلہ سنج اور ظریف نہیں بن سکتا۔ اگر تم میں یہ صفت نہیں ہے تو حتی الامکان اس کے پیدا کرنے کی کوشش کرو۔

باکمال مقرر بالکل ہی سنجیدہ اور خشک مزاج نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ حقائق ہی سے بحث نہیں کرتا خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں۔ صرف حقائق اور حالات تمدن کے متعلق گفتگو کرنے سے سننے والا تھک جاتا ہے مقرر کے لئے سب سے زیادہ اہم اور ضروری امر یہ ہے کہ وہ زندہ دل ہو۔ جس طرح روشنی کی زیادتی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اسی طرح ثقیل گفتگو بھی انسان کی طبیعت کو منغص کر دیتی ہے۔

بلند پایہ مقرر بننے کے لئے اپنے آپ میں بے تکلفی، خوش طبعی اور زندہ دلی پیدا کرنی چاہیے۔ دل میں عمدہ خیالات اور ہمدردی بنی نوعِ انسان کا احساس ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ تقریر کا موضوع ایسا ہونا چاہیے کہ عام لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ جہاں تک ہو سکے لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف پھیرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور تم اپنی اس کوشش میں اُسی وقت کامیاب ہو سکو گے جب کہ تم میں انسانی ہمدردی اور غمخواری کا جذبہ موجود ہو۔ اگر تم سرد مہر، خشک مزاج اور شقی القلب ہو تو کوئی تمہاری طرف توجہ تک نہ کرے گا۔

ہر مقرر کے لئے ضروری ہے کہ وہ آزاد منش اور وسیع الخیال ہو۔ ایک تنگ خیال اور کوتاہ نظر آدمی ہرگز اچھی طرح تقریر نہیں کر سکتا۔ دورانِ تقریر میں اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ تمہاری باتوں سے لوگوں کے دل زخمی نہ ہوں۔ کیونکہ جب وہ آدمی جو تمہارے جذبات و حسیات کو صدمہ پہنچانے کا باعث ہو کبھی تمہاری نظر میں محبوب نہیں ہو سکتا تو تمہاری تقریر بھی جب سے لوگوں کے جذبات کو صدمہ پہنچے کس طرح مقبولِ عام ہونے کا شرف حاصل کر سکے گی۔ غرض دل آزار تقریر کا نتیجہ یہی ہوگا کہ لوگ اپنے دل کے راستے تمہارے لئے بند کر دیں گے اور تمہاری قوتِ جاذبہ منقطع ہو جائے گی جس کے بعد تمہاری تقریر کے بے معنی اور مردہ ہونے میں کیا باقی رہ جاتا ہے۔

ہر ایک مقرر کو چاہیے کہ سامع کو اپنے نزدیک لانے کی کوشش کرے اور خوب دل کھول کر اپنے خیالات کو آزادانہ طور پر ظاہر کرے۔ سامع کے دل میں جن جن شکوک اور اعتراضات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، اُن کے تشفی بخش جواب دے تاکہ سامع کے دل میں مقرر کی عظمت اور تبحرِ علمی کا نقش بیٹھ جائے۔

جس کسی شخص نے کہیں بھی کامیابی حاصل کی ہے وہ ضرور اپنی شخصیت یا قوتِ تقریر کے ذریعہ سے کی ہے۔ کسی باکمال مقرر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی علمی قابلیت کا لوگوں میں تذکرہ کرتا پھرے بلکہ صرف اُس کی تقریر ہی لوگوں کے دلوں پر اُس کی عظمت کا سکہ بٹھا دے گی۔ غرض ہر شخص کی قابلیت و استعداد کا مظہر صرف تقریر ہے۔

آخر میں میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ تمہاری طبعی لیاقت یا تمہارا علم و فضل یا لباس فاخرہ کچھ کام نہ آئے گا۔ یہاں تک کہ دولت بھی تمہیں لوگوں کی نظروں میں محبوب نہ بنا سکے گی جب تک کہ تم اپنی لیاقت کو عمدہ تقریر کے ذریعہ سے ظاہر نہ کرو گے۔

(ترجمہ) ابوسعید محمد عبدالقیوم

رباعیات

خدا

تو وہ ہے جسے غم میں پکارا ہم نے
تو وہ ہے جسے پایا دل اپنے میں ہم نے
تو وہ ہے کہ سنی جس نے دعائے مضطر
لیکن دی کی تمیز سے گریہ ہم نے

توحید

بے مثل مثال میں کہاں سے لاؤں
بالفرض مجال میں کہاں سے لاؤں
جو ہو نہ خلاف تیری یکتائی کے
ایسا وہ خیال میں کہاں سے لاؤں

توحید

ہر شے میں ہے تو یہ سبب حیرانی ہے
تحقیق خدا کی کس سے ادانی ہے
بے وجہ نہیں صدمۂ تنظیم جہاں
مقصود کہ واحد و لاثانی ہے

تنبیہ

غنچے پہ نسیم ہے سمجھ گویا آب
اور پھول پہ شبنم ہے سمجھ گویا آب
عبرت کا مقام ہے یہ اللہ اللہ
بندہ نہ سمجھ ہے سمجھ گویا آب

گویا
جہان آبادی

دمینتی

ہندوادبیات کی تمام ہیروئنز میں ایک بات مشترک ہے، محبت اُن کی زندگی کی روحِ رواں ہے۔ دمینتی کا درجہ ساوتری یا شکنتلا سے کسی طرح کم نہیں۔ دمینتی کی محبت حدِ دیوانگی تک پہنچ جاتی ہے، اور وہ ایک ایسا جوش جنون ہے جس کی مثال مشرقی ادبیات میں بھی ملنی محال ہے۔

دمینتی کے عشق کی ابتدا ساوتری کے عشق سے زیادہ تخیلانہ ہے

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

کا معاملہ ہے۔ ایک سارس سے وہ نل کی کیفیت سن پاتی ہے اور نل کے لئے اُس کا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ اُس کے سوئمبر کو دنیاوی شہزادے ہی زیب نہیں دیتے بلکہ آسمانی دیوتا بصورتِ انسانی اس کے سوئمبر کی رونق وشان کو دوبالا کرتے ہیں۔ اُسے انتخاب میں اور بھی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے جب کہ تمام دیوتا نل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے محبوب کا انتخاب اپنی خطا نہ کرنے والی عقل سے کر لیتی ہے اور اپنے آسمانی چاہنے والوں کو ٹھکرا کر نل کے گلے میں جے مال ڈال دیتی ہے۔ شادی اور خانہ آبادی کے تھوڑے عرصہ بعد اُس کو وہ دولتِ عظمیٰ میسر ہوتی ہے جس کو زن وشوہر کی محبت کا ثمرہ کہتے ہیں۔ اُس کے ہاں ایک بچہ اور ایک بچی یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے ہیں۔

نل پر ایک بد دعا کا اثر ہوا اُس کی زندگی بدبختیوں کی آماجگاہ بن گئی۔ ایک ساعتِ نحس میں اُس نے اپنے بھائی پشکارا سے قماربازی شروع کی تقدیر کی تحریر پوری ہوئی۔ نل داؤں پر داؤں ہارتا گیا۔ ہر ایک ہارا ہوا داؤں سمندِ شوق کو تازیانہ ہوتا گیا۔ بالآخر گھوڑے، گاڑیاں، شاہانہ ملبوسات، جواہرات، تاج اور تخت تمام چیزیں اس کھیل کی نذر کر دیں اور قلاش ہو گیا۔

بھائی نے بے نوا بھائی کو طنزاً کہا "آؤ ایک دفعہ اور پانسا پھینکیں لیکن تمہارے پاس داؤں پر لگانے کو کیا ہے؟ تمہارے پاس سوائے دمینتی کے اور کچھ بھی نہیں۔ اچھا آؤ اور اُسی کی قسمت کا فیصلہ کر لو"۔ نل نے ان الفاظ کو سنا اُس کا دل رنج اور غصہ سے بیٹھ گیا۔ اُس نے جواب میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ صرف بھائی کی طرف غصہ اور حقارت سے بھری ہوئی ایک نظر ڈالی، اپنی شاہانہ پوشاک اتار دی اور بدن پر صرف ایک کپڑا لے کر شہر سے باہر نکل آیا۔ وفادار دمینتی بالکل ایسی حالت میں اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔ تین شب و روز وہ شہر پناہ کے باہر پڑے رہے چوتھے دن پشکارا نے اپنی

سلطنت میں اعلانِ عام کیا کہ جو شخص نل کو کسی قسم کی امداد دے گا وہ کشتنی اور گردن زدنی ہوگا۔

اس اعلان پر راجہ اور رانی بنوں کی طرف چل دیئے۔ رنج و غربت اُن کی شریکِ سفر اور فاقہ کشی اُن کی رفیق تھی ایک دن انہوں نے سنہری پرندوں کی ایک ٹکڑی اپنے سامنے اترتی دیکھی۔ نل نے خوراک کے لئے اُن کو پکڑنا چاہا۔ دبے پاؤں گیا کپڑا اُن پر ڈال دیا جس کو لے کر وہ اُڑ گئے۔ اب راجہ نل اور رانی دمینتی کے پاس صرف ایک کپڑا رہ گیا جس کو وہ مشترک طور پر استعمال کرتے تھے۔

نل نے دمینتی کو ان افسوسناک تکالیف میں دیکھ کر کہا "تم اپنے والدین کے گھر چلی جاؤ۔ مجھے قسمت کے ساتھ لڑنے کے لئے اکیلا چھوڑ دو" لیکن دمینتی کا دل اس صلاح سے بالکل متزلزل نہ ہوا۔ بلکہ اُس نے جواب دیا "کیا میں آپ کو اس بے پایاں جنگل میں اور ایسی مصیبت میں اکیلا چھوڑ سکتی ہوں؟ آہ میرے پیارے خاوند ہرگز نہیں ہرگز نہیں جب تم گزشتہ خوشیوں کو یاد کرکے اس ویرانے میں رویا کرو گے میں تمہیں تسکین دے کر اور پروانہ وار تم پر نثار ہو کر تمہارے رنج اور تمہاری کلفتوں کو دُور کیا کروں گی۔ دانشمندوں کا قول ہے "مصیبت میں عفت شعار و وفادار بیوی کی محبت سے بڑھ کر کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی"

ان الفاظ کی حقیقی قدر و قیمت ہمیں اُسی وقت معلوم ہوتی ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ دمینتی ایک زبردست مہاراجہ کی بیٹی تھی۔ وہ اس قسم کے ناز و نعم کی پروردہ تھی جو شفقتِ پدری ایک اکلوتی بچی کے لئے شاہی محلات میں مہیا کر سکتی ہے ایک سو نوکر ہر وقت اُس کی خدمت گزاری کے لئے حاضر رہتے اور ایک سو لونڈیاں ہر لمحہ اُس کے لئے گوش بر آواز رہتی تھیں۔

نشادا کا تاجدار اور اُس کی ملکہ مصیبتوں تکلیفوں اور بھوک پیاس کے مارے بہت دن سرگردان رہے۔ آخر ایک کٹیا نظر پڑی وہ اس میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ننگی زمین پر گرا دیا اور سو گئے لیکن نل کو نیند کہاں۔ وہ جاگ اُٹھا دیکھا کہ دمینتی ابھی محوِ خواب ہے۔ اُس نے فرار ہو جانے کا عزمِ صمیم کر لیا۔ مشترکہ کپڑے کو قطع کیا، دبے پاؤں کٹیا سے باہر اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس وقت نل کی قوتِ ارادی ایک خبیث روح کی تابع فرمان تھی جو اُس بددعا کی وجہ سے اُس پر مسلط تھی جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

دمینتی کی آنکھ کھلی۔ نل پہلو میں نہیں تھا۔ پہلے پہل اُس نے اس بات کو باور نہ کیا کہ واقعی اُس کے خاوند نے اُس کے ساتھ بے وفائی کی ہے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ تنہائی کو محسوس کرنے لگی۔ اور چلا اُٹھی "اے میرے آقا! تم نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں اپنی ذات کے لئے نہیں روتی، بلکہ یہ خیال میرے دل کو بے چین کر رہا ہے کہ تم تنہا کیسے رہو گے؟ میں تمہارے لئے روتی ہوں۔ تم سفر میں تھکے ماندے ہو گے، بھوکے ہو گے تو تم کیا کرو گے۔ اندھیری راتوں میں گھنے درختوں میں، کیا پاس تسلی دینے اور غم غلط کرنے کے لئے میں نہیں ہوں گی؟"

وہ نل کی تلاش میں دُور دراز جنگلوں میں سرگرداں پھرتی رہی۔ انتہا درجہ کی دیوانگی اور رنجیدگی میں قدم قدم پر نئے خطرات اور نئی مصیبتوں کا مقابلہ کرتی رہی۔ خبیث روحیں، جنگل کے سیاہ دیو، وحشی درندے اُسے ڈراتے رہے اور وہ اکثر غش کھا کر گر جاتی رہی۔

راستوں پر انسان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ جنگل کے اونچے درختوں، سر بفلک پہاڑوں، عمیق دریاؤں اور شفاف چشموں سے استغاثہ کرتی۔ جتی کہ جنگل کے وحشی درندوں سے پوچھتی کہ تمہیں میرے آقا کی کچھ خبر ہے؟ خاوند کی تلاش میں دمینتی کی دشت نوردیوں کا مفصل احوال بیان کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے کہ کس طرح دیو کے جبڑوں میں گرتے گرتے بچی کس طرح اُس نے دیو کو آتش عصمت سے جلا کر خاک کر ڈالا۔ کس طرح اُس کی پاکیزگی نے اُسے دہشتناک جنوں سے رہائی دی۔ کس طرح اُس نے اپنی سرگردانیوں کو خیرباد کہی اور سبا ہو پہنچی۔ وہاں کی رانی نے اس پر رحم کھا کر اُس کو پناہ دی اور پھر اُس کو زبردست حفاظت میں اس کے باپ کے ہاں پہنچا دیا۔

اس عرصہ میں نل سفر پر سفر کرتا رہا۔ وہ دمینتی سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے بھاگ رہا تھا۔ دمینتی کو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہ کرسکا۔ بالآخر وہ اجودھیا کے راجہ رتو پرنہ کے دربار میں پہنچ گیا، اپنے آپ کو دیش بدر راجہ نل کا گاڑی بان ظاہر کیا۔ اور اسی حیثیت سے اجودھیا میں چند سال بسر کر دیئے۔

دمینتی باپ کے ہاں پہنچی اور نل کی تلاش میں اطراف و جوانب کو برہمن روانہ کئے۔ اُن میں سے ایک نے واپس آکر اطلاع دی کہ اجودھیا میں ایک آدمی ہے جس کی نسبت اُس کا گمان یقین کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ وہ آدمی راجہ رتو پرنہ کا گاڑی بان ہے یعنی وہوکا ہے۔ دمینتی نے نل کو اُس کی جائے پناہ سے باہر نکالنے کے لئے نہایت زبردست چال اختراع کی۔

اُس نے راجہ رتو پرنہ کے دربار میں آدمی روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ کل شہزادی دمینتی کا دوسرا سوئمبر ہے، کیونکہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اُس کے پہلے خاوند کا کیا حشر ہوا۔ نل نے سنا، اُس کے دل پر جو اثر ہوا اُس کو وہی خوب جانتا تھا۔ پیچ و تاب کھائے اور چپ ہو رہا۔ مگر اس کو اس بات کا یقین نہ آتا تھا کہ دمینتی تکالیف سے یہاں تک مغلوب ہو گئی ہے کہ دوسرا خاوند تلاش کرنے پر اتر آئی ہے۔ یہ خیال بھی اُسے آتا کہ شاید دوبارہ وصال کے لئے یہ تجویز سوچی گئی ہو گی۔ پھر بھی وہ متفکر سا ہو گیا۔

دمینتی کا باپ ودربھا کا راجہ تھا۔ اجودھیا اور ودربھا کا درمیانی فاصلہ ایک سو یوجن تھا۔ اس فاصلہ کو ایک دن میں طے کرنے والا صرف ایک ہی گاڑی بان تھا۔ وہ خود راجہ نل تھا۔ دمینتی اس بات کو جانتی تھی کہ اگر راجہ

رتوپرنہ فرضی سوئمبر میں شامل ہونے کے لئے پہنچ گیا تو اُس کا گاڑی بان سوائے نل کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور بالکل اسی طرح واقعہ ہوا۔ رتوپرنہ وقت معینہ پر پہنچ گیا۔ اُس کی گاڑی کے پہیوں کا شور سُن کر شہزادی بے چین ہوگئی اور اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ ایسی زبردست آواز گاڑی سے صرف اُسی وقت نکل سکتی ہے جب کہ گاڑیبان راجہ نل ہو۔ جب کئی اور نشانات سے اُس کو پورا یقین ہوگیا اور اُس کی تسلی ہو گئی کہ اُس کا گم شدہ شوہر واپس آگیا ہے تو وہ محل کے اندرونی حصہ سے اُس کے ملنے کے لئے بلاپس وپیش باہر آ گئی۔ اُس نے بولنے کی کوشش کی لیکن فرطِ جذبات نے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ اس میں ذرا سکت آئی تو دوبارہ بولنے کی کوشش کی۔ اُس کے پہلے الفاظ طعن وملامت کے الفاظ نہ تھے بلکہ شبہات سے مملو تھے۔ کیونکہ عرصہ کی مایوسی نے شکوک وشبہات کو اُس کے دل میں پیوست کردیا تھا "اے دھوکا" اُس نے کہا "اگر تمہارا نام دھوکا ہی ہے کیا تم ایک فرشتہ خصلت انسان کی نسبت کچھ جانتے ہو جو سنسان جنگلوں میں اپنی مشتاق اور معصوم بیوی کو سوتی چھوڑ گیا۔ میں تمہیں اُس کا نام ہی کیوں نہ بتادوں۔ اُس کا نام نل ہے۔ کیا میں نے نادانستہ بھی اُس کا کوئی قصور کیا تھا کہ وہ جنگل میں مجھے سوتے چھوڑ جاتا۔ میں نے دیوتاؤں کے روبرو اُس کو اپنا بر انتخاب کیا۔ میں نے دیوتاؤں کے جذبات کو بھی ٹھکرادیا۔ مجھے صرف یہی بتادو کہ کس طرح یہ شہزادہ اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا تھا جب کہ وہ اُس کے بچوں کی ماں ہو جب کہ بیوی کے دل میں اُس کے لئے ابدی محبت موجود ہو"

نل نے اُسے بتایا کہ جو تکالیف اُسے برداشت کرنی پڑیں وہ ایک خبیث روح کا اثر تھیں۔ اس میں کسی کا قصور نہ تھا۔

"لیکن" اُس نے کہا "مجھے اس بات کا جواب دو کہ ایک وفاشعار بیوی دوسرے بر کا انتخاب کس طرح کر سکتی ہے"

دمینتی نے تمام راز ظاہر کردیا کہ ایسا صرف نل کو واپس بلانے کے لئے کیا گیا تھا۔

دمینتی کی کہانی بھی شکنتلا کے فسانے کی طرح اخیر میں آکر فوق العادت آلائش سے پاک نہیں رہی۔ نل کو ایک آکاش بانی یقین دلاتی ہے کہ دمینتی ہمیشہ وفادار رہی ہے۔ اور انجام مکمل خوشی پر کرنے کے لئے شاعر نے نل کو اپنے بھائی پشکارا سے جوا کھیل کر کھوئی ہوئی دولت اور حکومت جیتتے اور اپنی مملکت پر بلا شرکتِ غیرے راج کرتے دکھلایا ہے۔

فضل محمد جگرانوی

غم نصیب

سیاہ بادل ہیں آسماں پر ہوائے سرشار آرہی ہے
نظر کے آگے کھلے ہوئے ہیں تمام بھولے ہوئے مناظر
ترانہ بردوش آرہی ہیں کچھ اس طرح جاں فزا ہوائیں
پکھل رہا ہے کہ بال کھولے بہار کی عشوہ کار دیوی
حریم گلشن میں ہیں فروزاں گلوں کی لبریز نور شمعیں
مثالِ آغوشِ عشق وا ہے، حریم دل کا ہر اک دریچہ
زمیں کے سینہ میں مضطرب ہیں چمن کی ترتیبِ نو کے جلوے
حسین جلووں کی اس جھلک سے دھوئیں ہیں ان تیرہ بادلوں کے

ہر ایک ذرہ چمک رہا ہے ہر اک کلی مسکرا رہی ہے
کہ دھیمی دھیمی صدائے بارش، دماغ کو گدگدا رہی ہے
کہ جیسے کچھ دور اک دوشیزہ ستار کی دھن پہ گا رہی ہے
جو ہیں نہاں جنبشِ نظر میں، وہ قوتیں آزما رہی ہے
فضائے صحرا میں ہر طرف اک حیاتِ نو مسکرا رہی ہے
کہ حسن کی اک لطیف تابش نظر کے پردے جلا رہی ہے
فروغِ بزمِ خزاں ہوئی تھی جو شمع اب جھلملا رہی ہے
یہ ہے نمایاں کہ صبحِ روشن، نقابِ فطرت اٹھا رہی ہے

مگر وہی کشمکش ہے اب بھی مرے طرب ناشناس دل میں
گزشتہ خوابِ حزن اب بھی ہے جنبشِ خوں مری رگوں میں
گزر رہا ہے مرا تصور، انہیں خزاں پوش وادیوں سے
مری اذیت نصیب آنکھوں سے بہ رہا ہے لہو ابھی تک
وہ آگ رگ رگ میں شعلہ زن ہے، جو دل کی تہ میں سلگ رہی تھی

وہی غم انگیز کیفیت ہے جو روح پر میری چھا رہی ہے
اگرچہ سوتی ہوئی حسوں کو ہوائے تازہ جگا رہی ہے
اگرچہ پیشِ نظر، عروسِ بہارِ نو مسکرا رہی ہے
اگرچہ رت کی نمو طرازی نئے شگوفے کھلا رہی ہے
طرب فزا تازگی میں ڈوبی ہوئی ہوا گرچہ آ رہی ہے

نشاط رکھا ہے نام جس کا کبھی تہِ آسماں ملے گی؟
مجھے بھی ہستی کی منزلوں میں کہیں نہ ہمدم اماں ملے گی؟

سید علی اختر

شہرِ بابل

نہ در جانم ہوا باقی نہ اندر دل ہوس ماندہ ۔۔۔ بیا ساقی کہ ایں ویرانہ از بسیار کس ماندہ

شہر بابل ایک مربع قطعہ پر واقع تھا۔ انگریزی میلوں سے ۵۳ میل میں اس کا دور تھا۔ شہر پناہ کی ہر دیوار میں پچیس دروازے تھے۔ شہر کے مربع کلاں میں پچیس بازار تھے اور ہر ایک دوسرے کو اس طرح قطع کرتا تھا کہ تمام شہر چھ سو چھتر مربعوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ ہر بازار ایک دروازہ سے شروع ہو کر اپنے مقابل کے دروازہ پر ختم ہوتا تھا۔ اس طرح چوسر کی بساط کی طرح پچاس بازار بن گئے تھے اور ان کی درمیانی زمین پر دلفریب و دل کشا پائیں باغ لگے ہوئے تھے۔ شارع عام پچاس تھے جو ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ میں قطع کرتے تھے۔ ہر بازار کا طول پندرہ میل اور ہر مربع کا دور دو میل تھا۔ چار خوشنما سڑکیں فصیل کے متصل دو سو فیٹ عرض میں تھیں۔ اور باقی ایک سو پچاس فیٹ چوڑی تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے ستھرے بازار تھے اس لئے شہر چھ سو چھتر مربعوں پر تقسیم ہوگیا تھا جس کا ہر ضلع طول میں کم و بیش آٹھ سو اسی گز تھا۔ ان چھ سو چھتر مربعوں میں تین تین چار چار منزل کے عالیشان خوبصورت خوش قطع مکانات تعمیر کئے گئے تھے۔ درمیانی نصف حصہ باغوں اور سیر گاہوں کے لئے مخصوص تھا۔

قدیم حصہ شہر دریا کے داہنے کنارہ پر اور جدید شہر تعمیر کردہ بخت نصر ثانی بائیں کنارہ پر آباد تھا۔ بیچ میں دریائے فرات جزن تھا۔ اس کے کنارے کنارے سرتاسر اعلیٰ و نفیس گھاٹ پختہ اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ بخت نصر ثانی نے رعایا کے آرام اور سہولت کی غرض سے دریائے فرات پر بائیس گز طویل اور دس گز عریض ایسا نادر پل بنایا تھا جو شب کو بند ہو جاتا تھا اور دن کو کھول دیا جاتا تھا[1]۔

بقول ہراڈوٹس اور حکیم ٹی سیاس کوچہ و بازار کی نفاست، عمارات کی شان و شوکت حیطۂ بیان سے باہر اور دلفریب و دلکشا باغات کی شادابی رشکِ ارم تھی۔ رونق و عظمت اور شان و شوکت میں شہرِ بابل دنیا میں فرد اور لاثانی تھا۔ مگر "ہزارہا سال ماسبق کا پارینہ افسانہ ہے"۔ بہرحال سخنورانِ عالم ہمیشہ شہرِ بابل کی رونق و جلال اور عظمت و کمال میں رطب اللسان رہے۔ افسوس زمانۂ ناسازگار کی دستبرد سے اب صرف پتھر اور مٹی کے ڈھیر اس عظیم الشان شہر کی یادگار ہیں۔

گیا حسن خوبانِ دل خواہ کا ۔۔۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا

---

[1] بادشاہ عاموراپی نیز اس کے جانشینوں کے زمانہ میں دریا کو کشتی کے ذریعہ سے عبور کیا جاتا تھا لیکن بخت نصر ثانی نے مذکورہ بالا پل فرات پر تعمیر کر دیا۔ دریا کو ایسا قابو میں کیا تھا کہ بوقتِ ضرورت پانی تہ تک نکال سکتے تھے۔ پل بناتے وقت ایسا ہی کیا گیا تھا تاکہ پشتہ کے وزنی اور بڑے بڑے گھڑے ہوئے پتھروں کو کاریگر بآسانی لوہے کے پتروں سے جوڑ کر سیسہ پلا سکیں۔

دریائے فرات جو کبھی اس میں موجیں مارتا تھا اس پریشان حالی میں وہ بھی ساتھ نہ دے سکا اور اپنا راستہ بدل کر جدا ہو گیا۔ سچ ہے "سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے"

ایک وہ زمانہ تھا کہ مال و اسباب سے لدے پھندے خوبصورت خوبصورت جہاز یہاں آکر لنگر انداز ہوتے تھے یا اب کوسوں پانی نظر نہیں آتا۔

کیانانی شاہانِ ایران کے عہد میں شہرِ بابل کچھ زیادہ بے رونق و زوال پذیر حالت میں نہ تھا بلکہ داراب ثانی نے سنگِ مرمر کی ایک خوشنما عمارت قصر میں تعمیر کر کے اپنی یادگار چھوڑی تھی۔

مورخ کرٹیس کا قول ہے کہ سکندرِ اعظم کے زمانہ میں شہرِ بابل کی آبادی صرف گیارہ میل میں رہ گئی تھی باقی حصہ پھنزاعت ہونے لگی تھی۔ بادشاہ موصوف نے شہر کی صفائی کے واسطے دس ہزار مزدور مقرر کر کے دوبارہ اس کو معمور کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن عمر نے وفا نہیں کی۔

سکندرِ اعظم کی وفات کے بعد بابل بالکل تباہ و برباد ہو گیا[1] ۲۹۴ سنہ ق م، سلیوکس نائی کیٹر بادشاہ نے شہرِ بابل کے متصل دوسرا شہر سلیوسی کے نام سے بنایا۔ اور شہرِ بابل کے باشندوں سے زیادہ تر اُس کو آباد کیا۔ عہدِ پارتھیا[2] میں اُس کی نہایت بے وقعتی رہی جو اُس کی تباہی کا اور زیادہ باعث ہوا۔

شہرِ بابل کے زوال اور تباہی کے متعلق مورخ ڈائڈورس سائکیولس نے سنہ ۲۴ ق م، اسٹرابو نے سنہ ۲۰ ق م، پاسانیاس نے سنہ ۱۵۰ء میں اور پوسی بیس کے بقول میکسی مس ٹائرس اور بادشاہ کانسٹنٹائن اعظم نے سنہ ۳۲۵ء میں اُس کی تباہی و بربادی کی شہادت دی۔

انتہا کی تباہی اور بربادی کے متعلق آخر بیان مورخ جروم کا ہے جو لکھتا ہے کہ سنہ ۴۰۰ء میں شاہانِ ایران نے بابل کی دوہری فصیل کے سالم حصوں میں شکار کھیلنے کے لئے وحوش و درندے پالے تھے۔

افسوس و صد ہزار افسوس۔

آں قصر کہ بہرام درو جام گرفت روبہ بچہ کرد و شیر آرام گرفت

محمد حامد (دہلوی)

---

[1] سکندرِ اعظم کی وفات کے بعد اُس کے جنرل سلیوکس کے حصہ میں حکومت بابل آئی تھی لیکن دوسرے جنرلوں سے سنہ ۳۱۲ ق م جنگ ہو کر ممالکِ میڈیا یعنی عراق عجم، آذربائجان، طہران، سوسیانہ اور ایران اُس کے قبضہ میں آگئے تھے۔

[2] پارتھیا یعنی خراسان۔ خاندان اشکانیاں کا پہلا بادشاہ ارسز یعنی اردشیر تھا اُس کا تعلق خراسان سے تھا۔ سلیوسڈ خاندان یعنی سلیوکس کے خاندان کو مٹا کر ملکِ ایران اور بابل پر قابض ہوا تھا۔

جستجوئے محبّت

رازِ ہستی ہے کہاں مقصدِ فطرت ہے کہاں
نفسِ ایماں ہے کہاں اصلِ شریعت ہے کہاں
شمعِ عرفاں ہے کہاں خضرِ طریقت ہے کہاں
رنگ بخشِ گلِ فردوسِ مسرت ہے کہاں
احترامِ دلِ انسان کی بشارت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

آبشاروں میں وہ جلوے ہیں نہ کہساروں میں
وادیوں میں وہ نظارے ہیں نہ گلزاروں میں
اب نہ ذروں میں وہ تابش ہے نہ سیاروں میں
زاہدوں میں وہ حقیقت ہے نہ میخواروں میں
منتظر روح ہے جس کی وہ لطافت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

نہ عبادت میں نیاز اور نہ ارادت میں خلوص
نہ نمازوں میں تقدس نہ ریاضت میں خلوص
نہ کسی معتکفِ گوشۂ خلوت میں خلوص
نہ کسی زاہدِ مرتاض کی نیت میں خلوص
آتشِ جذبۂ تقدیس کی عظمت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

بزمِ فطرت کے نظاروں میں تبسم بھی ہے
بربطِ دہر کے نغموں میں ترنم بھی ہے
بزمِ خورشید بھی ہے محفلِ انجم بھی ہے
میکدہ بھی ہے قدح خوار بھی ہے خم بھی ہے
وہ سرورِ مئے عنابیٔ جنت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

دل تو ہیں، پریم کے مندر کے پجاری نہ رہے
آہ! دربارِ محبت کے بھکاری نہ رہے
جن سے تقدیس کے چشمے ہوئے جاری نہ رہے
عشق تھا جن کا پسندیدۂ باری نہ رہے
جس کی حسرت تھی فرشتوں کو وہ عظمت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

زمزمے موجۂ جمنا نے سنائے جس کے
پھول ہر لہر نے مندر میں چڑھائے جس کے
گیت ہر روز نے "شیام" نے گائے جس کے
خواب رادھا نے نگاہوں میں بسائے جس کے
وہ زمانے کے مذاہب کی حقیقت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

سحرکُن آج بھی ہے ساحرۂ وادیٔ نیل
نغمہ گر آج بھی ہے مطربۂ وادیٔ نیل
بے اثر کیوں ہے مگر زمزمۂ وادیٔ نیل
کیا ہوئی شانِ تقدس کدۂ وادیٔ نیل
عصمتِ خوابِ زلیخا کی حقیقت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

عربستاں بھی ہے اور نجد کی محفل بھی ہے
کارواں بھی ہیں مسافر بھی ہیں منزل بھی ہے
قیس والے بھی ہیں اور لیلیٰ محمل بھی ہے
اس حقیقت میں مگر جلوۂ باطل بھی ہے
قیسِ عامر کو جو بخشی تھی وہ وحشت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

ارضِ مغرب ہے تو مشرق بھی ہے دیوانۂ نفس
ذوق والوں کے لئے عام ہے میخانۂ نفس
کچھ کلیسا نہیں ہے دیر بھی کاشانۂ نفس
رقصِ مرتاض ہے یا لغزشِ مستانۂ نفس
اب وہ معصومیِ جذباتِ عبادت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

جلوہ ریزی بھی ہے دیدار بھی ہے طور بھی ہے
ارتقا بھی ہے ہم آوازیِ منصور بھی ہے
حسن والے بھی ہیں اور عشق کا دستور بھی ہے
خسروِ عشق تو ہیں پر کوئی مزدور بھی ہے؟
وہ اولعزمیٔ فرہاد کی رفعت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

علم ہے اور جہالت کی نشیبی منزل
نفس ہے اور سفاہت کی نشیبی منزل
مرکزِ زہد ہے شہوت کی نشیبی منزل
"اوجِ انسان ہے" ذلت کی نشیبی منزل
پیکرِ خاک کو بخشی ہوئی عظمت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

نہ وہ احساس ہے باقی نہ وہ خودداری ہے
نہ وہ ایثارِ محبت نہ وفاداری ہے
بندۂ نفس ہیں تقدیس سے بیزاری ہے
فرضِ انساں ہے اگر کچھ تو دل آزاری ہے
دلِ محمود کی کھوئی ہوئی وسعت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

اب کہاں وہ کششِ جذبۂ محمود و ایاز
اب کہاں عشق و محبت کے مقدس انداز
اُن کے جذبات کی تکمیل تھی تقدیسِ نیاز
آج عارف ہے حقیقت کو زمانے [illegible]

ظلمتِ عام ہے وہ شمعِ حقیقت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

نظمِ ہستی ہے تو شعریتِ معصوم نہیں
مے پرستی ہے تو کیفیتِ معصوم نہیں
عبد ہیں پر وہ عبودیتِ معصوم نہیں
بے خودی بھی ہے تو محویتِ معصوم نہیں
فرش پر عرش سے اُتری ہوئی عظمت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

طلبِ گل، خلشِ خار سے اقدامِ گریز
ہوسِ ذرہ ہے کہسار سے اقدامِ گریز
شوقِ مے، لغزشِ میخوار سے اقدامِ گریز
جستجو، اور رہِ دشوار سے اقدامِ گریز
جو بعید از غمِ منزل ہے وہ حسرت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

یا خدا تیرے حبیبِ عربی کا صدقہ
آلِ اطہار کا اصحابِ نبی کا صدقہ
یا خدا روحِ اویسِ قرنی کا صدقہ
یا خدا عشقِ بلالِ حبشی کا صدقہ
نکہتِ غنچۂ فردوسِ نبوت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

روح بخشی ہے تو اسبابِ لطافت بھی دے
تو نے احساس دیا ہے تو مسرت بھی دے
خاک سے تو نے بنایا ہے تو عظمت بھی دے
تو نے جذبات جو بخشے ہیں تو عصمت بھی دے
میں امیں ہوں تو مرے دل کی امانت بھی دے
اے محبت کے خداوند محبت بھی دے

روش صدیقی

فرانس اور ہندوستان

ساری دنیا میں سب سے بھولا ملک فرانس ہے۔ جسے یہ باور نہ ہو فرانسیسی بیوی سے شادی کر کے خود آزمالے۔ اور ملکوں میں سادگی کی کچھ نہ کچھ انتہا ہے مگر فرانس کو دنیا سو دفعہ دھوکا دے چکی ہے اور ابھی کئے دفعہ اور دے گی پر اس پر بھی فرانس والے بھولے پن کی بانکپن نہ چھوڑیں گے۔ نہر سویز بنائی فرانس کے سپوت فرڈیننڈ ڈی لیسپس نے، اڑا لے گئے کوئی اور۔ نہر پانامہ کا جب چرچا ہوا تو فرانس کا سونا پانی کی طرح بہا۔ پہلا تلخ تجربہ کسی کام نہ آیا اور آخر فرانس کا شروع کیا ہوا کام امریکہ نے تیس سال بعد اکتوبر ۱۹۱۳ء میں پورا کیا۔ اس سودے میں فرانس کے حصے میں گھاٹا، ندامت اور بدنظمی آئے اور امریکہ کے حصہ میں تجارت، اقتدار اور طاقت جنگِ عظیم میں تو فرانس کے بھولے پن کی ہزاروں مثالیں زبان زدِ خلق ہیں مگر وہی ایک ذکر کافی ہے کہ جب ایک خاص نازک موقع پر شہرۂ آفاق موسیو کلیمنسو سے پوچھا گیا کہ آپ کی پالیسی کیا ہے تو فرمانے لگے:۔

"گھر میں لڑتا ہوں۔ باہر لڑتا ہوں۔ زندگی کے اخیر پندرہ منٹ تک لڑوں گا۔ اور میری پالیسی کیا ہے؟"

اور ان چند سادہ جملوں کا وہ برقی اثر ہوا کہ فرانس کی اس وقت کی سیاسی زندگی کے قالب میں گویا نئی روح پھک گئی۔ چار سو ڈپٹیوں نے ہاں میں ہاں ملا دی اور فرانس کے سپاہی کٹنے مرنے پر تلے رہے۔ بھولے فرانس نے ایک دفعہ بھی نہ پوچھا کہ صاحب آپ لڑتے تو ہیں مگر نتیجہ؟ جنگِ عظیم کے بعد جب انگلستان اور امریکا دونوں سے توقع اُٹھ گئی تو فرانس نے جرمنی پر اعتبار کر لیا۔ جرمنی نے روکھا پھیکا سا جواب دیا تو فرانس اپنے جانی دشمن پوپ سے علیک سلیک کر کے خوش ہو گیا۔ اور جب وہاں سے بھی نامرادی نظر آئی تو پھر انگلستان سے بات چیت ہونے لگی۔

یہ تو خیر ساری دنیا کو علم ہو چکا ہے کہ فرانس کا روپیہ سمیٹنا ہو تو فرانس کی دوستی کا دم بھرو اور کوئی بودی سی کمپنی چلا دو۔ فرانس میں اس کا چرچا کرو اور پھر اگر قسمت یاوری کرے تو روپیہ کا کال نہیں رہتا۔ اس مجرب نسخے سے کئی غیر فرانسیسی کمپنیاں مالا مال اور کئی ہزار غریب فرانسیسی خاندان برباد ہو چکے ہیں اور ابھی تک فرانس میں بے اعتباری پیدا نہیں ہوئی۔ روس نے تو فرانس کا ہزاروں من سونا کچا چبا لیا مگر اُس زمانے میں روس کا ہاضمہ تیز تھا اور یہ کچھ تعجب خیز نہیں۔ تعجب خیز یہ ہے کہ مریض ترک بھی لقمۂ طلائی سے پرہیز نہ کر سکا۔

بقول ایک مورخ "اگر مورخ تاریخ کی کتابوں میں واقعات درج نہ کریں اور واقعات سے نتائج اخذ کرلے
کی علت چھوڑ دیں تو تاریخوں میں کس قدر بیش بہا اضافہ ہو!" فرانس کی جبلی عادت ہے کہ اپنے آپ کو
بھولے پن سے دھوکا دے کر خوش ہو۔ فرانس والے خوش رہنا چاہتے ہیں۔ خوشی ایک قسم کا دھوکا ہے نتیجہ
یہ کہ ساری دنیا میں سب سے بھولا ملک فرانس ہے۔

(۲)

ساری دنیا میں سب سے چالاک ملک ہندوستان ہے جسے یہ باور نہ ہو ہندوستانی بیوی سے شادی
کرکے خود آزمالے۔ آج شادی کل بچہ پرسوں اُس کی تقریب۔ ساتھ کے ساتھ بیماری پھر اپنا مرنا۔ اس قدر چالاک
بیویاں ہیں کہ کسی اور پر شوہر کو مرنے کی فرصت ہی نہیں دیتیں۔ جو حال ہندوستان کی بیویاں اپنے شوہروں کا
کرتی ہیں وہی حال ہندوستان اپنے غیر ہندوستانی حکمرانوں کا کرتا ہے مگر اس کی تہ میں جو چالاکی ہے اُس کا ذکر
بعد میں کیا جائے گا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ انگلستان اور ہندوستان کی شادی ہوئی تھی۔ رنگون میں سارے ہندوستان
کا آخری دہلوی تاجدار اور کلکتہ میں لکھنو کا آخری لکھنوی فرمانروا شاید ابھی نظروں کے سامنے تھے یا یونہی سے
اوجھل ہوئے تھے کہ ملکہ معظمہ نے قیصرِ ہند کے شاندار لقب سے مغرب مشرق کا عقد رچایا تھا۔ غدر کے بعد کا اعلان
دیا منگنی تھی۔ قیصری دربار گویا بیاہ۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ اور ساتھ ہی کانگرس سی بے چین بچی۔ یہ بھی ہندوستان
چالاکی تھی کہ پلوٹھی کا بچہ بجائے لڑکے کے لڑکی۔ اب اس بچی نے بھی بچہ دے ڈالا یعنی آل پارٹیز کانفرنس دیکھ
یے کہ یہ نئی بی کیا گل کھلاتی ہیں مگر ہندوستان کی اصل چالاکی ایک گہرا فطرتی راز ہے۔ کئی ہزار سال سے ہندوستان
منصوبہ یہ ہے کہ غیر ملکوں سے لوگوں کو ورغلا کر یہاں لایا جائے۔ انہیں حکومت پسندی سکھا کر کمزور کیا جائے اور چ
ال یہاں تک کھیلی جائے کہ ساری دنیا میں کوئی اس لت سے بچ نہ سکے۔ اصلی آریہ لوگوں کو یہاں بلا کر خوار کیا گیا۔ پھر بیچارے سک
ندرِ اعظم کو کشاں کشاں لایا گیا۔ جاتے ہی جان سے گیا۔ پھر وسطِ ایشیا کے تاتاری آئے۔ چغتائی آئے۔ ایرانی ق
زلباش۔ افغانستان کا دُرّانی اور کیا کیا۔ ہندوستان کا وہی ایک پرانا منصوبہ ہے کہ باری باری سب کو
ن کر دیا جائے۔ آج کل انگریز بچارے تختۂ مشق ہیں۔ اس قدر انہیں حکومت پسند بنایا جا رہا ہے کہ جب ولایت پہنچتے
ہیں تو خود اُن کے اہلِ وطن اُن کی "کوئی ہے؟" کی ہانک سے چونک اُٹھتے ہیں۔ اصل منشا یہی ہے کہ جب
باری سب قومیں (کیا انگریز کیا جاپانی کیا چینی) ہندوستان پر حکومت کرکے کمزور ہو جائیں تو پھر ہندوستان
م ساری دنیا پر حاوی ہوکر شاہنشاہی کرنے لگے۔ یہاں کی غربت، افلاس، بیماریاں سب کی سب اس مرکزی

چالاکی کی معاون تدابیر ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو ہندوستان کو مجبوراً خوش ہونا پڑے مگر خوشی ایک دھوکا ہے (ہندوستان کے فلاسفر پہلے ہی یہ لکھ چکے ہیں) اور اس لئے اس دھوکے سے بچنے کے لئے انسان کو بیمار اور مفلس اور محکوم اور مظلوم رہنا لازمی ہے

(۳)

سوال یہ ہے کہ قدیم ہندوستان کی یہ خوفناک سازش جسے آج پہلی دفعہ ہمایوں میں طشت از بام کیا جا رہا ہے، مگر جس کا در اصل دنیا کے پاس علاج کچھ نہیں کیونکہ جب انگریزوں جیسی قوم ہندوستان کے دامِ فریب میں گرفتار ہو چکی تو باقی قومیں کس گنتی میں ہیں، جب پوری طرح کامیاب ہو گی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ضرور کامیاب ہو گی تو کیا اُس وقت بھی فرانس بھولا ہی رہے گا۔ اور ہندوستان بدستور چالاک رہے گا۔ یا ان خصائل میں ردوبدل ہو گا؟ ایک بات تو قطعی یقینی ہے یعنی یہ کہ عارضی وفا کی وہ دیوی جسے غلط العام میں فرانسیسی عورت کہا جاتا ہے اور دائمی جفا کی وہ کالی ماتا جسے اصطلاحاً ہندوستانی بیوی کہا جاتا ہے اپنی عادت نہ بدلیں گی۔ اول الذکر بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی، موخر الذکر کو بچہ پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔

مگر جس بات سے شک پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں ہندوستان میں اور لاکھوں متعدی بیماریاں ہیں وہاں کہیں خوشی کا مرض لاحق نہ ہو جائے۔ فرانس کا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ خوشی ضرور متعدی ہے۔ ہندوستانی دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان میں خوشی نہ آئے کیونکہ خوشی آئی تو ہندوستان گیا۔ گویا یہ لازم ہوا کہ ہندوستان اور فرانس کے درمیان معاشرتی پردہ مستحکم کیا جائے ورنہ بالکل ممکن ہے کہ اگر یہ پردہ قائم نہ رہا تو فرانس سے خوشی کا مرض ہندوستان میں پھیل جائے اور بیاں بجائے اُس پریں ریں کے چرخے کے (جس کے مسٹر گاندھی بڑے پیغمبر ہیں) ناچ اور رنگ کی محفلیں قائم ہو جائیں اور ہندوستان کا اصل مطلب یعنی یہ کہ ہندوستان ساری دنیا سے اپنے اوپر حکومت کرا کے پھر ساری دنیا پر مسلط ہو فوت ہو جائے۔ کیونکہ اگر ہندوستان خوش ہوا تو ہندوستان ہی نہیں رہے گا تو پھر ساری دنیا پر ہماری حکومت کس کام کی

(۴)

جو چالاک ہوتے ہیں وہ ثابت قدم ضرور ہوتے ہیں۔ نہ الجھتے ہیں نہ گرتے ہیں۔ پڑے پڑے پٹا کرتے ہیں اُن اپنی اصلی دھن میں کہ پیٹنے والے خود تھک تھکا کر دفع ہو جائیں گے اور پھر ہم اٹھ کر سب کچھ سنبھال لیں گے۔ اُن میں فرانسیسیوں والی عادت نہیں ہوتی کہ "لڑیں گے اور مریں گے" وہ نفع نقصان سوچا کرتے ہیں تیل دیکھتے ہیں تیل کی دھار دیکھتے ہیں۔ یہ قدرتی پردہ تو بھولے اور چالاکوں میں ضرور ہے مگر وہ معاشرتی پردہ جس کی ہندوستان کو ضرورت ہے اور جس کے

بغیر فرانس ہماری آنے والی عظمت کے لئے ایک مہلک خطرہ ہے کس طرح قائم ہو؟ سب سے پہلے تو یہ لازم ہے کہ فرانس کے خلاف ایک بھاری پروپیگنڈا شروع کیا جائے کہ ہندوستان کا اگر کوئی دشمن ہے تو فرانس ہے۔ اس شدت سے اِس امر کی تلقین کی جائے کہ ہندوستان میں ہر کہ و مہ فرانس کے نام سے بیزار ہو جائے۔ اور اس پروپیگنڈا کا ابھی شروع کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ جس طرح ہمارے بزرگوں نے کئی ہزار سال پہلے یہ پالیسی اختیار کرلی تھی کہ دنیا کی قوموں کو یکے بعد دیگرے کمزور کرنا چاہئے اسی طرح ہم کو بھی اپنی آئندہ عظمت سے کئی ہزار سال پہلے اس خطرہ کا تدارک کرنا چاہئے جو تب ہمارے لئے شاید نمودار ہو۔ وہ قومیں محض بے وقوف ہیں جو اپنی پالیسی دس بیس سال کے مستقبل کو مدنظر رکھ کر قائم کرتی ہیں جس طرح روحانی معاملات میں ہندوستان نے آواگون کے چوراسی لاکھ قالب کے جال کو پھاڑ کر صرف نروان مدنظر رکھا ہے اسی طرح سیاسی معاملات میں بھی ہم کو چوراسی ہزار سال نہیں تو کم از کم چوراسی سو سال پیشتر اپنی پالیسی قائم کرنی چاہئے۔ باقی سب دنیا سے ہم نپٹ سکتے ہیں اور ضرور نپٹ لیں گے صرف وقت کی دقت ہے اور اس کی ہمیں کچھ پروا نہیں مگر فرانس، بھولا فرانس، جہاں اوروں سے تو خیر ہوا خود میاں کا بیوی مسکرا کر دل لبھاتی ہے، وہ مہیب خطرہ ہے جس کا فوری تدارک لازم ہے۔ اس لئے اگر ہمیں کامیاب ہونا ہے تو اولین فرض یہ ہے کہ حسب ذیل تجاویز پر عمل کیا جائے۔

ا۔ جو ہندوستانی بیوی تیس سال کی عمر میں نانی اور چالیس سال کی عمر میں بڑھیا نہ ہو اُسے دو تین من سونا پہنا کر کافی گہری جگہ گنگا اشنان دیا جائے۔ وہ سونا پھر کام آسکتا ہے۔

ب۔ خوشی کے برخلاف ہر بندرگاہ میں، ہر شہر میں، ہر گاؤں میں بلکہ ہر روح میں ایک quaran tine قرنطینہ قائم کی جائے۔ اس پر بھی اگر خوش رہنے کا مرض پھیلے یعنی کوئی کسی کو دیکھ کر یا یاد کر کے خوش ہو تو اسے فوراً قتل کر دیا جائے۔

ج۔ فی شہر فی قوم کم از کم تین لیڈر ہونے لازمی ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب کا، ایک ماضی کا، اور ایک مستقبل کا حامی ہو مگر سب کے سب خوشنما ساڑھی، پتلی کمر سے محبت کرنے کے برخلاف ہوں۔ نہ صرف اُن کا لباس بلکہ اُن کی روح بھی موٹے کھدڑ کی ہو۔

فلک پیما

خیال اور تعمیر حیات

ہم وہی ہیں جو ہمارے خیالات ہمیں بنادیں۔ کائنات روز ازل سے ایسی ہی تھی جیسی آج ہے مغفرت کے دامن میں کانٹے بھی تھے اور پھول بھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بعض دفعہ تو دنیا سراسر پھولوں اور پنکھڑیوں سے لدی ہوئی گویا عروس بہار معلوم ہوتی ہے اور دوسرے ہی لمحہ میں یہ لہلہاتا ہوا گلشن، جو شگوفوں اور کلیوں کی کثرت سے جنت نگاہ بن رہا تھا، یک لخت خارزار اور لق و دق ریگستان میں تبدیل ہوجاتا ہے جہاں قدم قدم پر کانٹوں سے پاؤں لہولہان اور جسم باد سموم کے آتشین تھپیڑوں سے جھلس جاتا ہے؟ یہ ہماری نگاہ کی تبدیلی نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ کہیں گے پھر یہ تمام دکھ اور مصیبتیں جن سے دنیا بھرپور ہے جن کے ہاتھوں ہر انسان نالاں ہے اور جو بھڑوں کی طرح ہمیں کاٹ رہی ہیں حقیقت میں کوئی وجود نہیں رکھتیں؟ حیران نہ ہوجیے میرا یہی جواب ہے، کہ فی الحقیقت ان کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سب کچھ جسے ہم دکھ اور تکلیف سمجھ رہے ہیں، ہمارے ہی تخیل کی بے راہ روی اور خیال کی بغاوت کا نتیجہ ہے!

ہم دنیا کو رنگین چشموں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ رنگوں کا اختلاف اشیا کی نوعیت ماہیت نہیں بدل سکتا۔ لیکن کتنے عقلمند ایسے ہیں جن کی نندگیاں اس نظریہ کا عملی ثبوت پیش کرسکتی ہیں؟ اگر چشمہ گدلا ہے تو بلاشبہ کل جہاں گدلا نظر آئے گا۔ اور صاف و خوشرنگ ہے تو زمان و مکان متبسم نظر آئیں گے۔ یقین نہ آئے تو آزما دیکھو۔ آخر وہ چشمہ کیا ہے جو ہماری حیات کی تعمیر و تخریب میں اس قدر دسترس رکھتا ہے؟ وہ خاموش خیالات ہیں جو ہر لحہ انسانی زندگی کو اپنے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ تم بے خبری کے عالم میں اونگھ رہے اور دلپذیر مواقع کی سوچ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا بیٹھے ہو اور وہ بظاہر نحیف و کمزور خیالات، جو تمہارے نزدیک لائعے محض ہیں، جن پر توجہ کرنا بھی تم نے کبھی گوارا نہیں کیا، اندر ہی اندر ایک خاص کیمیاوی ترکیب سے تمہارے گرد آہنی زنجیروں کا جال بچھا رہے ہیں جس سے تم چاہو بھی تو نہ نکل سکو گے۔ تمہارے دل کی دنیا میں برقی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر ہر لحظہ تمہارے ماحول کی تخلیق میں مصروف ہیں اور تم خارجی اسباب کے انتظار میں ہو جو خود بخود آکر تمہاری قسمت تبدیل کردیں گے۔

خارجی اسباب؟ ہم ایک حیرت ناک مغالطہ اور فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ میں حالات ناسازگار اور واقعات مخالف کی حقیقت سے انکار کرتا ہوں۔ میں بلیات و مصائب کی طرف سے آنکھ بند نہیں کرسکتا جب کہ

خود ایک طویل عرصہ تک حوادثِ دہر اور بلائے آسمانی کا شکار رہ چکا ہوں۔ لیکن زندگی کی ترتیب میں ہم کلیتہً کیوں بیرونی اسباب کے ماتحت چلتے ہیں؟ قصرِ حیات کی ذمہ داری تین حصے تمہارے سر عائد ہوتی ہے اور ایک حصہ اُن امور پر جو بظاہر پردۂ غیب سے از خود نمودار ہو کر تمہاری مساعی پر فتح و شکست کی مہر ثبت کرتے ہیں۔ میں نے اس میں بھی رعایت سے کام لیا ہے۔ ورنہ وہ لوگ جنہوں نے محض اپنے بل بوتے سے مخالف قوتوں پر غلبہ پایا، جنہوں نے اپنے دست و بازو سے متصادم عناصر کو زیر کر کے اس اژدہام کو چیر کر اپنی راہ آپ بنائی یہی کہیں گے کہ

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اُن کے سامنے "قسمت" کا نام لینا گویا انسانیت اور اُن محیر العقول طاقتوں کی جو اس ایک لفظ انسانیت میں مضمر ہیں ہتک کرنا ہے۔ آپ میرے سامنے کئی مثالیں لے آئیں گے "فلاں شخص نے سالہا سال کوشش کی پھر بھی اپنے حالات تبدیل نہ کر سکا۔ وہ کئی برس جدوجہد میں مصروف رہنے پر بھی بدقسمتی اور نحوست کو جو اس کے گرد احاطہ کئے ہوئے تھی رفع نہ کر سکا۔ اُس نے مدتوں مشکلات کی سنگین دیواروں سے بے سود ٹکریں ماریں لیکن درِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

شاید آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان حالات کا غلام ہے اور تقدیر کے زنداں سے نکل نہیں سکتا۔ الفاظ کا غلط استعمال نہ صرف انسانی تعلقات کو بہت کشیدہ کر سکتا ہے بلکہ ہمارے علم کو غیر صحیح اور ناقص بنا دیتا ہے۔ کسی چیز کی خواہش کرنے یا چاہنے اور اس کے حصول کی "کوشش" کرنے میں نمایاں فرق ہے۔ ہم میں سے پچانوے فیصدی لوگ اپنے مطامحِ نظر کو بہت بلند کر لیتے ہیں۔ اُن کی نگاہیں فرشِ خاکی سے بلند ہو کر فضائے آسمان کی سیر میں مصروف رہتی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایک ہی جست میں دنیا اور اُس کی آلودگیوں کو چھوڑ کر عالمِ بالا میں پہنچ جائیں۔ مگر قوائے عمل اور استقلال کی یہ حالت ہے کہ اس پہنائے عظیم کو طے کرنے کی ہمت تو کجا اُس کی وسعت پر نگاہ ڈال کر ہی دل بیٹھ جاتا ہے۔ جب تخیل اور عمل، خواہش اور کوشش میں اتنا بعد اور فرق ہو تو اطمینانِ قلب کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ شاعرِ بے نظیر نے سچ کہا ہے۔

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

جب کبھی تم ایسے شخص کو دیکھو جو کسی چیز کا خواہشمند ہے اور بظاہر اُس کے حصول میں کوشاں بھی ہے لیکن پھر ناکام رہتا ہے تو سمجھ لو کہ اُس کی کوششوں میں نقص ہے۔ ناممکن ہے کہ تم سیدھے راستہ پر گامزن رہو اور پھر منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکو۔ سو میں ننانوے ناکامیاں ایسی ملیں گی جن کی وجہ خواہش کی موجودگی اور کوشش کا فقدان ہوتا ہے

پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی تک پہنچنے، امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے اور اپنے ہم جنسوں میں دنیوی اعزاز و امتیاز پانے کے لئے جہاں تمہارے اندر شدید خواہش اور آتش خیز ولولہ کی ضرورت ہے، ایسا ولولہ جو تمہارے جسم اور روح میں ایک برقی رو دوڑا دے۔ جو اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے تمہیں بے قرار رکھے۔ وہاں یہ بات بھی اشد ضروری ہے کہ تمہارا عمل ایسا محکم، ارادہ ایسا صمم اور ہمت اس قدر مضبوط ہو کہ راستے کی مشکلات تمہارے ماتھے پر شکن تک نہ ڈال سکیں۔

ا۔ ب دو طالب علم ایک جماعت اور ایک ہی مدرسہ میں پڑھتے ہیں۔ دونوں یکساں طور پر ذہین اور محنتی ہیں دونوں کی مالی اور معاشری حالت بھی قریب قریب ایک جیسی ہے۔ دونوں بیک وقت امتحان میں شامل ہوتے ہیں اور سوء اتفاق سے دونوں ہی ناکام رہتے ہیں۔ اسی ناکامی سے ا اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اپنی طبیعت کا توازن بھی قائم نہیں رکھ سکتا۔ ہر وقت متفکر و مغموم۔ افکار اُس کے دماغ کو پریشان کئے دیتے ہیں۔ دل برداشتہ ہو کر وہ مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے اور آخر سال بھر حزن و ملال کا شکار رہ کر ناچار ایک معمولی سے سلسلۂ روزگار میں منسلک ہو جاتا ہے۔ ادھر ب کے لئے امتحان میں ناکامی کی خبر، ہر چند کہ بالکل غیر متوقع تھی ایک تازیانہ کا کام دیتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اُس کی محنت بارآور نہیں ہوئی لیکن مایوس نہیں ہوتا۔ ایک نئی ہمت نئی زندگی، نئے ارادے کو دل میں جگہ دے کر غم ماضی کو بالکل فراموش کر کے وہ پھر کتاب پکڑ کر مطالعہ میں مصروف ہو جاتا ہے سال بھر کے بعد امتیازی کامیابی حاصل کر کے آئندہ تعلیم جاری رکھتا ہے اور سالہا سال کے بعد مکمل تعلیمی سلسلہ کو بخیر و خوبی ختم کر کے ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے۔

اب بتائیے، اگر ہم خارجی حالات کے غلام ہوتے تو امتحان کی ناکامی نے ا اور ب دونوں کی زندگیوں پر کیوں ایک جیسے نتائج مرتب نہ کئے۔

عاشق حسین

پھول

یہ اُن ہزاروں کی مانند ایک تھا جو اپنی خاموش خوبصورتی میں بڑھتے ہیں۔
مگر آہ اِس سے کتنے محبت کے افسانے پھوٹ پڑے جب تم نے اسے توڑ کر مجھے دے دیا۔

محسن

تجلّیات

شیدائے آرزوئے دلِ محزوں نہیں ہے اب
شاید نگاہِ حسن میں افسوں نہیں ہے اب

جو کچھ ملے کسی سے محبت میں ہے قبول
یعنی وہ کاہشِ کم و افزوں نہیں ہے اب

پیشِ نظر صحیفۂ الفت ہے رات دن
مجھ کو دماغِ علمِ فلاطوں نہیں ہے اب

بیٹھا ہوا ہوں خاک بسر کوئے یار میں
سر میں ہوائے فرِ فریدوں نہیں ہے اب

اتنا کیا ہے تیری محبت نے سرفراز
میری نظر میں گنبدِ گردوں نہیں ہے اب

لیلےٰ ہو کس کے واسطے زحمت کشِ وفا
عاشق تو ہیں مگر کوئی مجنوں نہیں ہے اب

اب بھی ہے چشمِ عشق سے خونابِ دل رواں ق
پر آستینِ حسن ہی گلگوں نہیں ہے اب

اب بھی ہمارے جام و سبو ہیں بھرے ہوئے
لیکن وہ شوقِ زالِ میگوں نہیں ہے اب

صہبا وہی ہے خم بھی وہی جام بھی وہی
لیکن وہ بزمِ عیشِ ہمایوں نہیں ہے اب

اب بھی نہیں ہے تنگ کوئی عرصۂ حیات
ہنگامہ خیز دل میں مگر خوں نہیں ہے اب

دنیا کے مخمصوں سے فراغت نہیں مجھے ق
والد کا سر پہ ظلِّ ہمایوں نہیں ہے اب

اکبر غمِ معاش میں کچھ سوجھتا نہیں
سچ ہے کہ میری نظم میں مضموں نہیں ہے اب

جلال الدین اکبر

چُپ کی داد

(اناتول فرانس کے رنگ میں ایک مختصر کومیڈی)

ارکان

دانیال	ایک جج	شگوفہ	نوکرانی
ادھم	ایک وکیل	سائمن	ڈاکٹر
نکہت	جج کی بیوی	سررشتہ دار	

(مقام لاہور۔ وقت ۹ بجے سے ۱۲ بجے صبح تک۔ مسٹر جسٹس دانیال کی کوٹھی کا بائیں کمرہ۔ داہنے طرف کا دروازہ کھولئے تو گرجا اور ڈاک گھر صاف نظر آتے ہیں۔ بائیں طرف سے سیڑھیاں بالاخانے کو جاتی ہیں دیواروں سے ججوں کی ہیبت ناک تصویریں آویزاں ہیں۔ متعدد الماریوں میں بے شمار کتابیں قرینہ سے رکھی ہیں۔ ایک میز پر بہت سی مثلیں پڑی ہیں۔ کتابیں اتارنے کے لئے ایک سیڑھی ہے جس پر پہئے لگے ہیں۔ لکھنے کی میز صوفے۔ کرسیاں۔ ایک کونے میں میز پر ایک خوبصورت چرخا اور سینے پرونے کا سامان ہے۔ تمام عمل اسی ایک کمرہ میں ہوتا ہے)

پہلا سین

(دانیال اور ادھم باتیں کر رہے ہیں)

دانیال۔ بغداد سے آنے کے بعد؟ نہیں یوں کہئے کالج چھوڑنے کے بعد یہ پہلی ملاقات ہے۔

ادھم۔ اس عرصہ میں کیسے رہے۔ یہ ہے پہلا سوال جو مجھے پوچھنا چاہئے (چاروں طرف نظر ڈال کر) مگر یہ محض تکلف ہے

دانیال۔ لیکن جو تمہیں نظر آرہا ہے۔ یہ میرے دل کی کیفیت کا عکس نہیں۔

ادھم۔ یوں شہر کی فکر میں دبلا ہونا منظور ہو تو اور بات ہے ورنہ ماشاءاللہ جج ہو (چرخے کی طرف اشارہ کر کے) ایک خوبصورت عورت کے خاوند ہو، عزت ہے، رُعب ہے، رسوخ ہے، روپیہ ہے، صحت ہے۔ خدا لگتی کہوں تو قدر

تمہاری شکل دیکھ کر اپنی دین کا معیار بھول جاتی ہے۔

دانیال۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ بھائی قدرت کی ترازو رنج و راحت کا توازن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ ظاہر میں کو خواہ کچھ نظر آئے مگر بات یہ ہے کہ وہ آج جتنا ہنسائے گی کل اتنا ہی رُلا کر دم لے گی۔ مجھی کو لو جج ہوں مگر ہر ایک چیز بازار سے خریدتا ہوں۔ بیوی رکھتا ہوں مگر نہ میری سنے نہ اپنی کہے۔ رعب ہے مگر اُن پر جو میرے سامنے گرفتار ہو کر آئیں اور اپیل کی توفیق نہ ہو۔ عزت ہے مگر صرف انہی کی آنکھوں میں جن کے حق میں فیصلہ صادر کروں۔ رہی صحت تو اس کا حال ان سے پوچھئے (ایک الماری کھول کر دکھاتا ہے جس میں دواؤں کی شیشیاں رکھی ہیں)

ادہم۔ بہرحال بیوی اِن سب مشکلوں کا تدارک کر سکتی ہے۔ بیوی کے دامن میں سب عیب ثواب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بسا اوقات وہ لیاقت کی ضامن اور ترقی کی کفیل ثابت ہوتی ہے۔

دانیال۔ اسے کہتے ہیں دل کی بات پانا! بھائی بیوی ہی کا تو رونا ہے۔ وہ خوبصورت ہے چنچل ہے، شوخ ہے، بے باک ہے مگر اس کا کیا علاج کہ بالکل خاموش ہے۔

ادہم۔ او ناشکر گذار جج تمہیں اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے۔ کم سخن عورت تو قدرت کے نوادرسے ہے۔

دانیال۔ کم سخن نہیں گونگی ہے۔ بے زبان ہے ارے اُس کا منہ تو بالکل سنسان ہے۔

ادہم۔ وہ گونگی تھی تو تم اندھے نہ تھے۔ پہلے ہی دیکھ لیا ہوتا۔

دانیال۔ میں جو تمام دن اہلِ مقدمہ کی خلفشار، چپراسیوں کی چیخ پکار، اور وکیلوں کی بک بک، جھک جھک میں گذارتا ہوں۔ اس سنگ مرمر کے بُت کو سامنے بٹھا کر کیا کروں۔ بات تو جب ہے، جج کی بیوی ہو، بیوی کی آواز ہو، آواز میں تاثیر ہو، تاثیر میں جذب ہو، جذب میں یہ کرشمہ ہو کہ اچھی خاصی رشوت کو معصوم تحفہ میں تبدیل کر دے۔

ادہم۔ کفرانِ نعمت کی حد ہو گئی۔ اماں! یہ بیوی تو تمہیں خلعتِ دیانت دیتی ہے۔ لیکن تم نے بدن ہی ایسا پایا ہے کہ راس نہیں آتی۔

دانیال۔ (ہنستا ہے) بچوں کی باتیں پیاری ہوتی ہیں، مگر منطق سے علاقہ نہیں رکھتیں۔ ست جگ میں گھوم رہے ہو کیا؟ آج کل دیانت داری کا کون گاہک ہے؟ زبانِ خلق کے نقارہ سے یہ آواز آتی ہے کہ سر بفلک کوٹھیاں موٹروں کی قطاریں، زرق برق لباس، بنکوں میں حساب کی فراوانی، تنخواہ سے میسر نہیں آتی، البتہ بیوی اس کی پردہ پوش ہو سکتی ہے مگر میرے یہاں تو وہ بولتی ہی نہیں۔

ادہم۔ اب تم یہی چاہتے ہو نا کہ تمہاری بیوی کی زبان کھل جائے۔ بس۔

دانیال۔ اور کیا۔ (کان میں) بھائی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ میں بسا اوقات فیصلہ بھی اشاروں میں سنا دیا کرتا ہوں۔

ادہم۔ تو ڈاکٹر سائمن سے رجوع لاؤ اس نے ہزاروں گونگے کتوں پر تجربہ کیا ہے اور اس کی دوا سے وہ گھن گرج آواز سے بھونکنے لگے ہیں۔ تمہارے پڑوس میں رہتے ہیں اور آج تک خبر نہ ہوئی تمہیں۔ سچ ہے جج وہی اچھا ہے جسے مثل کے سوا دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ ہو کان کھول کر سنو۔ ایک انجکشن میں طوطے کی طرح نہ چہکنے تو کہنا۔

دانیال۔ کیا کہنے ڈاکٹروں کے، مگر بھائی کہیں بنا تو نہیں رہے۔

ادہم۔ عدالت میں تھوڑی کھڑا ہوں جو جھوٹ بولنا فرض ہو

دانیال۔ تو پھر ڈاکٹر کو بلاؤں۔

ادہم۔ مگر سوچ لو، کم سخن بیوی روز روز نہیں ملتی۔ اگر ایک دفعہ یہ سوتا پھوٹ پڑا تو بند کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ تمہاری عدالت میں سرکار بنام چھینگا ایک مقدمہ ہے اور اُس میں مَیں وکیل ہوں۔ یہ میرا پہلا مقدمہ ہے مثل تو مکمل ہو چکی ہے (کاغذ جیب سے نکال کر دیتا ہے) یہ عذر قابلِ غور ہیں۔ اس کا ذرا خیال رکھنا بھئی۔

دانیال۔ اور اُسے بھی تو کہو ذرا میرا خیال رکھے۔

ادہم۔ اس وقت تو حوالات میں ہے بچارا۔ بعد میں جب کام شروع کرے گا تو دیکھا جائے گا۔

دانیال۔ بعد میں دعا یاد رہا۔ (ادہم جاتا ہے)

دوسرا سین

جج اور سررشتہ دار

دانیال۔ کچھ کہنا ہے تو جلد کہو۔

سررشتہ دار۔ کیا کہنا ہے حضور، دنیا کافی کہہ رہی ہے۔

دانیال۔ آخر دنیا کیا کہہ رہی ہے؟

سررشتہ دار۔ یہی کہ جج صاحب بیوی سے کھیلتے رہتے ہیں اور کام نہیں کرتے۔

دانیال۔ اس کم بخت دنیا نے جج کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ بیان لکھے، وکیلوں کی روک تھام کرے، فیصلہ سنائے اور اُن میں انشا کے کرشمے دکھائے، پھانسی کے وقت ملک الموت کا قائم مقام بنے، اس کے سوا ادھر اُدھر نہ دیکھے۔

دنیا جہان بیویاں کرتا ہے تو کوئی انہیں پوچھتا تک نہیں۔ لیکن میں جو شادی کر بیٹھا تو سب کٹے مرتے ہیں کم بخت اچھا جاؤ۔

(سررشتہ دار جاتا ہے ادہم آتا ہے)

ادہم ۔ کہئے وہ فیصلہ لکھ چکے؟

دانیال ۔ ارے بھائی ادہم فیصلہ لکھنا کوئی بچوں کا کھیل ہے۔ چار شخصوں کے متحدہ جھوٹ سے سچ ڈھونڈ نکالنا تنہائی چاہتا ہے۔ سکون چاہتا ہے۔ مگر مجھے یہ کہاں نصیب پہاڑوں کی چوٹیوں پر، غاروں کی تہ میں جنگلوں، بیابانوں مرگھٹ قبرستانوں میں شلیں سر پر اُٹھائے اُٹھائے پھرا مگر قسم لے لو جو یکسوئی خاطر حاصل ہوئی ہو۔

ادہم ۔ پھر؟

دانیال ۔ پھر یہ کہ شلیں جوں کی توں میز پر پڑی ہیں اور فصاحت و بلاغت کے دریا دل میں اُمنڈ رہے ہیں مگر کاغذ پر نہیں آسکتے۔ اور وجہ میری بیوی۔

ادہم ۔ اُسے کیا ہوا؟

دانیال ۔ تمہارے کہنے پر ڈاکٹر سائمن کو بلوا بیٹھا اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ انجکشن کر مارا۔

ادہم ۔ زبان نہیں کھلی؟

دانیال ۔ نہیں کھلی! ارے بھائی ادھم اُس وقت سے بند کب ہوئی تھی۔

ادہم ۔ کیا گویائی صاف نہیں؟

دانیال ۔ صاف ہے مگر بہت زیادہ ہے اگر اُس کی گفتار کی رفتار یہی رہی تو مجھے عدالت سے فرار پر قرار پکڑنا پڑے گا۔

ادہم ۔ یہ گیند مدت سے مٹھی میں بند تھی۔ اس لئے غیر معمولی تیزی سے ابھری ہے۔ اعتدال اُسے خود زمین پر لے آئیگا ذرا صبر سے کام لو اور میرے مقدمہ سے جی بہلاؤ۔

دانیال ۔ پہلے اسی پر ہاتھ صاف کرتا ہوں۔

تیسرا سین

(دانیال شل دیکھ رہا ہے۔ نکہت چرخہ کات رہی ہے)

جج (شل کا عنوان پڑھتا ہے) سرکار بنام چھینگا (کھتا ہے اور ساتھ ساتھ پڑھتا جاتا ہے) ۱۸ اور ۱۹۔ اکتوبر ۱۸۹۲ء کی

درمیانی شب کو آسمان پر سیاہ بادلوں نے گھٹا ٹوپ ڈال رکھا تھا۔ رعد گرج رہا تھا۔ بجلی کوند رہی تھی۔ ہوا جھڑے چلتی تناور درختوں کا سرِ غرور خم کر رہی تھی۔ ٹھنڈ اس بلا کی تھی کہ لحاف کو خاطر تلے نہ لاتی تھی۔ بڑے بڑے کارخانوں کے پل اور چھت برف کی چادر بن رہے تھے۔ وہ بازار جن میں آدھی رات تک میلا لگا رہتا تھا ایسے سنسان پڑے تھے کہ شہرِ خموشاں کا گمان ہوتا تھا۔ بجلی کے ہنڈے تک روپوش ہو گئے تھے۔ ایسے مہیب سماں میں چھینگا۔۔۔۔

نکہت (چرخہ چھوڑ کر) میاں کیا کر رہے ہو۔ آگ لگے اس کام کو تم نے تو اپنی ٹکا سی جان ہلکان کر دی اور ہمیں بھی نہیں یا کرایا۔ آرام بھی کیا چاہیے کسی وقت جس وقت دیکھو مشغل۔ دو بول بات کرنے کے بھی روادار نہیں۔ اے ہے اب ہو کیا رہا ہے آخر؟

دانیال۔ بیگم۔

نکہت۔ تو کوئی راز کی بات ہے؟

دانیال۔ دیکھو نا

نکہت۔ اس میں جھگڑا ہی کیا ہے۔ نہ بتاؤ۔ قصہ ختم۔

دانیال۔ کچھ کہنے دو تو بتاؤں۔ ایک مقدمہ کا فیصلہ لکھ رہا ہوں۔

نکہت۔ بس اتنی بات کے لئے یہ جھنجھٹ۔ مگر میاں یہ تو بڑی ذمہ داری کا کام ہوگا؟

دانیال۔ ذمہ داری سی ذمہ داری! پھر یہ کہ آنکھ پر پٹی باندھ کر صرف کان سے سننا ہے۔ لوگوں کی عزت، دولت، بیوی بلکہ جان تک جج کی نوکِ قلم پر ہوتی ہے۔ باوجود ان قیدوں کے اگر فیصلہ میں روزمرہ کی صفائی، محاورہ کی درستی تو اتر سے پیرا، فقروں کا مناسب دروبست اور انشاپردازی کے جوہر نہ ہوں تو فیصلہ رپورٹ میں چھپتا ہی نہیں۔

نکہت۔ اوہو یہ بات ہے تو دل لگا کر لکھئے میں چپ چاپ بیٹھی رہوں گی۔

دانیال۔ شاباش۔ اس مہیب سماں میں چھینگا اپنے گھر سے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نکہت۔ ذرا یہ تو بتانا گلابی ساری کے ساتھ کس رنگ کا بلوز پھبتا ہے۔ بگوڑی بہار کہتی تھی اگرئی ساری اور دھانی بلوز گنوارن کو اتنا معلوم نہیں کہ اس سے زیادہ انمل رنگ اور کیا ہو نگے۔

دانیال۔ بھاڑ میں جائیں یہ رنگ مجھے۔۔۔

نکہت۔ میں کام والی ساری پسند کرتی ہوں۔ ہاں پھول کھلے کھلے ہوں۔ کوئی یہاں کوئی وہاں۔ یہ نہ ہو میاں پورا گلدستہ سینہ پر سوار ہو جائے۔ رہا رنگ۔

دانیال۔ میں پھر کہتا ہوں کہ........

نکہت۔ تو یہ آنکھ چاہتا ہے، ہاں سرونے کے ہوتے گنڈیریاں چھیلنے کے لئے گنڈاسے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ یہ سرونے سے ایسی خوبصورت گنڈیریاں ....

دانیال۔ درست ہے مگر...

نکہت۔ ہاں یہ پوچھنا تو بھول گئی، میاں دیکھو عورتوں کے لئے یہ بال جان کا جنجال ہو رہے ہیں۔ اگر اس بوجھ کو ذرا ہلکا کر دیں تو مردوں کے کیوں بارِ خاطر ہو۔---

دانیال۔ یہ کیا قصہ ہے؟

نکہت۔ ہاں تمہیں فیصلہ لکھنا ہے۔ میاں ایسا لکھو کہ چھپ کر پڑی نکلے۔ مدرسوں کے نصاب میں داخل ہو جائے۔

دانیال۔ تو تھوڑی دیر کے لئے زبان کو لگام دو۔ یہ نہیں ہو سکتا تو کہیں اور جا کر بولنے کی مشق کرو۔ زمین و آسمان گھوم رہا ہے اور میں فضا میں معلق لٹک رہا ہوں۔ یہ نقشہ ہے۔ سنا۔

نکہت۔ بگڑتے کیوں ہو میاں! قسم لے لو جو ایک لفظ بھی منہ سے نکالوں۔

دانیال ...... چھینگا اپنے گھر سے باہر نکلا۔

نکہت (اخبار دیکھ کر) میاں یہ نہرو رپورٹ کس جماعت میں پڑھائی جاتی ہے۔ دو لفظوں میں خلاصہ کہہ ڈالو گے۔

دانیال۔ اچھا اچھا۔ اور چھینگا نے رحیمن کے مکان کا رخ کیا۔

نکہت۔ آخر مولوی مدن کو اس عمر میں سوجھی کیا جو عورتوں کے لباس کے خلاف وعظ کہتے پھرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر عورتوں کے لباس اور سنگار کا یہی عالم رہا تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ کوئی اس بھلے مانس سے پوچھے کہ ہندوستان کی تباہی کو اجلی کی دھلائی سے کیا واسطہ۔

دانیال (دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر) دیوانہ، دیوانہ، میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔

نکہت۔ میری باتوں سے ہرج ہوتا ہوگا؟ اب بالکل چپ رہوں گی۔

دانیال۔ مرحبا۔

نکہت۔ دیکھو بت بنی بیٹھی ہوں۔ میری چپ کی داد دینا۔ بس عالی جیسی ہو۔

دانیال۔ بے شک۔

نکہت۔ اب مزے سے کام کئے جاؤ۔

دانیال۔ اچھا۔
نکہت۔ اور حسین سے فیصلہ لکھو جلد ختم ہو جائے گا۔
دانیال۔ اگر زبان بند نہ ہوگی تو کبھی نہ ہوگا (لکھتا ہے) حسین کے خاوند نے دروازہ کھولا مکان بہت صاف و ستھرا تھا۔
نکہت۔ کیا ہوگیا تمہیں۔ اتنا بھی خیال نہیں کہ ہندی لفظوں میں واو عطف کی نہیں آتی۔
دانیال۔ خدا کے واسطے میرے دماغ پر رحم کرو اور اس کمبخت کو روکو (غراتا ہے)
نکہت۔ کہتی تھی اتنی محنت نہ کرو، ڈاکٹر کو بلاؤں۔
دانیال۔ اسی کی تو یہ عنایت ہے۔
نکہت۔ آرام کرو آرام۔
دانیال۔ یہ کترنی کبھی بند نہ ہوگی؟
نکہت۔ یہ بات ہے تو میں خاموش رہوں گی۔
دانیال۔ خدا تمہیں ہمت دے (قلم اُٹھاتا ہے)
نکہت۔ تم نے نام لیا تو دھیان آیا۔ بعض کہتے ہیں ہمت عورت کا تخلص ہے اور بعض کہتے ہیں مرد کا۔ بہرحال اُس بلند پایہ شاعر کے جگت استاد ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ کچہری سے لوٹتے وقت . . . .
دانیال (کانوں میں انگلیاں دے کر) الامان۔ (مثل بغل میں داب کر الماری پر چڑھتا ہے نکہت پہلے زینہ پر کھڑی ہے)
نکہت۔ یہ مجن جو آتی ہے سرمہ سی بیچنے بڑی ایک ہے۔ بس کی گانٹھ ہے۔ میں نے آج نکال باہر کیا مردار کو
دانیال۔ ہٹ جاؤ۔ سرک جاؤ۔ میرے سامنے نہ آؤ۔ میں اپنے آپ میں نہیں ہوں کوئی جُرم دفعہ کی ہدایت کے خلاف کر بیٹھوں گا۔ شگوفہ! شگوفہ! اری او شگوفہ کی بچی (شگوفہ آتی ہے) کم بخت یہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر میرا منہ کیا تکتی ہے۔ جا جھپاٹے سے ڈاکٹر سائمن کو بلا لا۔ اُسے کہنا مرض نے پلٹا کھایا ہے۔
شگوفہ۔ ابھی گئی ابھی آئی۔ (جاتی ہے)
نکہت۔ بہت بے قرار ہو۔ میں جانوں گرمی چڑھ گئی دماغ کو۔ میاں آئس کریم اور فالودہ کھاؤ۔ اللہ بخشے بڑ انا کہتی تھی . . . . . .

دانیال۔ جہنم میں جائے تیری اماں اور چولہے میں پڑے تیری زبان۔

(کاغذوں کا ایک پلندا اُٹھا کر نکہت کی طرف پھینکتا ہے۔ جو زینہ سے اتر کر بالاخانہ کو بھاگتی ہے)

نکہت۔ اے لوگو دوڑو، دوڑو، میرا خاوند دیوانہ ہوگیا۔

چوتھا سین

ادہم۔ تو کیا فیصلہ لکھا گیا؟

دانیال۔ ہاں مگر کیا بتاؤں کن جان جوکھوں سے تمہارے موکل کو بری کیا ہے۔ سنو گے کیا؟

ادہم۔ فرمائیے۔

دانیال (فیصلہ پڑھتا ہے) عرض کیا ہے۔ ایسے مہیب سماں میں چھینگا اپنے گھر سے نکلا اور رحیمن کے گھر کا رخ کیا۔ اُس کی انا کہتی ہی رہی کہ اندھیرے میں باہر نہ جاؤ چیختی چلاتی عورتیں راستہ روک لیتی ہیں۔ جب رحیمن کے مکان پر گیا تو وہ اگرئی ساری اور دھانی بلوز پہنے کھڑی تھی۔ حالانکہ اُس کے خاوند نے کہا تھا کہ کام والی ساری پہنا کرو۔ دیرپا ہوتی ہے۔ اور قیمتی کپڑے نہ پہنا کرو، کہ ان سے ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ رحیمن نے بگڑ کر کہا مجھے نہرو رپورٹ کی قسم ہے کہ میں بالوں کے جنجال سے جلد فارغ البال ہو جاؤں گی۔ ہمت شاعرہ ہو یا شاعر اس سے بحث نہیں مگر پتے کی کہی ہے کہ عورت خواہ جمن ہو مگر بس کی گانٹھ ہوتی ہے۔ بھلا اجلی کی دھلائی کو ہندوستان کی تباہی سے کیا نسبت اس پر رحیمن کے خاوند کو حرارہ آگیا۔ اور اُس نے گنڈاسے سے رحیمن پر حملہ کیا۔ یہ رحیمن کی غلطی تھی کہ سروتے کے ہوتے گنڈاسا منگوایا۔ بس ایک وار میں رحیمن چل بسی اور رحیمن کے خاوند نے خودکشی کر لی۔ پولیس موقع پر پہنچی تو چھینگا کو گرفتار کر کے عدالت میں لے آئی۔ مگر میں نظام سقے کے مشکیزے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہے اور میں اُسے آزاد کرتا ہوں۔ درج رہے کہ گو ہندی لفظوں میں واؤ عطف کی نہیں آتی۔ مگر اس کے خلاف سندیں موجود ہیں۔

ادہم۔ یہ کیا الم غلم لکھ مارا ہے جس کا سر ہے نہ پیر۔

دانیال۔ بس جج کا قلم ہے جدھر چل گیا چل گیا۔ کوئی مرے یا جئے، مگر قسمت کا لکھا اور جج کا فیصلہ نہیں ٹل سکتا۔

ادہم۔ مگر یہ نتائج تم نے کس شہادت سے اخذ کیے۔

دانیال۔ کیا دقیانوسی باتیں کرتے ہو آج کل تو جج کی کہی ورشنی بنشٹی ہوتی ہے۔ جو ہر جگہ پرمان ہو سکتی ہے۔ وہ رائے

گیا جب جج کو اپنی لڑکے کا ثبوت دینا پڑتا تھا۔

(ڈاکٹر آتا ہے)

دانیال۔ ڈاکٹر صاحب بہت راہ دکھائی۔ بہت ضروری کام ہے۔

ڈاکٹر۔ فرمائیے کیا حکم ہے کیا آپ کے دشمنوں کو کوئی تکلیف ہے۔

دانیال۔ نہیں میری بیوی کا علاج کیجئے۔

ڈاکٹر۔ کیا بولنے میں کچھ دقت محسوس ہوتی ہے۔

دانیال۔ مجھے اس کے بولنے سے تکلیف ہوتی ہے۔

ڈاکٹر۔ تکلیف آپ کو علاج بیوی کا۔ یہ کیا معما ہے۔

دانیال۔ ڈاکٹر صاحب وہ اس قدر باتیں کرتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ میں چاہتا ہوں کہ پھر سے گونگی ہو جائے باتوں کا یہ طوفان ہے کہ تھمنے ہی میں نہیں آتا۔ میں دیوانہ ہو جاؤں گا مجھے اُس کی زبان سے بچاؤ۔ میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اسے پھر گونگا کردیں۔

ڈاکٹر۔ بالکل ناممکن۔

دانیال۔ کیا کہہ رہے ہو؟

ڈاکٹر۔ ہم عورتوں کی زبان کھول تو سکتے ہیں۔ مگر بند کرنا قدرت کے بس سے بھی باہر ہے۔

دانیال۔ تو میں مایوس ہو جاؤں؟

ڈاکٹر۔ افسوس ہے کہ حبوب، لبوب، جوارش، معجون، سفوف، جوشاندہ، خسانده، خمیرہ۔ کوئی عورت کی زبان نہیں روک سکتا۔

دانیال۔ مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟

ڈاکٹر۔ یہ میرے پیشے کے خلاف ہے۔

دانیال۔ تو میں کہیں کا نہیں رہا۔ بس اب گلے میں سل باندھ کر راوی میں کودپڑتا ہوں۔ بلا سے ڈوب جاؤں گا مگر اس چیخم دھاڑ سے تو نجات ملے گی۔

ڈاکٹر۔ آپ کی بیوی کا تو علاج نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ تو قابلِ علاج ہیں۔

دانیال۔ تو پھر کچھ کر دکھاؤ۔

ڈاکٹر۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ بیوی کی دائمی کلکل سے نجات پانے کا یہی علاج ہے، کہ خاوند کو بہرا کر دیا جائے۔
دانیال۔ یہ کہہ کیا رہے ہیں آپ؟
ادہم۔ آپ نہیں سمجھے بات یہ ہے کہ گو بیوی گونگی نہیں ہوسکتی مگر آپ بہرے ہوسکتے ہیں۔
دانیال۔ ہمیشہ کے لئے؟
ڈاکٹر۔ نہیں صرف مرتے دم تک اور اس ذمہ داری کے ساتھ کہ کبھی آپ کی بیوی کا ایک لفظ بھی آپ کے کانوں تک نہ پہنچے۔
دانیال مگر اس میں دقتیں ہیں۔
ادہم۔ مگر یہ علاج کس طرح ہوتا ہے جناب؟
ڈاکٹر۔ پہلے تو سیسہ پگلا کر کان میں ڈالا جاتا تھا۔
دانیال۔ میں قطعاً اس کے لئے تیار نہیں۔
ڈاکٹر۔ مگر اب یہ سفید سفوف استعمال کیا جاتا ہے۔
دانیال۔ شکریہ۔ مگر میں بہرا ہونا نہیں چاہتا۔ اِس پڑیا کو اپنی جیب میں رہنے دیجئے۔

(شگوفہ گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے)

شگوفہ (کانوں میں انگلیاں ڈالے) سرکار میرا استعفا۔ میرا سر چکر کھا رہا ہے اس قدر باتیں توبہ! توبہ! توبہ! بیگم صاحبہ حرام ہے جو ایک منٹ کے لئے بھی چپ رہتی ہوں۔
دانیال۔ سب مِل کر اسے ایک کمرے میں بند کر دو۔ یہاں نہ آنے پائے روکو۔

(نکہت آتی ہے)

ڈاکٹر۔ بیگم کہئے زبان کا کیا حال ہے۔
نکہت۔ شکریہ اب تو دو چار باتیں کر لیتی ہوں اور کافی ہے اتنا ہی، کیونکہ باتونی عورت کو کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ مگر یہ دیکھا آپ نے، جج صاحب کو میری باتیں نہیں بھاتیں۔ بس اتنی بات ہوئی وہ فیصلہ لکھ رہے تھے میں چپکے سے پاس بیٹھ گئی۔ لوگو بتاؤ اِس میں مجھ کمبخت نے کیا گناہ کیا۔ (خاوند سے) میں حیران ہوں کہ آخر آپ بگڑے کیوں، اماں جانی جنت آشیانی کہا کرتی تھیں کہ میاں بیوی میں کوئی راز نہ ہونا چاہئے اور سچ کہتی تھیں۔

دانیال۔ ڈاکٹر صاحب سفوف۔ سفید سفوف جلد نکالئے اور کان میں ڈال ہی دیجئے۔

(ڈاکٹر دانیال کے کان میں دوا ڈال دیتا ہے)

نکہت۔ اور یہ ہیں کہ بات تک کے روادار نہیں آخر میں بھی منہ میں زبان رکھتی ہوں۔

دانیال۔ واہ۔ واہ دوا کیا ہے اکسیر ہے۔ سناٹا ہی سناٹا، ہو کا عالم، بس یہ سمجھ لیجئے کہ قبرستان میں بیٹھا ہوں۔

(پردہ گرتا ہے)

نور الٰہی
محمد عمر

وجدانیات

یہاں میں مضطرب ہوں کاہشِ اندوہ فرقت سے
وہاں نغمے نکلتے ہیں کسی کی بزمِ عشرت سے

یہاں سوزِ دروں سے میرے دل کا خون ہوتا ہے
وہاں دستِ نگاریں سرخ ہیں مہندی کی رنگت سے

یہاں سینے میں میرے سانس بھی رک رک کے آتا ہے
وہاں آنا نہیں مشکل ہوا فرطِ نزاکت سے

یہاں پھولوں کو میں اپنے کلیجے سے لگاتا ہوں
وہاں رنگیں ہے محفل گیسوئے مشکیں کی نکہت سے

یہاں مجھ کو خمارِ عشق نے برباد کر ڈالا
وہاں ظاہر ہے مستی نرگسِ میگوں کی حالت سے

یہاں اک شمع کو میرا سیہ خانہ ترستا ہے
وہاں مہتاب بھی اک داغ ہے جوشِ لطافت سے

عابد علی عابد

راتوں کو

کسی کو کیا خبر ہے کون ہے بیدار راتوں کو
بہے پڑتے ہیں رخ پر کس کے اشکِ زار راتوں کو!

وہ پھول اے بلبلِ شوریدہ کس گلشن کی زینت ہے؟
کھٹکتا ہے ترے سینے میں جس کا خار راتوں کو

فروزاں کیوں نہ ہو جائے یکایک دل کی تاریکی
چمک اُٹھے جو میرا گوہرِ شہوار راتوں کو

خبر دیتا ہے اُن کی مجھ کو ہر تارِ نفس میرا
لگا رہتا ہے اُن سے مجھ تلک اک تار راتوں کو

ہوئی ہیں مدتیں لیکن گذرنے میں نہیں آتیں
الٰہی سست کیوں ہے وقت کی رفتار راتوں کو

یہ تارے کیوں چمکتے ہیں یہ موتی کیوں دمکتے ہیں؟
یہ کس کی آنکھ میں میرے لئے ہے پیار راتوں کو!

مجھے اے باغباں یکسر بہارِ زندگانی ہے
فلک پر ہے جو تیرا گلشنِ بے خار راتوں کو

مَیں کیا ہوں زندگی کیا ہے زمین و آسماں کیا ہیں!
مرے پیشِ نظر ہے عالمِ اسرار راتوں کو

ب۔ل

محبّت کی دُنیا

سلطنت کا انقلاب کتنا حشر خیز ہوتا ہے! انقلابِ روس نے دنیا کی تمام متمدن سلطنتوں میں جو روح فرسا سنسنی پیدا کردی تھی وہ محتاجِ بیان نہیں - روس کی فاقہ کش، تباہ حال اور مفلس رعایا نے امرا و اعیانِ سلطنت کے ناجائز جبر و تشدد، جور و ستم، بہیمیت و فرعونیت سے تنگ آکر بغاوت کا بازار گرم کردیا۔ اور زاریت کو ہمیشہ کے لئے آغوشِ لحد میں سُلا دیا۔ اسی کا اثر تھا کہ وہ امرا و اعیان جو زمانۂ زاریت میں فلاکت زدہ ہستیوں کے خون سے لعلِ ناب بناتے تھے اور دن رات عیش و عشرت اور انانیت و ثروت کے نشہ سے سرشار رہتے تھے فقیروں سے بدتر اور نانِ شبینہ تک کے محتاج ہوگئے۔ مساوات کا ڈنکا بج گیا اور امیر و غریب کا امتیاز مفقود ہوگیا۔ دربارِ سلطنت، عالیشان محلات، تماشا گاہیں، رقص خانے اور میکدے تہ و بالا ہوگئے۔ بہت سے آدمی تہ تیغ ہوئے اور باقی زمانہ کی نیرنگیوں اور تلخیوں کا تجربہ کرنے کے لئے بے زر اور بے گھر، پھٹے پرانے کپڑوں میں برف آلود سڑکوں پر بیدِ مجنوں کی طرح کانپتے ہوئے گداگری یا اخبار فروشی کرتے نظر آئے - ان جاں گداز مناظر کو دیکھ کر دنیا کی مہذب اقوام نے سرکش و بغاوت پسند گروہ کو "سرخ خطرہ" کے نام سے موسوم کیا اور اُس کی انتہائی ہیبت اُن کے دلوں پر طاری ہوگئی - ہزاروں نے اس گردشِ زمانہ کے تختۂ مشق بنے رہنا قبول کیا مگر بہت سے باہمت لوگوں نے جلا وطنی اختیار کرکے ملک کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہی اور مغربی یورپ میں جاکر پناہ لی۔ فرانس کے تمام ہوٹل تماشا گاہیں اور دیگر مقامات بے خانماں روسیوں سے پُر ہوگئے۔ جلیل القدر نوابوں اور امرا کی عورتوں نے ہوٹل اور دوکانیں کھول لیں۔ فوجی افسر موٹریں چلانے لگے۔

(۲)

فیڈر نیس میں مدت سے مقیم تھا۔ جنگِ عظیم سے پیشتر وہ نوجوان تھا۔ اُس کا رنگ کندن کی طرح دمکتا تھا۔ قد سرو سہی، آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ اور جادو بھری، دانت موتیوں کی طرح صاف شفاف، ناک ستوان اور ہونٹ گلابی تھے - اس حسن کے ساتھ وہ ملائکہ سے غریب آواز کا بھی مالک تھا۔ رقاصی میں کامل مہارت رکھتا تھا لیکن اچانک مصائب کا پہاڑ اُس کے سر پر ٹوٹ پڑا اور اُس کی زندگی میں ایک ہولناک تغیر پیدا ہوگیا۔ منہ پر جھریاں آنکھوں میں حلقے پڑ گئے، اُس کے سنہری بال روئی کے گالوں کی طرح بن گئے اور قد کمان کی طرح خمیدہ ہوگیا۔ اب وہ شکل و شباہت اور عمر کے لحاظ سے آفتابِ لبِ بام معلوم ہوتا تھا لیکن اس منظرِ حیات کے خطرناک عواقب کے سدباب کے لئے وہ اپنے

دل میں ایک مضبوط ارادے کی قوت کا احساس رکھتا تھا مگر اُس کی یہ بے سود قوت ایسی ہی تھی جیسی اُس ڈوبتے ہوئے جہاز کے ناخدا کی سعیِ بے حاصل جو عین وسطِ سمندر میں موت کے بھیانک پنجے کو صرف ایک گھنٹے تک اور روکے رکھتا ہے۔

اُس کے وہ ہم وطن جو نیس میں سکونت پذیر تھے فیڈر کے متعلق تمام معلومات سے باخبر رہنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ دراصل روس کا باشندہ تھا جب وہ صبح کی سیر میں خوش حال لوگوں کے پاس سے گذرتا تو وہ اُس کی تعظیم کرتے۔ روسی امرا کی بیوہ عورتیں جو شاہراہوں کی بنچوں پر بیٹھ کر بحیرہ روم کے طلوعِ آفتاب کے پرکیف منظر سے لطف اٹھانے اور لطیف و نکہت بیز ہوا سے اپنی شامِ جاں کو معطر کرنے میں مصروف ہوتیں فیڈر کی صورت دیکھ کر متبسم ہو جاتیں اور آپس میں اُس کی تعریف اس طرح کرتیں "وہ غریب فیڈر اپنے زمانہ کا لاثانی رقاص تھا۔" پتھر دل انسان بھی جب فیڈر کو دیکھتے تو اُن کے دل میں رقت وہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا اور اپنے ساتھیوں سے یہ الفاظ کہنے پر مجبور ہو جاتے "وہ جنگ سے پیشتر صاحبِ ثروت تھا اُس کے بھائی کو بولشویکوں نے قتل کر ڈالا اور اب وہ ناداری ومحتاجی میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا ہے۔

وہ لوگ جو فیڈر کے حالاتِ زندگی سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے تھے اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جب اُس کی آمدنی روس سے منقطع ہو گئی تو وہ اس وقت مشی گاہ کے نواح میں ایک عالیشان مکان میں فراغ بالی سے زندگی بسر کرتا تھا مگر اس کے بعد اس نے اپنے مکان کا ایک حصہ کسی دولت مند آدمی کو کرایہ پر دے کر ایک سال نہایت امن وسکون سے بسر کیا لیکن یہ ذریعۂ معاش بھی جلد ختم ہو گیا، کیونکہ اصل مالکِ مکان نے آہستہ آہستہ کرایہ کی رقم میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ فیڈر کے لئے اس سے فائدہ حاصل کرنا ناممکن ہو گیا۔ اُس نے اپنا تمام اسباب بیچ ڈالا اور اُس کی قیمت سے تین سال گذارے۔ اب وہ سب کچھ دے چکا تھا اور ہر طرح کی کفایت شعاری برتنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مالکِ مکان نے جو آسودگی کے ایام میں فیڈر کی کشادہ دلی اور فیاضی سے متاثر ہوا تھا اپنے مکان کا نچلا حصہ جہاں پہلے اس کا اسباب پڑا رہتا تھا بغیر کرایہ کے اُسے دے دیا۔ یہ جگہ سرد مرطوب اور تنگ وتاریک تھی۔ صرف دوپہر کے وقت کھڑکی کے راستے چند لمحوں کے لئے آفتاب کی شعاعیں اندر داخل ہوتی تھیں۔ اس زمین دوز غار میں فیڈر اور اس کے دو کتے رہتے تھے۔

فیڈر اُن کے بچوں کو فروخت کر کے کچھ روپیہ حاصل کر لیتا تھا۔ بہت سے امریکن اور یورپین امرا کے ساتھ اس کے تعلقات ابھی تک قائم تھے اور یہ بعض اوقات اُس کو اپنی دعوتوں اور کھانوں پر مدعو کر لیتے تھے۔ ان تقریبوں

پر فیڈر کو اپنی گذشتہ زندگی کے لذائذ سے تو حلاوت اندوز ہونے کا موقع حاصل ہوجاتا، لیکن کوئی میزبان بھی اسے تحفۃً بلاعوض کے طور پر روپیہ پیش کرنے کی جرات نہ کرتا - بلکہ بعض اوقات کوئی خاتون کتے کے لئے فرمائش پیش کردیتی جس کو فیڈر ہمیشہ بنظرِ استحسان قبول کرنے پر مجبور ہوتا - لیکن جس روز کوئی دعوتی رقعہ وصول نہ ہوتا فلاکت زدہ فیڈر گاؤں کے کسی ارزاں ترین ہوٹل میں شکم پُری کے لئے چلا جاتا - دوپہر کے بعد وہ کتوں کو سیر کرانے کے لئے باہر نکلتا اور جب ویران مشی گاہ پر سے گزرتا تو وہ ایک گڈریے کی مانند معلوم ہوتا جس کے پیچھے اُس کی بھیڑوں کا گلہ جا رہا ہو جب اُس کے چوپائے میدان کی آزاد فضا میں اچھلنے اور کودنے لگتے تو وہ ایک بنچ پر بیٹھ کر سمندر کی لطیف لہروں کو دیکھنے میں منہمک ہوجاتا - ہاں وہ اپنے تخیل میں نیلے افق سے بھی پرے چلا جاتا - وہ ایک دُور دراز ملک روس میں پہنچ جاتا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ویران و شکستہ مکان میں وہ حسین وجمیل ہستی آجاتی جس کی یاد اُس کے دل سے کبھی نہ مٹنے والی تھی -

(۳)

فیڈر جب اپنی زندگی پر نظرِ غائر ڈالتا تو اُسے اپنا عالمِ شباب پریوں کے افسانوں سے مشابہت رکھتا ہوا نظر آتا -

درحقیقت فیڈر کے فسانۂ زندگی کی ابتدا اُس کی عمر کے پنتالیسویں برس سے ہوتی ہے - اس وقت تک اُس کے جذباتِ حسن وعشق یخ بستہ تھے "محبت"! اکثر وہ اس لفظ پر مضحکہ آمیز قہقہہ مارتا لیکن ویرا الگزنڈرونا نے جو سائبیریا میں ایک کان کے مالک ولینسکی کی بیوہ تھی، محبت کی چنگاری کو اُس کے دل میں مشتعل کردیا۔

اول ان دونوں کی ملاقات سینٹ پیٹرزبرگ میں ہوئی - ویرا روس کے ایک فوجی جرنیل بوڈکن کی لڑکی تھی جو اپنے عالمِ دوشیزگی میں آرائش اور آزادی کی دلدادہ تھی - جنرل کی تنخواہ اُس کے اخراجات کی متحمل نہ ہوسکتی تھی اس لئے اُس نے ایک کان کے مالک ولینسکی کے ساتھ شادی کرلی، تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُس کا شوہر مر گیا لیکن سونے اور دیگر دھاتوں کی کانوں نے ویرا کے اخراجات کے لئے کافی سرمایہ مہیا کردیا تھا عوام کی نگاہوں میں ویرا کی آزادی اور غیر معمولی طرز رہائش کھٹکتی تھی - اس لئے ویرا نے روس کو خیرباد کہہ کر پیرس میں اقامت اختیار کی یہاں اُس نے دس برس بسر کئے - فیڈر اور ویرا کی ملاقاتیں اکثر تھیٹروں، شاہراہوں اور مختلف تقریبوں پر ہوتی تھیں - رفتہ رفتہ ارتباط بڑھتا گیا - زہرہ تمثال ویرا اور فیڈر کی قرابت نے لوگوں کے دلوں میں رشک وحسد کی آگ لگادی - اور اُن کی حاسدانہ مدح سرائی نے فیڈر کی خود پسندی پر تازیانہ کا کام کیا - ویرا نیلم جیسی آنکھوں، سنہری لمبے لمبے

بالوں، صاعقہ نواز نگاہوں والی خوبصورت نازنین تھی۔ اور وہ اُن چند مخصوص ہستیوں میں سے تھی جن کے حسن کی داستان سے نیس کی کوئی رنگین محفل خالی نظر نہ آتی تھی۔ پہلے پہلے فیڈر محض اُس کا مدح سرا تھا۔ لیکن حسین شے کی تعریف کرنا اُس کی فطرت میں داخل تھا۔ اس کے بعد تعلقاتِ محبت وسیع ہوتے گئے یہاں تک کہ وہ ایک جان اور دو قالب بن گئے۔

پانچ سال اسی طرح گذر گئے۔ مغربی یورپ کے تمام عمدہ مقامات کی سیر سے وہ لطف اندوز ہوتے رہے اور اپنی زندگی کو ہر ممکن طریقہ سے خوشگوار بنانے کی جدوجہد پر قائم رہے۔ پھر دفعتہً جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ لڑائی کے پہلے سال میں انہوں نے کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کی۔ گو حکومتِ زار نے روپیہ کی برآمد کو محدود کر دیا تھا۔

ویرا کی زندگی میں اب پہلی دفعہ وطن اور خاندان کی محبت پیدا ہوئی۔ اُس کا باپ اور بھائی سرحد پر لڑ رہے تھے اس لئے اس کو پیرس کے عیش و عشرت میں مصروف رہنے کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ روسی نژاد تھی، اس لئے ملک کی خدمت اُس کا فرضِ اولیں تھا۔ فیڈر کو یہ مفارقت ناگزیر تھی۔ اس لئے وہ ویرا کے ہمراہ جانے پر مصر ہوا لیکن ویرا اپنی زندگی کو تو وطنیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کو تیار تھی مگر اُس ہستی کو جو اُس کے لئے مرکزِ محبت بن چکی تھی کبھی خطرہ میں پڑنے کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ آخر وہ دن بھی آیا جب وہ ایک انگریزی جہاز میں سوار ہو کر ناروے کی طرف روانہ ہوگئی اور دونوں پرستارانِ محبت باچشمِ نم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ فیڈر پیرس ہی میں مقیم رہا کیونکہ اُس کا بڑھاپا فوجی خدمات کے لئے ناموزون تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ وہ اپنے ہم وطنوں اور دوستوں کی خدمت مغربی ممالک میں رہ کر بھی کر سکتا ہے۔

(۴)

لڑائی کے سال، وہ سال جو صدیوں کے واقعات سے لبریز تھے گذر گئے۔ روس میں زار کی حکومت برباد ہو گئی۔ اور مطلق العنانی کو بالشویکوں نے تاخت و تاراج کر دیا۔ لیکن فیڈر کو اس دُور دراز ملک کے جانسوز واقعات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف اُن لوگوں کی عافیت کا متمنی تھا، جن کی محبت اس کے دل کو آباد کئے ہوئے تھی۔ جب کبھی وہ کوئی خبر روس کے متعلق سنتا تو اُس کے دل و دماغ میں چند سوالات کا ہجوم پیدا ہو جاتا "ویرا کیسی ہے؟ میرے بھائی کا کیا حال ہے؟"

کافی عرصہ گذرنے کے بعد ویرا کے دو خطوط موصول ہوئے۔ پہلے خط میں اُس نے اپنے بھائی اور دوسرے میں باپ کی المناک موت کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن اپنے گھر سے اُسے کوئی خط نہیں ملا تھا۔ آخر کار جلاوطنوں کی آمد سے

معلوم ہوا کہ اُس کا بھائی روس کے دیگر امراء کے ساتھ قتل ہو چکا ہے اور اُس کا کارخانہ نیست و نابود ہو گیا ہے۔ اب اُس کے لئے امید کی ایک ہی کرن باقی تھی ۔۔۔۔۔۔ ویرا، جو اس کی محبت و تخیل کا مجموعہ تھی۔

فیڈر تمام جلا وطنوں سے ویرا کے متعلق حالات دریافت کرتا۔ ویرا اُس کا شیرازۂ تخیل تھی۔ سورج کی تیز شعاعوں میں وہ اسی کے خیال میں مستغرق پھرتا رہتا۔ ساکت و متبسم جھیل کو نظرِ امعان سے دیکھتے ہوئے اُس کے دل کی آنکھوں کے سامنے ایک خیالی پیکر نمودار ہو جاتا۔ یہ خیالی پیکر سینٹ پیٹرزبرگ کی ایک یخ بستہ گلی میں ایک ویران تنہا مکان ہوتا جس میں ایک نحیف و نزار عورت کانپ رہی ہوتی۔

"زمانہ بدل گیا ہے" فیڈر نے اپنے دل میں سوچا۔ وہ اپنے گرد و نواح کی اشیا پر عجب بے پروائی کی نگاہوں سے دیکھتا تھا لیکن ہر چیز میں اُسے ویرا کی صورت نظر آتی تھی، وہ اُس عظیم الشان ہوٹل کی عمارت پر نگاہ ڈالتا جس میں وہ دونوں کبھی سکونت پذیر تھے اور اُس ہوٹل پر جس میں گراں قیمت کھانوں اور آبِ آتشیں کے بل کبھی اُس نے نہایت بے پروائی سے ادا کئے تھے۔ اب وہ اُن کی کھڑکیوں میں سے فقیروں کی طرح جھانکتا تھا۔ لڑائی سے پیشتر انہوں نے دولت کی مطلق قدر نہیں کی تھی۔ ویرا نے ایک سال میں دس ہزار فرانک صرف لباس پر خرچ کئے تھے، اور اُس کے زیور اس قدر قیمتی تھے کہ ہوٹل کا مالک اُن کی حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوتا تھا۔

فیڈر کا تصور ویرا کو کرم خوردہ اور پھٹے پرانے کپڑوں میں پیش کرنے سے عاجز تھا۔ بلکہ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان مصائب و آلام سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے دوسرے آدمیوں کی طرح اُس کی روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہوگی۔ لیکن ایک روز اس ناامیدی و مایوسی میں امید کی جھلک دکھائی دی۔

(۵)

روسی مہاجرین جو ساحلِ بحیرہ روم پر پناہ گزین تھے بمشکل اس کے ہم وطن کہلائے جا سکتے تھے۔ فیڈر نے فرانس میں تعلیم حاصل کی تھی اور زندگی کا بیشتر حصہ مغربی یورپ میں بسر کیا تھا۔ اگر فیڈر اپنے وطن ہی میں رہتا تو ایک دولتمند کارخانہ دار کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے امرائے حکومت کے ساتھ اُس کے دیرینہ تعلقات قائم رہتے لیکن اس دلکش مغربی شہر میں بھی وہ ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔

فیڈر روسی پناہ گیروں کے اُن مباحث میں کبھی حصہ نہ لیتا تھا جن میں بولشویکوں کے ظلم و ستم پر لعنت و ملامت کے فقرے چست کئے جاتے تھے۔ مغربی مہذبوں کے خیال کے مطابق اُن کے سر پر جنون سوار تھا مگر اُن کی گفتار صداقت سے لبریز تھی۔ اُن کی نظر میں فیڈر ایک اجنبی، کاہل اور ناکارہ محض تھا۔ باوجود اس ناموافقت کے فیڈر ہمیشہ اُن کے

جلسوں میں شریک ہوتا۔ اتفاقاً ایک روز ایک ستم زدہ عورت ٹاٹیانا نے اپنی داستانِ غم کے دوران میں ویرا کا بھی تذکرہ کیا۔ فیڈر چونک اُٹھا اُس کا رنگ زرد ہوگیا اور وہ بیدِ مجنوں کی طرح کانپنے لگا" ویرا الگزنڈرونا" اُس نے دریافت کیا" تم نے ویرا کو آخری ملاقات کے وقت کس حالت میں دیکھا تھا" ٹاٹیانا اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکی کہ آج سے تین ماہ پیشتر وہ زندہ تھی" جب میں فرار کی جدوجہد میں مصروف تھی تو وہ مجھ سے ملی تھی"

فیڈر نے متجسسانہ انداز میں پوچھا" کیا وہ ابھی تک حسین ہے۔

ٹاٹیانا نے رحم اور تعجب کی نظر سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا" حسن؟ روس میں اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں۔ میری طرف دیکھو۔ بغاوت سے پیشتر میرا شمار بھی حسین عورتوں میں تھا مگر اب ......"

فیڈر نے ایک ظالم عاشق کی مانند جو سوائے اپنی محبوبہ کے تمام عورتوں میں عیوب و نقائص تلاش کرتا ہے اس کی طرف دیکھا۔ ٹاٹیانا ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی، جو ویرا سے بارہ یا پندرہ برس بڑی ہوگی" یقیناً ویرا کی حالت میں تغیر ہوگیا ہوگا۔ لیکن اب بھی وہ اس عورت کی مانند بدصورت نہیں دکھائی دے گی" اُس نے اپنے دل میں کہا۔

اس کے بعد فیڈر کے تخیل میں ویرا کا خیالی پیکر زیادہ شگفتگی سے ظہور پذیر ہونے لگا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ ضرور تبدیل ہوگئی ہوگی۔ اُس کا چہرہ قدرے نحیف ہوچکا ہوگا لیکن ملامت و رعونت کے آثار اُس پر نمایاں ہوگئے۔ اس کی نیلم جیسی آنکھیں تاثرِ آلام سے زیادہ فسوں کار ہوگئی ہونگی آخر اُس نے ایک جگر پاش آہ بھری اور کہا" کاش کہ وہ یہاں موجود ہوتی! غریب مفلس تو ہم ضرور ہوگئے لیکن کم از کم اکٹھے تو ہونگے" اس خیال نے اُس کی روح میں ایک زبردست قوت پیدا کردی۔

"وہ آرہی ہے۔ وہ آرہی ہے" یہ الفاظ متواتر اُس کی زبان سے نکلے، اس حالت میں کہ وہ ایک روز اپنے آلام میں محو سمندر کی لہروں پر غور کررہا تھا۔ اس کے خوشگوار خواب کی تعبیر ظاہر ہونے والی تھی۔

ایک دن وہ خاموش اور متفکر اپنے چہرے کی موجودہ حالت کا ویرا کے ملائک فریب چہرے سے مقابلہ کررہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ٹاٹیانا نے آواز دی" ویرا آگئی! وہ کل شام کو یہاں پہنچی ہے" فیڈر اُس کے الفاظ کا مطلب اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔ اُس نے دل میں کہا" یہ کیونکر ممکن ہے کہ ویرا کے یہاں پہنچنے سے پیشتر اُس کی آمد کی خبر اخباروں میں شائع نہ ہو" وہ آئینہ کی جانب اپنی حالت کا معائنہ کرنے کے لئے لپکا۔ اُسے خیال آیا کہ پہلے حجامت بنوالینی چاہئے اور کپڑے بھی تبدیل کرنے چاہئیں۔ لیکن معاً اُس نے ان بے سود اور کمینہ خیالات کو محسوس کرلیا اور نیک دل عورت کے ساتھ ہولیا۔

ٹاٹیانا فیڈر کو محروجین کی ایک ایسی اقامت گاہ میں لے گئی جس سے وہ پہلے ناواقف تھا۔ فلاکت زدہ اور

درماندہ عورتوں کے مجمع پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر اُس نے کہا "میں ویرا الگزینڈرونا دختر جرنیل بوڈکن سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میں سے کوئی خاتون مہربانی سے اُس کا پتہ بتا سکتی ہیں؟" اس مجمع میں سے ایک نحیف و نزار عورت اس پُراثر درخواست کا جواب دینے کے لئے اُٹھ کر اُس کی طرف بڑھی۔ اُس کا قد چھوٹا تھا۔ بازو آگے کو جھکے ہوئے اور کمر خمیدہ تھی۔ اُس نے شک و شبہ کے انداز میں ترچھی نگاہ سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے بالوں میں جہاں جہاں خضاب کا اثر نہیں پہنچا تھا سفیدی صاف نظر آ رہی تھی اور چہرہ کا غازہ جلد کی شکنوں کو چھپانے سے معذور معلوم ہوتا تھا۔ اچانک وہ ایک چیخ مار کر ٹھہر گئی اور دونوں بازو کھول کر اُس کی طرف بے خودی میں لپکی اور کہا "فیڈر تم مجھ کو نہیں پہچان سکتے"

فیڈر نے زیادہ تر اُس کی آواز سے اُس کو پہچانا۔ یہ ویرا الگزنڈرونا تھی، جو اُس کے قلب پر مستولی تھی۔ وہ ویرا جس کی یاد اُس کا وظیفہ تھی اور جسے وہ آج دس برس کے بعد ملا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ویرا پہلے کی بہ نسبت چھوٹی ہو گئی ہے یا مصائب و آلام نے اُس کی ہڈیوں پر سے گوشت کو جلا دیا ہے۔

ویرا نے نہایت متفکر لہجہ میں کہا "تم نے مجھے بہت سا تبدیل شدہ پایا ہے، اس امر کا اعتراف کرو کہ تم مجھے بالکل پہچان نہیں سکے"۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ ویرا نے حسرت و یاس کی نگاہوں سے اُس کو دیکھا۔ "تم حق بجانب ہو کیونکہ تم ایسی جگہ رہے ہو جو بالکل پُرامن ہے"۔

ویرا جو کبھی پیرس جیسے شہر کے لئے آرائش کا سامان تھی جس کا لباس گراں قیمت ہوتا تھا اس وقت اپنے درماندہ دوست کے سامنے فقیروں سے بدتر لباس میں کھڑی تھی، لیکن باوجود افلاس و نکبت اور مصائب کے جن کی یاد ابھی تک اُس کے دماغ میں تازہ تھی، ساحلِ بحیرۂ روم کے آفتاب نے اُس کی عروقِ مردہ میں زندگی کا خُون دوڑا دیا۔ مسرت اس کی آنکھوں میں چمک اٹھی۔ اس وقت وہ آنسوؤں کی صُورت میں نمودار ہونا چاہتی تھی۔ اپنی سیاہ پلکوں کو سکیڑتے ہوئے اور اپنے سر کو نقاہت سے پیچھے کو جھکاتے ہوئے ویرا نے فیڈر کی طرف دیکھا اور پوچھا "فیڈر میں تمہاری نگاہوں میں کیسی نظر آتی ہوں؟"

فیڈر کو صداقت کا اعتراف کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ ویرا! کیا یہ وہی ویرا ہے؟ لیکن اس تعجب و تذبذب میں محبت و رحم کا زبردست احساس اُس کے دل میں پیدا ہوا۔ ہاں اُس کے لئے ویرا ویسی ہی تھی جیسی وہ پہلے ہوا کرتی تھی۔

فیڈر اُس کے پاس بیٹھ گیا اور ویرا نے اپنی درد بھری کہانی شروع سے آخر تک اُسے سنا دی۔ وہ اس مہذب ملک اور اُس کی شائستہ مجالس میں واپس آنے پر مطمئن تھی۔ گو اُس کی درماندگی اُس کے ساتھ ساتھ تھی۔

ویرا نے کہا "جنگِ عظیم سے پیشتر ہم اپنی روزانہ ضروریات کے بہم پہنچ جانے کو معمولی بات سمجھتے تھے۔ ہماری

خواہشیں ہمیشہ بامراد ہوتی تھیں۔ اور ہمیں یقین ہوتا تھا کہ جس طرح ہر روز آفتاب جہانتاب دریچۂ مشرق سے نمودار ہوتا ہے اسی طرح ہماری خواہشات بھی ہمیشہ پوری ہوتی رہیں گی۔ لیکن لڑائی چھڑ گئی اور ہم پر آرام کا دروازہ بند ہو گیا۔ ہماری زندگی حیوانوں سے بھی بدتر ہو گئی۔ اپنی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے میں ہم قتل و خون کو جائز تصور کرنے لگے۔ میں تین دفعہ زنداں کی تاریک کوٹھریوں میں محبوس ہوئی جہاں فاقہ کشی نے مجھے نہایت مضمحل کر دیا۔ اور میری زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ جب تاریک قید خانہ کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلتا تو پہرہ دار کی بندوق کا سرد دہانہ میری گردن پر آ کر محسوس ہوتا آہ تم جانتے ہو کہ عورت کی کوئی خواہش نہیں ہوتی ......"

عین اُس وقت ایک آدمی اندر داخل ہوا اور ویرا کھڑی ہو گئی اُس کو اپنی ملازمت پر حاضر ہونے کے لئے دیر نہیں کرنی چاہئے تھی۔ وہ کسی پر اپنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ دیگر پناہ گیروں کی طرح اپنی ضروریاتِ زندگی خود بہم پہنچانا چاہتی تھی۔ گذشتہ زندگی کے واقعات اُس کی نظروں کے سامنے آ کر اُس کی آنکھوں کو پُرنم بنا گئے۔ وہ اُٹھ کر چلی گئی تو فیڈر نے اپنی طرزِ زندگی میں تغیر پیدا کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ دوستوں کی دعوتوں اور کتوں کی فروخت سے وہ آزادانہ زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن اب اُس کو اس مصنوعی آزادی کا احساس پیدا ہوا۔ اُس نے سوچا کہ جب ویرا جیسی وحشت پسند عورت مشقت کی اہل ہو سکتی ہے تو مجھے بھی اس دورِ ابتلا میں اپنے آپ کو مردِ میدان ثابت کرنا چاہئے۔ ویرا کے کمرہ یا جھونپڑے کی ہر چیز جو پہلے حقیر و مردہ نظر آتی تھی اب اُسے گراں قدر اور شگفتہ نظر آنے لگی۔

فیڈر گھر واپس آیا اور ایک سادہ لباس پہن کر ملازمت کی جستجو میں لگ گیا۔

آخر کار وہ کامیاب ہو گیا اور اُس شہر میں جو اُس کی تیس سال کی کامرانیوں کا منظر تھا وہ ایک ادنیٰ درجہ کے ملازم کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ کام دقت طلب نہ تھا صرف مزدوروں کی نگہداشت تھی۔ لیکن اسے رہ رہ کر ویرا کا خیال ستاتا تھا، جسے برتن صاف کرنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔

ان مزدوروں کی صحبت میں فیڈر نے روحانی تعلیم حاصل کی حقیقی مسرت اور اطمینانِ قلب افلاس ہی میں حاصل ہوتا ہے۔ فیڈر کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر ویرا اور وہ چاہیں تو ایک دوسرے کے رنج و راحت میں بخوبی حصہ لے سکتے ہیں۔ آئندہ اتوار کو دونوں نے اکٹھے سیر کو جانے کا فیصلہ کیا۔ فیڈر نے ویرا کو کیسینو کے متصل بعد دوپہر ملنے کو کہا۔

(۷)

ویرا اپنے کرم خوردہ لباس میں مقررہ مقام پر آئی۔ پرانی وضع کی ٹوپی اُس کے سر پر تھی اُس کا بوٹ ضرورت سے بڑا تھا۔ اور ایڑیاں گھسی ہوئی تھیں۔ اپنے سرخ اور سوجے ہوئے ہاتھوں کو اُس نے دستانوں میں چھپا رکھا تھا۔

فیڈر مزدور لڑکیوں اور عورتوں کے اجتماع میں ویرا کو بمشکل پہچان سکا۔ ویرا ان عورتوں میں ایک ادنیٰ درجہ کی رذیل عورت معلوم ہوتی تھی۔ جب ویرا نے فیڈر کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے پکار اٹھی "فیڈر تم آ گئے! تم کس قدر جوان معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہاری معیت میں شرم و ذلت محسوس کرتی ہوں!" اور اُس نے اپنے بوسیدہ اور میلے کپڑوں کو نہایت غم آلود نگاہوں سے دیکھا، لیکن فیڈر کو اُس کی موجودہ حالت سے کچھ سروکار نہ تھا۔ کیسینو کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے اُس نے کہا "ویرا کیا تمہیں یاد ہے؟"

اُن کی آنکھوں کے سامنے گذشتہ زندگی کا منظر پیش ہو گیا۔ کارنیوال کی رات کو کیسینو برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ عورتیں اور مرد شاہانہ لباس میں اِدھر اُدھر ٹہلتے نظر آتے تھے۔ کشادہ دروازوں اور کھڑکیوں سے باجوں اور آدمیوں کے گنگنانے کی دلپذیر آواز اُن کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ایک شاہانہ گاڑی رُکی اور اُس میں سے ایک ملائک فریب حسینہ جس کے زیورات رات کے ستاروں کی مانند چمکتے تھے شاہانہ انداز سے اتری اور مجمع میں تعریف کا غل مچ گیا۔

"فیڈر" یہ لفظ ویرا کے منہ سے دمِ واپسیں کی طرح نکلا اور اپنے آنسوؤں کو بند کرنے کے لئے اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

دونوں نے پہاڑی کی بلندی پر چڑھنا شروع کیا جہاں کئی ایک نفیس ہوٹل واقع تھے۔ ایک ہوٹل کے سامنے جو ایک عالی شان قلعہ سے مشابہت رکھتا تھا وہ ٹھہر گئے۔ جنگ سے پیشتر دونوں پرستارانِ محبت اِس ہوٹل میں رہا کرتے تھے۔ اب چائے کا وقت تھا۔ عشرت پسند امرا کی موٹریں دروازے کے سامنے قطار در قطار کھڑی تھیں ایک چپراسی نے اُن کی طرف شک اور غصہ کی نگاہوں سے دیکھا۔ فیڈر نے ویرا سے چلنے کے لئے کہا۔

موٹروں اور گاڑیوں کے گرد و غبار سے محفوظ رہنے کے لئے وہ اس سڑک کو چھوڑ کر ایک علیحدہ راستہ پر گامزن ہو گئے۔ اسی سڑک پر وہ ایک دفعہ پہلو بہ پہلو ایک مکلّف گاڑی پر جس کے گھوڑے نقید المثال تھے سوار ہو کر سیر کرنے آتے تھے اور لوگوں کے دلوں میں حسد و رشک کی آگ کو مشتعل کرتے ہوئے واپس چلے گئے تھے۔ ایک گاڑی والے نے جو بے پروائی اور غفلت سے سڑک سے بے رخ ہو کر گاڑی چلا رہا تھا بلند آواز سے کہا "بڑھیا ایک طرف ہو جا دیکھ کدھر جا رہی ہے؟"

ویرا کے دل میں غم و غصہ کا ایک طوفان امنڈ آیا اور اُس نے فیڈر سے کہا "ہم کو کسی ایسی جگہ چلے جانا چاہئے جہاں ہم اس سے پیشتر کبھی نہیں گئے" ایک گاؤں میں جہاں غربا کی تفریحِ طبع کے لئے ارزاں ترین ہوٹل تھا

وہ دونوں پہنچ گئے۔ چند آدمی کھلی ہوا میں درختوں کے خاک آلود پتوں کے نیچے بادہ نوشی میں مصروف تھے اور کچھ رقص وسرود میں منہمک تھے۔ فیڈر نے اس مسرت زا مجمع کی طرف حسرت و یاس کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے خیال کیا کہ اب وہ اور اُسکی رفیقہ رقص کی بے پایاں مسرت سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

"ویرا کیا تمہیں یاد ہے"؟ وہ اس سوال کو بار بار دہراتا تھا۔ گویا اپنی گذشتہ زندگی کو واپس لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بوڑھی رفیقہ نے اپنے سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے جواب دیا اگر گذشتہ زندگی دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتی تو اُس کی مسرت و انبساط کی یاد کو کیوں تازہ رکھا جائے۔

اس کے بعد ویرا نے کہا "میرے بدن سے گرمی کی حرارت زائل ہو چکی ہے۔ میں دھوپ کی گرمی میں بھی لرزاں رہتی ہوں۔ ہر صبح جب ہمارا افسر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو میں کانپ اُٹھتی ہوں اس خیال سے کہ شاید روس کا کوئی جفاکار میرا پتہ پاکر مجھے واپس بلانے آیا ہے۔ اطمینانِ قلب کے لئے پہلے کھڑکی کو کھول کر پُرامن گلی پر ایک نظر دوڑالیتی ہوں اور پھر دروازہ کھولتی ہوں۔ ایک جانگزا خوف نے میرے دل پر دائمی تصرف کر لیا ہے جو شاید میری روح سے کبھی جدا نہیں ہوگا"۔

ہوٹل کا ایک ملازم اُن کے سامنے معمولی درجہ کی شراب اور کچھ مٹھائی رکھ کر چلا گیا۔ ویرا خونخوار اور بھوکے درندے کی طرح اُس پر جھپٹی۔ یہ دیکھ کر فیڈر کے تعجب اور حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ ویرا نے اُس کے خیالات کو بھانپ کر تختی سے جواب دیا "تم مفلسی سے واقف ہو مگر فاقہ کشی سے بالکل بے بہرہ ہو۔ فاقہ کشی ذلت کے سمندر میں غرقاب کر دیتی ہے"۔ پھر بادہ ارغوانی کے شیشہ کو ایک ہاتھ میں تھام کر اور للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگی "ہمارے ملک میں اس گنجینۂ بے بہا کو مہیا کرنے کے لئے کسی انسان کا قتل بھی جائز ہے"۔

فیڈر کی نگاہوں میں خوف و دہشت کے آثار دیکھ کر ملامت آمیز لہجہ میں ویرا نے کہا "جب ایک آدمی گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگنے اور مہینوں صرف پانی پر گذارا کرنے پر مجبور کیا جائے تو وہ اپنی عادات و خصائل کو بر سرِ طاق رکھنے پر حق بجانب ہے۔ اقامت خانہ کے محافظ نے گذشتہ رات صرف اس جرم کی پاداش میں مجھے سرزنش کی کہ میں نے ایک شخص کا پس خوردہ اپنے سامنے رکھ لیا تھا"۔

فیڈر خوف سے کانپ اُٹھا اور اُس نے خیال کیا "کیا یہ فاقہ کش اور دیوانی عورت شاہی خاندان کی ویرا ہے"؟

اس کے بعد دونوں نے گھر کا راستہ لیا۔ راستہ میں فیڈر کی زبان پر مُہرِ سکوت لگی رہی لیکن سابق ملکہ پتی ویرا اپنی یاوہ گوئی میں منہمک رہی۔ "میرا لباس بوسیدہ ہو رہا ہے اور میں چاہتی تھی کہ اس وقت میرے پاس تین نئے جوڑے ہوتے لیکن مجھے

لباس کے لئے میں کسی کی منت کش نہیں ہونا چاہتی۔ اور میری اپنی قلیل آمدنی اس خرچ کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔" فیڈر نے اُس کی حالت کو نظرِ امعان سے دیکھا اور اپنی ایک ہفتہ کی تنخواہ اُس کی مٹھی میں رکھ دی۔ ویرا نے وہ رقم اُس اظہارِ امتنان کے ساتھ جو فقیروں کے ساتھ مخصوص ہے تھام لی اور اُس کی تعریفیں کرنے لگی۔ گویا یہ حقیر رقم اُس لاکھوں روپے کے جہیز سے بھی زیادہ گراں قدر تھی جو اُس کو شادی کے موقعہ پر ملا تھا۔

فیڈر نے ویرا کو اُس کی جائے قیام کے دروازے پر چھوڑ کر خاموشی سے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ اُس کا دل حسرت و یاس سے لبریز تھا۔ محبت مفلس آدمی کی عروقِ مردہ میں خونِ زندگی کیونکر پیدا کرسکتی ہے؟ وہ اپنے آپ کو ہر انسان سے زیادہ مفلس و قلاش محسوس کرنے لگا۔ اُسے اُس مفلسی سے پالا پڑا تھا جو لاعلاج ہے۔ جوانی جیسی دولت اس سے چھن چکی تھی۔ آہ، انسان گئی ہوئی دولت حاصل کرسکتا ہے لیکن شبابِ رفتہ کو حاصل کرنے سے عاجز ہے۔

اُس نے پُرحسرت لہجے میں کہا "میرے لئے غربت اور دولت دونوں یکساں ہیں۔ محبت دراصل امیروں کے لئے مخصوص ہے، اُن کے لئے جو شباب اور سیم و زر دونوں سے مالا مال ہیں۔"

علاؤالدین

ایک بچھڑی ہوئی بہن کی یاد میں

سیہ بادل کبھی جب آسماں پر گھر کے آتے ہیں
طیورِ صبح خواں جب گلستاں میں چہچہاتے ہیں
ہوائیں عطر میں ڈوبی ہوئی جس وقت چلتی ہیں
نہالانِ چمن جب جھومتے ہیں گیت گاتے ہیں
بھڑک اُٹھتے ہیں دل میں غم کے شعلے ان ہواؤں سے
ہمیں اس وقت کچھ گذرے ہوئے دن یاد آتے ہیں

کہاں ہیں آہ اب وہ دن کہ حاصل تیری صحبت تھی
یہ دنیا جب ہمارے واسطے ہمرنگِ جنت تھی
تری فرقت میں جو دل آج وقفِ یاس و حرماں ہے
کبھی اس دل میں آسودہ مسرت ہی مسرت تھی
ہمیں اب عمر بھر وہ دن نہ بھولیں گے نہ بھولیں گے
میسر جن دنوں ہم کو تری پاکیزہ صحبت تھی

کبھی تھا شاق ہم کو ایک دن بھی تیری فرقت میں
ہمیشہ کی جدائی ہو گئی اب اپنی قسمت میں
کبھی تجھ سی بہن اب مل سکے گی پھر نہ دنیا میں
کسی سے بھی نہ تیری ہمسری ہو گی محبت میں
ثنا خواں ہو گیا اس گھر کا ہر چھوٹا بڑا تیرا
خدا جانے یہ کیسا سحر تھا تیری طبیعت میں

شگفتہ پھر کبھی اے کاش اپنا غنچۂ دل ہو
جو کھوئی جا چکی ہے وہ مسرت ہم کو حاصل ہو
وہ محفل جو کہ برہم ہو چکی ہے ایک مدت سے
وہ پھر آراستہ ہو اور پھر تو شمعِ محفل ہو
کبھی اے کاش پھر اک بار مل کر سیر کو جائیں
گھٹائیں چھا رہی ہوں، ہم ہوں، اور دریا کا ساحل ہو

زمانہ کب تک آخر رکھ سکے گا یوں جدا ہم کو
بنا رکھے گا کب تک تختۂ مشقِ جفا ہم کو
رہا ہو جائیں گی اک دن یہ روحیں قیدِ ہستی سے
نہیں رہنا ہے اس بے مہر دنیا میں سدا ہم کو
ہمیشہ کے لئے اپنی وہاں مل جائیں گی روحیں
جہاں ہرگز نہ کوئی کر سکے گا پھر جدا ہم کو

تمنا ہے کہ ہم دیکھیں ہمیشہ شادماں تجھ کو
بنائے حق تعالیٰ دو جہاں میں کامراں تجھ کو
نہیں ممکن کہ تیری یاد دل سے محو ہو جائے
فلک نے کر دیا گو اپنی آنکھوں سے نہاں تجھ کو

"مرا عہدیست با جاناں کہ تا جاں در بدن دارم
ہوا دارِ ی کوئش را چو جانِ خویشتن دارم"

ع۔ ب

سنہ ۱۱۷۲ء کی ہندی

سمت ۱۲۲۹ یا سنہ ۱۱۷۲ء کا ایک پروانہ نیچے لکھا جاتا ہے۔ یہ ہندی زبان کا سب سے قدیم نسخہ ہے جو دستیاب ہوا ہے اور دُبے جانکی داس کا لکھا ہُوا ہے۔ جو چتوڑ کے راول سمرسی کے دربار میں پرتھم لیکھک (میر منشی) تھا۔ اس سے پہلے گو ہندی زبان کے کئی شاعر اور نثر نویس ہوئے ہوں۔ لیکن اُن کی ادبیات کا ایک حرف بھی اب کہیں نہیں ملتا۔ اس پروانے کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۱۷۲ء میں جب سوائے پنجاب کے تمام ہندوستان میں سودیشی تہذیب اور سودیشی راج کا پودا بے خطر لہلہاتا تھا اُس وقت بھی کتنے فارسی الفاظ سرکاری زبان میں مروج ہو گئے تھے۔ عبارت میں فارسی الفاظ موٹے لکھے گئے ہیں۔

مہارانا چتوڑ کے دربار کا ایک پروانہ

سوستی شری چترکوٹ مہاراج ادھراج ہتوراج شری شری راول جی سمرسی جی بچناتو دا اما آچارج ٹھاکر رسی کیش کیسر تھانے دلی سُوڈا سجے لایا۔ انی راج میں اوشد تھاری لیوبگا۔ اوشد اوپرے مالکی (نگرانی) تھاکی ہے۔ اور جنانا (زنانہ) میں تھارا نبسر اٹال اوُدو جو جاویگا نہیں اور تھاری بیٹھک دلی میں ہی جی پرمانے پردھان برو بر (برابر) کارن ہیوبگا۔ اور تھارا نبس کہ سپوت کپوت ہیگا جی نے گام گونی انی راج میں شتیا پایا جائے گا۔ اور تھارا چاکر گھوڑا کو نامو کو ٹھار سوں ملا جائے گا۔ اور تھون جما کھاتری (جمع خاطر) ریجو موئی میں راج۔ تھان باد جوانی پروانا دُرا ای کوئی اُلگن کرے گا۔ . . . . . . پنچولی جانکی داس سمت ۱۱۳۹ کانی بدی ۳

اس پروانے کا عام فہم اردو میں یہ ترجمہ ہوگا۔

سوستی شری چتوڑ مہاراج ادھراج ہتوراج شری راول جی شری سمرسی جی کے حکم سے آچاریہ ٹھاکر رشی کیش کے واسطے۔ ہم تمہیں دلی سے دلنج میں لائے۔ اس ریاست میں تمہارے علم طب سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ شفاخانہ تمہاری نگرانی میں رہے گا اور تم کو زنانہ (حرم) میں جانے کی بھی اجازت ہے۔ جو سوائے تمہارے کسی کو نہیں۔ اور نشست (دوسرے دربار میں) جو وزیر اعظم کے برابر (ساتھ) تھی ویسی ہی ہمارے دربار میں بھی رہے گی۔ اور تمہارے خاندان کا سپوت یا کپوت جو ہوگا وہ اس راج سے گاؤں اور گھوڑا پائے گا اور کھان پان (سامانِ خورد و نوش) پائے گا۔ تمہارے گھوڑے اور نوکر کو رسد کوٹھار (سرکاری کوٹھار) سے ملا کرے گی۔ اور تم خاطر جمع رکھو۔ جو ہمارے بعد اس پروانے کا النگن (توڑ) کرے گا . . . . . دستخط جانکی داس سمت ۱۱۳۹ کاتک بدی ۳

دینا ناتھ راجانک

فرید

کیا تم چٹانوں کے سمندر کا تصور کر سکتے ہو؟ ایسا مقام کہ جدھر تم نگاہ ڈالو چٹان ہی چٹان نظر آئے ــــ سفید، نیلی، برہنہ چٹان آسمان سے باتیں کرتی ہوئی ــــ اسی کی آسمانی نیل کو چھوتی ہوئی چوٹی کو ویلی کہتے ہیں۔ چٹانوں کے درمیان ایک جھیل ہے، بے حد لمبی، کیچڑ اور زرخیز ریت سے بھری ہوئی ــــ اسے بلاتو کہتے ہیں۔

اسی جگہ میں فرید بے سے واقف ہوا۔ میں ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر جنگلی بطخوں کے اترنے کا انتظار کر رہا تھا اور کوئی دو سو قدم کے فاصلے سے اُس کی بندوق کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ جب شام کا اندھیرا چھا گیا تو نئے چاند کی روشنی میں ایک چٹان کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ وہ مجھے ایک جن کی طرح نظر آتا تھا اور اس کی بندوق اُس کے کندھے پر توپ کی طرح معلوم ہوتی تھی۔

حقیقت میں اُس کی بندوق میری بندوق سے کوئی ڈیڑھ گز لمبی تھی اور اُس کی نالی ایک موٹے تلنے بچے کی کلائی سے زیادہ چوڑی تھی۔ میں اپنی جگہ مسکرایا ــــ میں جس کے پاس دو نالیوں والی ہلکی لنکاسٹر تھی۔ مگر جب میں نے فرید کو ایک بطخوں سے بھرا ہوا تھیلا اُٹھائے ہوئے دیکھا تو میں نے اُسے سلام کیا، اور ہم گہرے دوست بن گئے۔ شکار کے دوران میں دل کا پیمانہ چھلکنے کے قریب ہوتا ہے اس لئے دوستیاں بہت جلد پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔

خزاں کے اُس موسم میں ہم تقریباً ہر روز ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بوسنیا والوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر رکھا تھا۔

فرید نے مجھ سے کہا "تم بڑے شجاع ہو جو یہاں تک آنے کی جرأت کرتے ہو!"

میں قہقہہ مار کر ہنسا۔

"کیا یہ شجاعت ہے کہ میں اپنی جان کی پروا نہیں کرتا؟ اور پروا کیوں کروں؟ آج میں موجود ہوں کل میرا نام و نشان بھی نہ ہوگا۔"

"سچ"، فرید نے کہا، مگر میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر جانا کہ وہ مجھے یوں ہی دم دے رہا ہے ورنہ در اصل اس کا یہ خیال نہیں ہے۔

فوجی افسر اور فرید کے دوست ہمارے ربط و اتحاد کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے کیونکہ فرید ایسا شخص تھا جو اپنے سوا کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ صدی بھر کی آزادی اور امارت نے اُس کے دماغ میں پندار شرافت بھر دیا تھا

مصروفیت کی وجہ سے میں کچھ روز کے لئے فریدے سے نہ مل سکا۔ باغیوں نے پھر ہمارے ایک افسر اور چار سپاہیوں کو قتل کردیا تھا اور تقریباً قلعہ کی تمام فوج قاتلوں کو گرفتار کرنے کے لئے بھیج دی گئی تھی۔

اکتوبر کا مہینہ تھا لیکن جولائی کا سا گرم دن۔ سہ پہر کے وقت میں اپنے آدمیوں سمیت ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا۔ گاؤں کے پہلے ہی مکان کے قریب مجھے بہت سے سپاہی نظر پڑے۔ تقریباً ساری کی ساری پلٹن وہاں موجود تھی۔ کرنل نے مجھے دیکھ کر مسرورانہ لہجے میں کہا "ایک تو ہمیں مل گیا!"

میں بہت خوش ہوا اور مجھے دن بھر کی کلفت بھول گئی "خوب ہوا۔ اب ہم اچھی طرح اپنے ساتھیوں کا انتقام لیں گے!"

کرنل نے کہا "اُدھر دیکھو۔ ہم نے اُسے گولی سے اڑا دینے کا فیصلہ کیا ہے!"

میں نے دیکھا تو فریدے دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا اور آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا "کیا یہ ممکن ہے؟ اور تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟"

کرنل نے مسکرا کر جواب دیا "ثبوت وہ ہیں!" ایک چٹان پر دو آدمی سر جھکائے بیٹھے تھے اور کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ یہ دونوں فریدے کی رعایا تھے، اُسی کی قوم میں سے تھے اور اُسی کی زبان بولتے تھے۔ یہی فوج کو اُس کے گاؤں میں لائے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے فریدے کو اپنی آنکھوں سے ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر فوجی افسر کو بندوق کا نشانہ بناتے دیکھا ہے۔"

میں حیران ہو گیا۔ مجھے اُس مجنونانہ پرخاش اور حسد کا اچھی طرح علم تھا جس کی آگ پوری ایک صدی سے ان لوگوں کے دلوں میں اپنے حاکم کے خلاف سلگ رہی تھی، اس لئے مجھے ان "گواہوں" کی صداقت پر شبہ سا ہوا۔ میں نے اُن سے سوالات کرنے شروع کئے اس خیال سے کہ شاید افسروں سے اُن کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ انہوں نے من و عن واقعہ کو دہرا دیا۔ اُن کی بات ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ میرے پیچھے سے کسی نے گونج کر کہا:

"تم جھوٹے ہو!"

میں نے مڑ کر دیکھا تو فریدے وہیں کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں اور گردن تنی ہوئی تھی۔

شاہد ہنس ہنس کر اُس کا منہ چڑا رہے تھے۔ غداری کا انعام اُن کی جیب میں تھا۔

پھر میں فریدے کے پاس گیا۔

"تم اپنی برات کیوں نہیں پیش کرتے، میاں؟"

"مجھ سے کوئی پوچھے بھی۔ وہ تو وہ ان حرام خوروں کی بات سنتے ہیں"۔

اُس کے شاندار قدوقامت اُس کی پُرتمکنت خاموشی کو دیکھ کر وہ مجھے ایک بطلِ عظیم، ایک شہید معلوم ہوتا تھا۔ میرے دل میں خون جم گیا۔ اب میں کرنل کی طرف متوجہ ہوا جس نے اس دوران میں گولی مارنے والوں کے انتخاب اور ترتیب کا حکم دے دیا تھا۔

میں نے کہا "ہمارا افسر کس دن اور کس وقت مارا گیا تھا؟"

اُس نے جواب دیا۔ "پرسوں، بدھ کے دن، شام سے ذرا پہلے"۔

"پرسوں، بدھ کے روز دوپہر کے بعد سے رات تک تو فریدے بلاڈو کے کنارے میرے ساتھ مصروفِ شکار تھا"

کرنل نے نہایت مایوس ہو کر کہا "کیا یہ ممکن ہے؟"

"میرے افسر کا قول اُس کے لئے ضمانت ہے!"

"اور وہ گواہ؟"

"کتوں کی طرح بکتے ہیں"۔

"ان کو شکنجے میں کس دو!"

میں نے فریدے کے ہاتھ کھول دیئے۔ اُس کا بدن اس طرح کانپ رہا تھا جیسے ایک پتہ تیز و تند ہوا میں کانپتا ہے اور اُس کی زبان خاموش تھی۔

کچھ دیر کے بعد جب ہم دونوں قہوہ پی رہے تھے فریدے نے دلی جوش کے ساتھ مجھ سے کہا "میرے آقا میرے بھائی، اس احسان کے بدلے جو کچھ بھی تم چاہو میں اُس کے لئے حاضر ہوں!"

اُس دن کے بعد ہم نہایت گہرے دوست بن گئے۔ فریدے کے ساتھ مجھے اُسی لمحہ سے محبت پیدا ہو گئی تھی جب میں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا لیکن اب اُس کی شجاعانہ تصویر میری آنکھوں میں کھب گئی تھی ——— وہ عام لیکن اس کے باوجود نجیبانہ تصویر، اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا "کیا دریائے نرتیو کے ساحلوں پر اس پتھر کے بنے ہوئے پل کے سوا رومی عظمت و شرافت کا کوئی اور نشان باقی نہیں رہ گیا؟"

فریدے جو عمر میں مجھ سے دس برس چھوٹا ہو گا، کس طرح میری خدمت کرتا اور میرا خیال رکھتا ہے! شکار میں میری بندوق اور تمام دوسرا سامان وہ خود اُٹھاتا ہے اور جب کبھی میں اُس کے گھر جاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ میرے بیٹھنے کے لئے

اتنی معزز اور آرام دہ جگہ بنانے کے قابل ہے جتنی اُس کا دل چاہتا ہے۔ وہ اکثر اپنے گھر کے تمام گدیلے اور سرہانے اکٹھے کرلاتا اور قہوہ، لیمونیڈ اور سگاروں سے میری اتنی تواضع کرتا کہ عموماً میں بیمار ہو جاتا۔ اب وہ میرے لئے ایک بطلِ عظیم نہ تھا بلکہ ایک ننھا بچہ، ایک شفیق محبوب۔

وہ اکثر آرزومندی کے لہجہ میں کہا کرتا "کاش کہ میں تمہارے کسی کام آسکوں ...... کاش کہ مجھے معلوم ہو سکے کہ تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے!"

ایک روز ایک ناشائستہ اور نازیبا خیال میرے سر میں سمایا۔ معلوم نہیں یہ حد سے بڑھے ہوئے مذاق کی ایک اُمنگ تھی یا غیر معمولی خوشی نے میری عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا کہ جب فرید ایک بند دروازے کو ذرا سا کھول کر چائے کا سامان لے رہا تھا تو دروازے کی اس مختصر سی درز میں سے میری آنکھوں نے ایک خواب سا دیکھا۔ مشرقی حرم اور اُن کی پری وش کنیزیں میری نظروں کے سامنے پھرنے لگیں۔ کسی کی سحر طراز آنکھ کی ایک جھلک نے مجھ پر بجلی سی گرا دی تھی۔ پل بھر میں ایک خیال نے میرے دماغ کو اپنی لپیٹ میں جکڑ لیا۔ اور میں کہہ اٹھا:۔

"لو، فرید، میری ایک خواہش ہے"

"ہاں، بھائی، تم کہو، یہ پوری ہو کر رہے گی!"

ایک لمحہ کے لئے میں نے تامل کیا اور کچھ محجوب سا ہو گیا، لیکن میرا وحشی شوق راستبازی سے زیادہ طاقتور تھا۔ میں نے کہا:۔

"تمہاری بیوی کو مجھ سے چھپنا نہیں چاہیئے، جب کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ میں اُسے ایک مرتبہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

فرید جو ایک ابریق میں سے میرے لئے قہوہ انڈیل رہا تھا ایک لمحہ کے لئے ٹھہر گیا۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت متانت اور سکون سے دیکھا اور پھر غیر معمولی نرم آواز میں اُس نے کہا:۔

"کیا سچ مچ تمہاری یہی خواہش ہے؟"

ایسے لہجہ سے جس میں شوخی اور شوق بھرا ہوا تھا میں نے کہا "ہاں، یہی!"

وہ خاموش ہو گیا۔ اپنا ہاتھ سر کی طرف اٹھا کر اُس نے ٹوپی کو گردن کی طرف سرکا دیا اور اپنے چہرے اور سر کو ہاتھ سے ملنے لگا۔ پھر نظریں نیچی کرکے جھک کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر یکایک وہ پلٹا۔ میں جلدی سے اُٹھ کر اُس کے سامنے آگیا۔ دو بڑے بڑے آنسو اُس کی آنکھوں سے نکل رہے تھے جنہیں اُس نے فوراً پونچھ ڈالا۔

میں نے اُن دو آنسوؤں میں وہ تمام درد و کرب دیکھ لیا جس نے اُس کے قوی دل کو پگھلا دیا تھا مجھے بڑی ندامت ہوئی اور میں نے کہا:۔

"خدا کے لئے، فرید، مجھے معاف کر دو میں نہ جانتا تھا کہ میری فرمائش اتنی عظیم اور مشکل ہوگی۔ یقین جانو، مجھے اِس کا علم نہ تھا! لو، میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ مجھے اُس کے دیکھنے سے انکار ہے قطعی انکار! میری بات کا اعتبار کرو! میں نے تو اسے ایک غیر اہم بات سمجھ کر کہہ دیا تھا، میں صرف مذاق کر رہا تھا۔"

میں اسی طرح اُس کی منتیں کر رہا تھا اور فرید رو رہا تھا۔ اب اُس کے آنسو تھم گئے اور اُس نے کہا۔

"اور تمہارے اس مذاق کے بدلے شاید زاہدہ جان سے چلی گئی ہوتی!"

"وہ کیونکر؟ خدا ناکردہ! تم نے کیا ارادہ کیا تھا؟"

"آج تم نے دوسری دفعہ میری جان بچائی ...... اس کے بعد کہ تمہاری آنکھیں اُسے دیکھ لیتیں۔ اِس پستول کی آنکھ کے سوا کوئی زندہ آنکھ اُس پر نہ پڑ سکتی۔"

اُسی وقت اُس نے چاندی میں منڈھا ہوا ایک پستول نکالا۔ پھر میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس سے پہلے کہ میں جانوں کہ وہ کیا چاہتا ہے اُس نے اُسے چوما اور پھر پیشانی سے لگا لیا۔

جب حقیقت میں مَیں نے اُس کی جان بچائی تھی تو تشکر و امتنان کا ایک لفظ بھی اُس کی زبان سے نہ نکلا تھا اور اب وہ میرا ہاتھ چوم رہا تھا۔

اُس وقت پہلی دفعہ میں شکسپیر کے ان الفاظ کو سمجھا "محبت خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو بغیر رشک کے ہوا کو بھی محبوب سے ہم آغوش ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

(ترکی)

منصور احمد

گر میری بات بات سے تقصیر ہے عیاں | تیرے اِک اِک اشارہ سے تعذیر ہے عیاں
تو قیر ہے نہاں مری تسلیم میں اگر | تیری ہر اک نگاہ سے تحقیر ہے عیاں
ظلمت کدہ میں میرے دلِ داغدار کے | اُس رشکِ ماہتاب کی تنویر ہے عیاں

وہ مصحفِ جمال مرے پاس ہی تو ہے
یعنی پسِ خیال وہ تصویر ہے عیاں

ناصر عسکری

محفلِ ادب

تمدن اور مذہب

ہر فرد کی طبیعت میں مختلف رجحانات ہوتے ہیں اور ہر رجحان کا موضوع زندگی کا کوئی ایک شعبہ ہوتا ہے مثلاً علم کا موضوع تصورات و معانی کی دنیا ہے۔ ذوقِ جمال کا موضوع حسن و خوبی کا عالم ہے وقس علیٰ ہذا۔ ان میں سے کسی میں اتنی وسعت نہیں کہ پوری زندگی کا احصار کر سکے لیکن یہ ممکن نہیں کہ انسان کی ذہنی زندگی کی ساخت چھوٹے چھوٹے منتشر ٹکڑوں میں کی گئی ہو جن میں باہم کوئی ربط نہ ہو اگر ایسا ہوتا تو نہ وہ خود اپنی سیرت سمجھ سکتا نہ دوسرے اُسے سمجھ سکتے۔ علم الانسان اور نفسیات کا پھر کسی طرح امکان نہ تھا۔ نفسِ انسانی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ احد اور غیر منقسم ہے جس میں تقسیم محض اعتباری ہے۔ جب نفس کے مختلف "عناصر" یا "حصوں" کا ذکر کیا جاتا ہے تو مراد اُس کے مختلف مظاہر یا مختلف پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ اس لئے ضرور انسان کے دل میں کوئی رجحان ایسا ہوگا جس کا موضوع زندگی کا کوئی ایک شعبہ نہیں بلکہ کل زندگی ہو جس کا تقاضا ہو کہ انسان اپنے پورے تمدنی ماحول اور اپنی مجموعی سیرت پر ایک ہمہ گیر نظر ڈالے، اُن کے عناصر کے باہمی علاقوں کو سمجھے اور اپنے اعمال کی ایسی تشکیل کرے کہ وہ بہ ہیئتِ مجموعی اس کی شخصیت کو اور اُس تمدن کو جس کا وہ رکن ہے اوجِ کمال پر پہنچانے میں مدد دیں۔ یہ رجحان جسے جذبۂ اخلاق کہتے ہیں مذہب ہی کا ایک پرتو ہے۔

لیکن اصل مذہبی رجحان اور اُس کا موضوع اس سے کہیں زیادہ بلند اور وسیع ہے۔ تمدن جو اخلاقی رجحان کا موضوع ہے ایک محدود چیز ہے۔ ہر تمدن کسی خاص نسل، کسی خاص زمانے اور کسی خاص ملک کا پابند ہوتا ہے۔ دنیا میں ایک ہی نہیں متعدد تمدن ہوتے ہیں جن میں آپس میں اختلاف اور تصادم واقع ہوا کرتے ہیں اور اکثر ایک فردِ واحد پر کئی تمدنوں کے اثرات پڑتے ہیں اور وہ اس کشمکش میں رہتا ہے کہ اُن میں سے کسے قبول کرے اور کسے رد کرے۔ اس لئے جس طرح انفرادی زندگی کی قدر کا اندازہ کرنے کے لئے تمدن معیار ہے، اسی طرح خود تمدن کے پرکھنے کے لئے ایک بلند ترین معیار کی ضرورت ہے جو آخری اور قطعی ہو، اسی کا نام مذہب ہے، اور جو رجحان انسان کے نفس میں اُس کی طرف پیدا ہوتا ہے اُسے مذہبیت کہتے ہیں۔ مذہبیت کا موضوع محض یہ زندگی یا یہ دنیا نہیں ہے بلکہ کل کائنات ازل سے لے کر ابد تک۔ اس رجحان کے تحت انسان کے ذہن میں ایسے ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینے سے اُس کے سارے قوائے ذہنی عاجز اور مجبور ہیں وہ کائنات کی حقیقت، اُس کا آغاز، اُس کا انجام، اُس کی تخلیق کا منشا، اُس کے ارتقا کا قانون معلوم کرنا چاہتا ہے تاکہ اپنے اعمال کو اُس ناموسِ اعظم، اُس مقصدِ اکبر کا پابند بنائے جس پر نظامِ کائنات قائم ہے۔ اگر اسے وہ سرچشمۂ ہدایت ہاتھ آجائے جہاں

خود خالقِ کائنات کی طرف سے ان سوالوں کا جواب دیا جاتا ہے تو اُس کے قلب میں ایسی جمعیت، تسکین اور گہرائی پیدا ہوتی ہے اور اُس کے اعمال میں ایسا خلوص اعتماد اور استحکام رونما ہوتا ہے کہ اُس کی مجموعی سیرت تکمیل کے مدارج میں بہت بلند درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔

آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ فرد کے نفس کو تمدن کی بدولت وسعت اور بلندی حاصل ہوتی ہے۔ اب اندازہ کیجئے اس وسعت اور حد بندی کا جو مذہب انسانی سیرت کو عطا کرتا ہے۔ جب کوئی شخص اس پر غور کرتا ہے کہ اس کی ذات ایک عظیم الشان اور جلیل القدر نظام کا جزو ہے اور ایک نامحدود، لازوال، کامل و اکمل خالق کی مخلوق ہے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے :-

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اسی طرح جب وہ سوچتا ہے کہ اُس کا ہر فعل خواہ وہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو ساری کائنات کے سلسلۂ ارتقا پر اثر ڈالتا ہے تو وہ اپنے اعمال کی مکمل حد بندی اس طرح کرتا ہے کہ انہیں فطرتِ الٰہیہ کا پابند بنائے، جو مکان و لامکان اور زمان و لازمان میں کارفرما ہے۔

یہ ہے مذہبیت کا عین جو دنیا میں ہر مذہب کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ مگر دنیا کی ذہنی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جتنا واضح اور روشن تصور پیغمبرِ اسلام کو ہُوا ہے کسی دین و ملت کو حاصل نہیں ہُوا، اسی لئے جتنا زور اسلام میں مذہب کے مرکزِ تمدن بلکہ روحِ تمدن ہونے پر دیا گیا ہے اُس کی مثال کسی دین و ملت میں نہیں ملتی۔

"جامعہ"

میرا چھوٹا ہنس سوتا ہے

ایک ماں نے جو حال ہی میں بیوہ ہو چکی تھی اور جس کی مصیبت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہا۔

"تم کیوں کہتے ہو کہ میرا چھوٹا ہنس سوتا ہے، کون بتا سکتا ہے کہ ماں کا دل کس قدر محبت بھرا ہوتا ہے! اُس کو صرف بچوں کی مائیں ہی جان سکتی ہیں"۔

ماں کی گود میں پڑے ہوئے مردہ بچے نے اُس کے دل کو ہلا دیا تھا، رنج و غم کی انتہا ہو چکی تھی اور اُس کے حواس جا رہے تھے۔ اپنی زندگی کے پھول کو گود میں اس طرح مرجھایا ہُوا دیکھ کر اُس کا قلب بالکل بے حس ہو گیا تھا، وہ سمجھنے لگی تھی کہ میرا چھوٹا راج ہنس سو رہا ہے۔

جب کچھ لوگ لاش کو اٹھانے کے لئے اُس کے گرد جمع ہوئے تو اُس کو اپنے خاوند کی موت کی نحس گھڑی یاد آ گئی، دل میں وہ تصور اور آنکھوں کے سامنے یہ تصور! اپنی زبون حالت کا احساس کر کے اُس نے سسکیاں لیتے ہوئے لوگوں سے کہا، میرا چھوٹا راج ہنس سوتا ہے" خدا کے لئے یہاں غل نہ مچاؤ کیونکہ میرا بچہ سو رہا ہے۔ وہ بڑا الھڑ ہے، سوتا بہت کم ہے، کہیں وہ جاگ

اُٹھا تو پھر کھیلنے لگے گا - دیکھنا آہٹ نہ ہونے پائے، ہلو جلو مت، اگر میرا ہنس جاگ اُٹھا تو پھر سوئے گا نہیں - میرا بچہ ذرا سا ددد
پی کر ابھی سویا ہے، میں تمہاری منتیں کرتی ہوں، اُسے جگاؤ مت، میں تمہارے بُرے تیور پہچانتی ہوں - اس سے پہلے
تم میرے بیش بہا ہیرے کو لے گئے تھے اور اب اس ہیرے کی کنی کو لینے پر تُلے ہوئے ہو، میں کتنی ہی غریب، کیسی ہی مصیبت
زدہ سہی، تمہارے اِن منحوس الفاظ کو برداشت نہیں کر سکتی - تم ایک مرتبہ میری روح کو لے گئے تھے، جس کو اُس وقت
سے اب تک پھر نہیں دیکھ پائی، کیا اب میری اس جان کو لے جاتے ہوئے تمہارے دلوں میں کچھ اثر نہیں ہوتا؟ میں تمہاری
بُری نیت کو جانتی ہوں، دیکھو میرا راج ہنس کیسا سو رہا ہے، اُس کے گھونگریالے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے ہیں، دیکھو وہ کیسے
شوق سے مجھے دیکھ رہا ہے - اُس کے کانوں کی بالیاں ہل رہی ہیں، کیسا مسکرا رہا ہے، میں اپنی روح کے پردے میں اُسے چھپا
لوں گی - دیکھو کیا میرا دلارا نیم باز انکھڑیوں سے دیکھ نہیں رہا ہے؟ کیا وہ نیم بند لبوں سے کچھ باتیں نہیں کر رہا ہے؟ میں
جانتی ہوں، اس مسکرانے کا کیا مطلب ہے - کیا اِس سے اُس کا اطمینان ظاہر نہیں ہوتا؟ میرا راج ہنس محبت کے اُس پانی
میں تیرتا ہے جو میرے دل کی جھیل میں لہریں مار رہا ہے، اُسے تیرنے کی تھکن سے بھوک لگ آئی ہے -
میں اپنے آنسوؤں کے موتی اُسے کھلاتی ہوں، اپنے شوہر کی موت کے بعد سے میں یہ موتیوں کی مالا تیار کر
رہی ہوں تاکہ اس پر چڑھاؤں - اس مالا میں یہ بچہ وہ جواہر ہے جس کو میں نے اپنے دل میں جڑا ہے - تم کیسے بُرے آدمی
ہو، اس کو بھی چھین لے جانا چاہتے ہو - کیا کوئی خدا نہیں جو تم کو سمجھے - اُف ایسے بُرے بول منہ سے نہ نکالو، مجھے یقین
ہے کہ خدا مجھ پر یہ بلا نازل کرنی نہیں چاہتا، بلکہ یہ تمہاری بُری نیت ہے - دیکھو جب میں اُسے پیار کرتی ہوں تو کیسا ہنستا
ہے! تم اپنے منہ پرے کو کیوں پھیرے لیتے ہو! کیا تم کو میری خوشی گوارا نہیں ہوتی - میں جانتی ہوں تم میرے نازک پھول
کو پامال کرنا چاہتے ہو، کیا میں ایسی بیوقوف ہوں جو اتنا بھی نہ سمجھ سکوں، میں کبھی اسے اپنے سے جدا نہ ہونے دوں گی
یہ کہہ کر اُس نے بچے کو چھاتی سے چمٹا لیا اور پھر ایک بار اُسے پیار کیا، اس کے بعد وہ سو گئی اور پھر کبھی نہ جاگی - بلبلوں
نے اپنے پھولوں سے آنسو بہائے، پرند اور درند روئے، حتیٰ کہ پتھر بھی اِس غم سے پانی ہو گئے - اس مقام پر اب تک
اِن الفاظ کی گونج باقی ہے "میرا چھوٹا ہنس سوتا ہے"

"اردو"

شخصیت کا اثر

نائس کا قلعہ

دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے ٹن ٹن ۵ بجائے۔

کمانڈر انچیف نے کہا " اب تم کو روانہ ہو جانا چاہیئے ۔ دو ہزار سوار اپنے ساتھ لیتے جاؤ "
مخاطب افسر نے متبسم ہو کر جواب دیا " بہت خوب ۔ نپولین کے نو آدمی دو ہزار سے بچ کر نہیں نکل سکتے "
پھر وہ باہر نکل گیا اور بآوازِ بلند پکارا :-
" جوزف . . . . بگل بجاؤ "
آفتاب نکلتے نکلتے یہ فوج قلعہ سے باہر ہو چکی تھی ۔
قلعہ دار کو بذریعۂ تار معلوم ہوا تھا کہ نپولین البا سے بھاگ چکا ہے ۔ اور فرانس کی جانب آرہا ہے ۔ پس اُس نے جلاوطن شہنشاہ کی گرفتاری کے لیئے یہ فوج بھیجی تھی ۔

(۲)

دو ہزار سواروں کا دستہ سبک خرامی کے ساتھ چلا جا رہا تھا سرِ عسکر کے ہاتھ میں دُوربین تھی ۔
سرِ عسکر نے کہا " دیکھنا سامنے سے چند آدمی آرہے ہیں ۔ ان میں سے کوئی نپولین تو نہیں ؟ "
اُس کے پاس کے ایک اور افسر نے دُوربین کے شیشے سے گھورتے ہوئے جواب دیا " جہاں تک میرا خیال ہے ، کوئی نہیں "
لیکن اُس کا خیال غلط تھا ۔ کیونکہ جب وہ لوگ نزدیک پہنچے تو اُن کا سردار نپولین ہی تھا ۔
افسر نے کہا " نپولین ہی ہے "
سرِ عسکر نے چلّا کر کہا " میرے بہادرو تیار ہو جاؤ ۔ حریف بچ کر نہ جانے پائے "
لیکن نپولین سیدھا اُن کی جانب بڑھتا چلا آتا تھا ۔
سرِ عسکر نے کرخت لہجہ میں کہا " میرے بہادرو ! بندوقیں سنبھالو حتی الامکان زندہ گرفتار کرنا "
یہ دو ہزار سواروں کا دستہ وہی تھا جو کسی زمانہ میں نپولین کی کمانڈ میں رہ چکا تھا ۔
اب نپولین بہت نزدیک پہنچ چکا تھا ۔ نپولین نے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے چلّا کر کہا " میرے بچو ! تم میں کوئی ہے جو اپنے باپ کے سینے میں گولی مارے " یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا برہنہ سینہ سامنے کر دیا ۔

(۳)

دو ہزار پُرجوش آوازیں بلند ہوئیں " کوئی نہیں ! کوئی نہیں " اور دو ہزار بندوقوں کے زمین پر گرنے کی صدا سنائی دی ۔
" نپولین فرانس کے لیئے ہے اور فرانس نپولین کے لیئے " پُرجوش فرانسیسی سپاہیوں نے نعرہ مارا ۔

" مخزن "

نئی کتابیں

سیرۃ المحمود۔ مولفہ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب مرحوم۔ یہ کتاب خواجہ جہاں عماد الدین محمود گاواں وزیر سلاطین بہمنیہ کی سوانح عمری ہے جس میں خواجہ جہاں کے حالات کی سچی تصویر دکھا کر مسلمان نوجوانوں کے لئے اُن کی علمی و اخلاقی بزرگی کا قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ محمود گاواں جیسے عظیم الشان انسان دنیا میں بہت کم گزرے ہیں۔ حجم ۱۱۸ صفحات اور قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے۔ ملنے کا پتہ۔ حیدر آباد بک ڈپو، چادر گھاٹ حیدر آباد (دکن)

زراعت اور امدادِ باہمی۔ مصنفہ مسٹر ہنری ڈبلو وولف حجم ۸۴ صفحات قیمت ایک روپیہ چھ آنے۔ مہذب دنیا کی تمام تحریکوں میں اس وقت امدادِ باہمی کے شاندار فوائد نمایاں ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں ہزاروں کم مایہ لوگ اسی کی بدولت مالا مال ہو گئے۔ زراعت کو ترقی دینے کے لئے یہ تحریک خاص طور پر کامیاب ہوئی ہے۔ لالہ شمبر داس صاحب بی۔ اے انسپکٹر کوآپریٹو سوسائٹیز نے اس کتاب کا سلیس اردو ترجمہ کیا ہے۔ وہ لوگ جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ زراعت میں امدادِ باہمی کے ذریعہ سے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ کتاب پنجاب پرنٹنگ ورکس بک ڈپو، گنپت روڈ انارکلی، لاہور سے مل سکتی ہے۔

مبادیٔ نباتات۔ از پروفیسر جگ موہن لال صاحب چترویدی، بی۔ ایس سی۔ حجم ۱۰۴ صفحات قیمت ایک روپیہ اردو زبان میں علمِ نباتات پر یہ پہلی کتاب ہے۔ اس میں بیجوں کی ساخت اور اُن کا اُگنا، جڑوں کے اقسام اور اُن کے کام، تنہ، تنوں کی تبدیلِ صورت، پتیاں، پودوں کا سانس لینا اور اخراجِ رطوبت، پھول پھل وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ زبان اور اصطلاحات اِس قدر آسان استعمال کی گئی ہیں کہ ہر بات فوراً ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ پتہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔

محاوراتِ اردو۔ مرتبۂ جناب لالہ اندر جیت صاحب شرما، ماچھرہ ضلع میرٹھ حجم ایک سو صفحات قیمت آٹھ آنے اس کتاب میں زبانِ اردو کے ایک ہزار کے قریب محاورات جمع کئے گئے ہیں اور ہر محاورہ کے مختلف معانی بتا کر محلِ استعمال بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ بطور تمثیل و ثبوت ہر محاورہ کے بعد ایک ایک شعر مستند شعرا کے کلام سے انتخاب کر کے لکھ دیا گیا ہے۔ طلبہ کے لئے خصوصاً یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ مصنف سے مل سکتی ہے

عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے

موجودہ لندن کے اسرار

اردو زبان میں ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی جس سے یہ فلسفہ معلوم ہو کہ انسان کو جرم کے ارتکاب کی تحریک کیونکر ہوتی ہے ۔اس کتاب نے یہ کمی خوش اسلوبی سے پوری کی ہے کہ ایک خشک فلسفیانہ مضمون میں وہ دل آویزی پیدا ہو گئی ہے کہ حقیقی واقعات پر افسانہ کا گمان ہوتا ہے لندن کی وسیع اور گنجان آبادی کو دیکھ کر مصنف کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ ہزار دو ہزار آدمی کس طرح روزی پیدا کرتے ہونگے ۔یہ خیال کچھ اس طرح اس کے دل میں جاگزین ہوا کہ اس نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ اس امر کی تحقیقات کے لئے وقف کر دیا۔ جس کا ثمرہ یہ لاجواب کتاب ہے ۔گو یہ کتاب لندن کی زندگی کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے لیکن تھوڑے سے تمدنی تغیر کو مدنظر رکھ کر ارتکاب جرائم کی نوعیت ہندوستان میں بھی دیکھنے میں آتی ہے ۔اس کتاب کے مطالعہ سے آپ ایک ہوشیار شہری بن جائیں گے ۔اور عیاروں کے چھل فریب سے محفوظ ہو جائیں گے ۔یہ کتاب ایسی نہیں کہ ایک بار پڑھ کر رکھ دی جائے بلکہ ضرورت ہے کہ آپ اسے بار بار پڑھیں ۔بچوں اور مستورات کو پڑھائیں ۔اور جو نہ پڑھ سکیں ان کو پڑھ کر سنائیں ۔غرض یہ وہ حرز جان ہے جس سے کوئی گھر خالی نہ ہونا چاہئیے ۔ترجمہ کی روانی ۔سلاست اور دلفریبی کے لئے اتنی ضمانت کافی ہوگی کہ یہ ہندوستان کے مشہور انشا پرداز نور الٰہی محمد عمر صاحبان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے کتاب ۲۰×۲۶/۸ کے ۱۴۴ صفحات پر ختم ہوتی ہے کاغذ ۴۲ پونڈ کتابت دیدہ زیب ۔طباعت بہترین ۔سرورق سہ رنگ بلاک ۔پختہ جلد قیمت عہر فی جلد تاجر کتبوں کو ۱۰ سے زیادہ کتابوں کی خریداری پر ۱۵ فیصدی اور پچاس سے زیادہ کی خریداری پر بیس فی صدی کمیشن دی جاتے گی۔

عنوانات ابواب

المشتہر

محمود برادرس تاجران کتب جموں پنجاب

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی، ادبی، تمدنی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کیے جاتے ہیں

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ ر نمونہ ۶ ر

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ- لاہور

منشی علم الدین مینیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا